ہندوستان کا مذہبی وسیاسی ماحول اور

مؤلف

یٰسٓ اختر مصباحی

بانی وصدر دارالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵
بانی رکن المجمع الاسلامی، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی

موبائل: 09350902937

رابطہ کا پتہ

دارالقلم-66/92 قادری مسجد روڈ، ذاکر نگر (جوگا بائی ایکسٹینشن)

اوکھلا، نئی دہلی-110025 (انڈیا)

فون: 011-26986872، فیکس نمبر: 011-26987184

سلسلۂ مطبوعات (۲۰)

جملہ حقوق برائے مؤلف ودارالقلم محفوظ

نام کتاب .... ۱۸۵۷ء! پس منظر وپیش منظر

مؤلف .... یٰسٓ اختر مصباحی

زیر اہتمام .... دارالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی

طبع اوّل ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء

صفحات .... تین سو چار (304)

کمپوزنگ (۲۰۰۷ء) .... محمد توفیق مصباحی

قیمت .... سو روپے (-/100)

طابع و ناشر

دارالقلم-66/92 قادری مسجد روڈ، ذاکر نگر (جوگابائی ایکسٹینشن)

اوکھلا، نئی دہلی-110025 (انڈیا)

فون: 011-26986872

فیکس نمبر: 011-26987184

فہرست

انتساب بنام

علماو مشائخ ومشاہیرِ اسلام

		وصال
(۱) مجدد الفِ ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی		صفر۱۰۳۴ھ/دسمبر۱۶۲۴ء
(۲) عاشقِ رسول شیخ عبدالحق محدث دہلوی	//	ربیع الاول۱۰۵۲ھ/جون۱۶۴۲ء
(۳) ابوالبرکات دیوان عبدالرشید جون پوری	//	رمضان۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء
(۴) عارفِ حق سید شاہ عبدالرزاق قادری بانسوی (بارہ بنکی)	//	۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء
(۵) صاحبُ البرکات سید شاہ برکت اللہ قادری مارہروی	//	محرم۱۱۴۲ھ/اگست۱۷۲۹ء
(۶) امام الھند شاہ ولی اللہ فاروقی محدث دہلوی	//	۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء
(۷) حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں نقشبندی دہلوی	//	۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء
(۸) حسان الھند سید محمد آزاد بلگرامی (ہردوئی)	//	۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء
(۹) بیہقیِ وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی	//	۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء
(۱۰) حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی	//	۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء
(۱۱) حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی	//	شوال۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء
(۱۲) بحرالعلوم علامہ عبدالعلی فرنگی محلی لکھنوی	//	۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء
(۱۳) شمس العارفین سید شاہ آل احمد اچھے میاں برکاتی مارہروی	//	۱۲۳۵ھ/جنوری۱۸۲۰ء
(۱۴) سراج الھند شاہ عبدالعزیز محدثِ دہلوی	//	شوال۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء
(۱۵) حضرت شاہ غلام علی نقشبند ی دہلوی	//	صفر۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء
(۱۶) حضرت العلام فضل امام فاروقی خیرآبادی	//	۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء
(۱۷) حضرت شاہ ابوسعید مجددی رام پوری	//	۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء
(۱۸) حضرت شاہ محمد مخصوص اللہ محدث دہلوی	//	۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء
(۱۹) حضرت شاہ احمد سعید مجددی دہلوی	//	ربیع الاول۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء
(۲۰) امام الحکمۃ و الکلام علامہ فضل حق خیرآبادی	//	۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء
(۲۱) حضرت مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی	//	ربیع الاول۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء
(۲۲) خاتم الاکابر سید شاہ آل رسول احمدی مارہروی	//	ذوالحجہ۱۲۹۶ھ/دسمبر۱۸۷۹ء

رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

عقیدت کیش

یٰسٓ اختر مصباحی

شعاعِ نور

اِنَّ اللّٰہَ لَایُغَیِّرُ مَابِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوا مَابِاَنْفُسِہِمْ ط وَ اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوْمٍ سُوْٓءً فَلَا مَرَدَّلَہٗ وَ مَالَھُمْ مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ وَّالٍ۔ (سورۃ الرعد۔ آیت۔۱۱)

بے شک اللہ کسی قوم سے اپنی نعمت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدل دیں اور جب اللہ کسی قوم کے لئے برائی (ہلاکت وبربادی) چاہے تو وہ پھر نہیں سکتی اور اس کے سوا ان کا کوئی حمایتی نہیں۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا وَ جَعَلُوْا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَا اَذِلَّۃً وَ کَذَالِکَ یَفْعَلُوْنَ۔ (سورۃ النمل۔ آیت ۳٤)

(بلقیس) بولی! بے شک بادشاہ جب کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ کردیتے ہیں اور اس کے معززین کو ذلیل کردیتے ہیں۔ وہ ایسا ہی کرتے رہتے ہیں۔

وَلَاتَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا۔ (سورۃ بنی اسرائیل۔ آیت ۳۷)

اور زمین میں اتراتے ہوئے نہ چلو۔ بے شک تم نہ زمین چیر پاؤ گے اور نہ ہی بلندی میں پہاڑوں کو پہونچو گے۔

وَ تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ۔ (سورہ آل عمران۔ آیت ۱٤٠)

اور یہ دن ہیں جنھیں انسانوں کے درمیان ہم الٹتے پلٹتے رہتے ہیں۔

قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ۔ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (سورہ آل عمران۔ آیت۲٦)

یوں عرض کرو۔ اے اللہ! ملک کے مالک تو جسے چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔ اور جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے۔ ساری بھلائی تیرے ہی دستِ قدرت میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

وَ ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِی مَآاٰتَاکُمْ اِنَّ رَبَّکُمْ سَرِیْعُ الْعِقَابِ وَ اِنَّہٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (سورۃ الانعام۔ آیت۱٦٦)

اور وہی ہے جس نے زمین میں تم کو نائب بنایا اور تم میں ایک کو دوسرے پر درجوں بلندی دی تاکہ تمہیں اس چیز میں آزمائے جو اس نے تمہیں عطا کی۔ بے شک تمہارے رب کو عذاب کرتے دیر نہیں لگتی۔ اور بے شک وہ ضرور بخشنے والا مہربان ہے۔

مشعل راہ

میدان عرفات مکہ مکرمہ کے اندر صحابہ کرام کو خطاب فرماتے ہوئے رسول اکرم پیغمبر خاتم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَذْھَبَ عَنْکُمْ عُبِّیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ وَ فَخْرَھَا بِالْآبَاءِ اِنَّمَا ھُوَ مُؤْمِنٌ تَقِیٌّ اَوْ فَاجِرٌ شَقِیٌّ۔ اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ بَنُو آدَمَ وَ آدَمُ مِنْ تُرَابٍ۔ لَافَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَلَالِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَلَا لِاَبْیَضَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰی اَبْیَضَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی۔ (ترمذی و ابوداؤد و سیرت ابن ہشام و زاد المعاد وغیرہ)

اللہ تبارک و تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کی نخوت اور آباواجداد پر فخر کو دور کردیا ہے۔ اب یا تو پرہیزگار مومن ہے یا بدبخت نافرمان۔ سارے انسان آدم کے فرزند ہیں اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے نہ کسی گورے کو کسی کالے پر نہ کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت ہے۔ فضیلت محض تقویٰ سے ہے۔

ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَامِنْ رجلٍ یَلِی اَمرَ عشرۃٍ فما فوق ذلک اِلا اتی اللّٰہ یومَ القیمۃ مغلولۃ یداہ الیٰ عنقہ فکّہٗ عدلُہٗ او بقّہ اِثمہ۔ (مسند امام احمد و طبرانی و مجمع الزوائد)

جو شخص دس یا اس سے زیادہ آدمیوں کا امیر و والی بن گیا تو قیامت کے دن اللہ کے حضور وہ اس حال میں پیش ہوگا کہ اس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن سے جکڑے ہوں گے۔ اسے اس کا عدل آزاد کرائے گا یا اس کا گناہ اسے جہنم میں ڈال دے گا۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ثلاثۃ لاترد دعوتھم: الامام العادل و الصائم حتی یفطر و دعوۃ المظلوم تحمل علی الغمام و تفتح لہ ابواب السماوات۔ و یقول الرب عز و جل: لانصرنک و لوبعد حین۔ (مسند امام احمد و ترمذی و ابن ماجہ و الترغیب و الترھیب)

تین قسم کے لوگوں کی دعائیں رد نہیں کی جاتیں۔ عادل حکمراں، روزہ دار جب تک روزہ افطار نہ کرے، اور مظلوم کی دعا کو بادل پر اٹھایا جاتا ہے اور اس کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ میں ضرور تیری مدد کروں گا۔ اگرچہ کچھ دیر بعد وہ مدد ظاہر ہوگی۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جس شخص نے کسی مومن کے کسی دنیاوی دکھ کو دور کیا اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کے کسی دکھ کو دور فرمائے گا اور جس شخص نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اس کی پردہ پوشی اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں فرمائے گا۔ اور جس شخص نے کسی تنگ دست کے لئے کچھ آسانی پیدا کی اس کے لئے اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں آسانی فرمائے گا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ بندے کی مدد فرماتا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہے (الترغیب والترہیب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گزارشِ احوالِ واقعی

اسلام، مسلمان، مذہبی شعائر یہ ایسے وجود ہیں جو ہمیشہ سے بنی نوع انسان کے داخلی و خارجی ابتلا و آزمائش کے مرکزی کردار کی حیثیت سے نمایاں رہے ہیں۔ اسلام کا کس کس رخ سے مطالعہ کیا جائے؟ مسلمان کو کس پرکشش رنگ میں پیش کیا جائے؟ اور مذہبی شعائر و احکام پر کس طرح عمل کیا جائے؟ دنیا بھر کے سعادت مند انسانوں کے فکری محور کے گرد اگر یہ سوالات گردش کرتے رہتے ہیں تو ان کے برعکس ایک طبقہ اس کشمکش میں شب و روز مبتلا رہتا ہے کہ کس کس زاویے سے اسلام کی طرف انگشت نمائی کی جائے؟ مسلمان کی شناخت کس طرح داغ دار کی جائے؟ اور ان کے مذہبی احکام و شعائر و علامات کو کیسے مطعون و مجروح کیا جائے؟

صرف ڈیڑھ دو صدی پیشتر کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے اور پیچھے پلٹ کر دیکھا جائے تو یہ منظر سامنے آتا ہے کہ اپنے عہد عروج و اقبال میں برطانیہ نے قدیم نصاریٰ و یہودِ عرب کی دیرینہ روایت برقرار رکھتے ہوئے اسلام، مسلمان اور مذہبی شعائر و احکام ہر ایک کے خلاف فضا بنانے اور ماحول تیار کرنے کے لئے فکری، قلمی، لسانی، عملی ہر محاذ پر اپنے آزمودہ کار سورما چھوڑ رکھے تھے جن کا وظیفۂ حیات اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ اپنے نشانے تک پہنچ کر ہی دم لیں۔ حالاں کہ ان کی بہت سی تدبیریں رائیگاں گئیں اور ان کے بہت سے عزائم و اقدامات ناکامی و نامرادی کی نذر ہو گئے۔

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْکَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ۔ (سورۃ الصف۔ آیت۔۸)

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور اپنے منہ سے بجھا دیں۔ اور اللہ کو اپنا نور پورا کرنا ہے خواہ کافر کتنا ہی برا مانتے رہیں۔

یہ برطانیہ بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول تک یورپی اقوام کا نمائندہ تھا جس کا آفتاب اقبال دنیا کے بیشتر حصوں بالخصوص ایشیا وافریقہ کے متعدد بڑے خطوں میں جگمگا رہا تھا۔ فرانس اور اٹلی بھی برطانیہ ہی کی طرح دوسرے ممالک واقوام کو اپنا محکوم بنانے میں پیش پیش تھے۔ اور ظاہر ہے کہ ان کے خلاف مزاحمتوں کے جذبات بھی حد درجہ شدید تھے جس کے نتیجے میں آبادی و ویرانہ ہر جگہ نہ جانے کتنی دست بدست جنگیں ہوئیں اور ہزاروں لاکھوں انسان مقتول و مجروح ہوئے اور ان کی معیشت ومعاشرت زبردست خسارہ و بحران سے دوچار ہوئی۔

مذکورہ ممالک نے ڈیڑھ دو صدی کے اندر افریقہ وایشیا میں درجنوں ممالک واقوام کا محاصرہ اور ان کے وسائل ومعدنیات کا استحصال کیا۔ ان کی تجارت وصنعت وزراعت کا خون چوسا۔ اپنی عسکریت و جارحیت اور وحشت و درندگی کا ہر حربہ ان کے خلاف استعمال کیا۔ ان کی زندگی جانوروں سے بدتر کردی۔ اور جب انھوں نے اپنا دفاع کیا۔ باہری طاقت کے سامنے مزاحم ہوئے۔ اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کیا۔ محکومی وغلامی کی زندگی گذارنے سے انکار کیا تو انھیں سنگینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں گولیوں سے چھلنی کیا گیا۔ انھیں توپوں سے اڑایا گیا۔ یہ کھیل بیسویں صدی عیسوی کے ربع اول تک ایشیا وافریقہ کے درجنوں ممالک میں زور وشور کے ساتھ ہوا اور برطانیہ وفرانس واٹلی جیسے طاقتور ملکوں نے ہر جگہ کشت وخون کا بازار گرم کیا اور انھوں نے انسان اور انسانیت کی تحقیر وتذلیل کی بدترین روایتیں قائم کیں۔

برطانیہ کی عیاری ومکاری اور اس کے جبر واستحصال کا ہمارا ہندوستان صدیوں شکار رہا ہے۔ ۱۶۰۱ء سے ۱۷۵۶ء تک اس کے تاجروں نے تجارتی نقاب لگا کر اسے لوٹا کھسوٹا۔ اس کے لئے اس نے "ایسٹ انڈیا کمپنی" کا پلیٹ فارم استعمال کیا۔ جس نے بنگال کی صنعت و تجارت وزراعت کو اپنا پہلا نشانہ بنایا۔ اور پھر دوسرے صوبوں کا خون چوس کر پوری صحت و توانائی اور بھرپور تیاری کے ساتھ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان سے اپنی عسکری و جارحانہ کارروائی کا آغاز کیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے شمالی ہند وجنوبی ہند میں ہندوستانی راجوں مہاراجوں، نوابوں سے درجنوں چھوٹی بڑی جنگیں کیں۔ سازشیں کیں، غدار پیدا کیے، ایک دوسرے کو لڑایا، کبھی کسی کا ساتھ دیا اور کبھی کسی کا ساتھ چھوڑا۔ مذہب، تعلیم، تہذیب، تمدن، تجارت، صنعت، زراعت،

سب کو اپنے شکنجے میں کسا اور بالآخر ستمبر ۱۸۵۷ء میں لال قلعہ دہلی پر اس نے اپنا پرچم لہرا دیا۔

آج کی زبان میں یہ کمپنی دہشت گردی کا سرچشمہ تھی جس نے دہشت گردی کے خفیہ وعلانیہ مظاہرے کیے۔ عملی دہشت گردی کی اور ہندوستانیوں پر دہشت گردی کا ہر حربہ آزمایا۔ اس دہشت گردی کے جواب میں ہندوستانیوں نے جو کچھ مزاحمت کی اسے قانون شکنی، غدر، بغاوت، احسان فراموشی، نمک حرامی کا نام دیا گیا۔ ان کی غیرت وحمیت کو کچوکے لگائے گئے اور جب انھوں نے نالہ وشیون کیا، داد فریاد کی، مزاحمت ودفاع کیا تو سختی اور سنگ دلی کے ساتھ ان کی ہر آواز کو دبا دیا گیا۔ جو بھی طاقت وقیادت اپنی سرزمین اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے آگے بڑھی اسے کچل دیا گیا۔ جس نے بھی اپنے ہندوستانیوں کی دادرسی کی کوشش کی اسے باغی وغدار قرار دیا گیا۔

گویا کوئی فرق نہیں ہے ۱۸۵۷ء کے ہندوستانی حالات اور ۲۰۰۷ء کے بین الاقوامی حالات میں کہ ڈیڑھ سو سال پہلے جو کام برطانیہ تنہا کیا کرتا تھا وہ عالمی سطح پر امریکہ وبرطانیہ واسرائیل تینوں مل کر انجام دے رہے ہیں اور ایک "سُپر پاور" کی حیثیت سے امریکہ نے آج برطانیہ کی جگہ سنبھالی لی ہے۔

مذکورہ تینوں طاقتوں نے ایک گہری سازش اور منظم پلاننگ کے تحت زوالِ روس کے بعد ۱۹۹۰ء سے اسلام اور عالم اسلام کو اپنا نشانہ بنا رکھا ہے۔ فکری اور عملی دہشت گردی، ان طاقتوں کا وطیرہ اور محبوب مشغلہ بن چکی ہے۔ لیکن دور حاضر کی سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ اپنی جانب سے توجہ ہٹانے کے لئے انگشت نمائی مظلوم مسلمانوں کی طرف ہونے لگتی ہے۔ اور شک کی سوئی ان کی جانب بار بار گھمائی جانے لگتی ہے۔

بنیاد پرستی، دہشت گردی، اسلامی دہشت گردی کے انھوں نے کئی بت تراش رکھے ہیں اور جہاں ان کا جی چاہتا ہے وہاں ان خود ساختہ اصطلاحات کے سہارے مسلم نوجوانوں اور مسلم تنظیموں پر یہ استعماری طاقتیں اپنے خونیں پنجے گاڑ دیتی ہیں۔ اور اپنے زیر اثر میڈیا کے ذریعہ ماحول اتنا سنگین بنا دیتی ہیں کہ ان کے خلاف جو کوئی زبان کھولے وہ خود خطرات کی زد میں آجائے۔ ان کا یہ وطیرہ بن چکا ہے کہ پہلے اشتعال انگیزی کریں گی۔ پھر گمراہ کن پروپیگنڈہ کریں گی۔ اس کے بعد اپنے شکار پر ہاتھ ڈال دیں گی۔

جب کہ پہلی دہشت گردی یہ ہے کہ کسی قوم وملک کے داخلی مسائل اور اس کے وسائل کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ اور ان کے اندر کوئی مداخلت کی جائے۔

دوسری دہشت گردی یہ ہے کہ سیاست وصحافت وسفارت یا کسی بھی شکل میں اس مداخلت پر پردہ ڈالنے اور مداخلت واستحصال کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کا کوئی پرفریب طریقہ اختیار کیا جائے۔

تیسری اور تیسرے درجے کی دہشت گردی یہ ہے کہ جس قوم وملک کے وسائل ومسائل کو بلا جواز چھیڑا جا رہا ہے اس کے ردعمل سے مغلوب ہوکر متاثر اقوام وافراد غیر متعلق افراد ومقامات کو اپنی کسی جارحیت کا نشانہ بنانے لگیں۔

گویا پہلی دہشت گردی کے سرچشمے وہ دل ودماغ ہیں جن کے اندر اسلام اور عالم اسلام کے خلاف طرح طرح کی سازشیں تیار ہو رہی ہیں۔ اور دوسری دہشت گردی وہ ہے جو متعدد ذرائع بالخصوص میڈیا کے ذریعہ ان سازشوں کی پردہ پوشی کر کے کسی دوسری طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کے لئے مسلسل کی جاتی رہتی ہے۔ اور تیسری دہشت گردی وہ ہے جو ردعمل کے طور پر ظہور پذیر ہوتی ہے اور بے قصور وغیر متعلق افراد اس کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

ایسی صورت میں دودو چار کی طرح یہ حقیقت واضح ہے کہ جب تک پہلی اور دوسری دہشت گردی ختم نہیں ہوگی اس وقت تک تیسری دہشت گردی بھی کسی قیمت پر ختم نہیں ہوسکتی۔ اور جیسے ہی پہلی اور دوسری دہشت گردی پر لگام لگے گی ویسے ہی تیسری دہشت گردی اپنے آپ بے جان اور مردہ ہوکر رہ جائے گی۔

فلسطین اور عراق وافغانستان کے خلاف جب تک امریکہ وبرطانیہ واسرائیل کی دہشت گردی جاری رہے گی اور جب تک بین الاقوامی میڈیا حقائق سے چشم پوشی کرتا رہے گا اس وقت تک فلسطین اور عراق وافغانستان کے جیالے اپنے ملک وقوم کے وقار ومفاد کی خاطر اپنی دفاعی ومزاحمتی قوت کا مظاہرہ کرتے رہیں گے اور انھیں ان کے اس عمل سے کوئی طاقت کسی قیمت پر روک بھی نہیں سکتی ہے۔ یہ ایک عالمی اور عملی حقیقت ہے جس کا کوئی بھی باشعور اور ذی ہوش انسان کبھی انکار نہیں کرسکتا۔

یہودی سازش اور امریکی منصوبہ بندی کے پیشِ نظر اس بات کا بھی شدید خطرہ پیدا ہوچکا ہے کہ کہیں مستقبل قریب یہ اسلام دشمن طاقتیں مل جل کر سنی وشیعہ وکرد ریاستوں کی شکل میں عراق کی تقسیم نہ کر ڈالیں۔

یورپ وامریکہ کا شاطرانہ ذہن بھی عجیب ہے اور اصطلاحات وضع کرنے کا بھی ان کا ایک نرالا ڈھنگ ہے۔ اسی طرح وہ فکری دہشت گردی کی بھی نت نئی ترکیبیں ایجاد کرتے ہیں۔ کب کسے نشانہ بنانا ہے اور کسے آزاد کرنا اور اسے تقویت پہنچانا ہے اس کا ہنر بھی انھیں خوب آتا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جس وقت بعض افریقی ممالک میں ان طاقتوں نے اپنی تگ وتاز اور حیلہ وتدبیر وجنگ وجدال کے ذریعہ غیور مسلمانوں کے علاقوں پر قبضہ کرنا اور انھیں محکوم بنانا شروع کیا تو وہاں کے متعدد سلاسلِ طریقت کی کئی خانقاہوں کے درویشوں نے اپنے زیر اثر حلقے اور عقیدت مند مسلمانوں کو مسلح کر کے ان کا راستہ روکا اور انھیں ناکوں چنے چبوادیا۔ درویشوں کی اس سرگرمی، ان کے وسیع اثرات اور مسلح جدو جہد کو توڑنے کے لئے ان شاطر دماغ غاصبوں اور ظالموں نے ''تصوف'' کے خلاف محاذ کھول دیا اور صوفیہ ومشائخ کی کردار کشی کا بازار گرم کردیا۔ اس کے لئے انھوں نے مسلمانوں ہی کے درمیان سے علما ودانشوروں کی ایک فوج بھی تیار کرلی۔ اور اپنے مذموم مقصد میں انھیں بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوگئی۔ ٹھیک یہی نسخہ انھوں نے آج کل ''جہاد'' کے خلاف اپنا رکھا ہے۔ اور اس کے لئے بھی انھیں مسلمانوں ہی کی صف سے اہل فکر وقلم دستیاب ہوگئے ہیں۔

اصطلاحی ''جہاد'' تو آج صحیح معنوں میں کہیں نظر نہیں آرہا ہے مگر ''نظریۂ جہاد'' کو باطل اور مسخ کرنے کا سلسلہ زور وشور کے ساتھ جاری ہے۔ یہ ہماری مسلم تاریخ کی بوالعجبی نہیں تو اور کیا ہے؟

تاریخ کا دوسرا حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ صحرائے افریقہ کے ''بربر'' قبائل نے جب ان غاصب طاقتوں کا پوری پامردی وجاں بازی کے ساتھ مقابلہ کیا اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینا شروع کیا تو ان کے خلاف ایک زبردست پروپگنڈہ مہم چلائی گئی اور اپنی جارحیت ودہشت گردی کو بھول کر ''بربریت'' کی اصطلاح وضع کرلی گئی۔ پھر اسے دنیا بھر میں اس طرح رائج کردیا گیا کہ ہر زبان میں ''بربریت'' کو سنگ دلی اور درندگی کا ہم معنیٰ قرار دیا گیا۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ ان کے پروپگنڈے سے متاثر ہوکر خود مسلمان بھی غیر شعوری طور پر اس ''اصطلاحی دہشت گردی'' کو اپنا کر اپنے ہی ہم مذہب بربر مسلمانوں کی روح کو تڑپا رہے ہیں۔ اور نادانی وبھولے پن کے ساتھ ''بربریت'' کا اپنی تحریر وتقریر میں شب وروز استعمال کر رہے ہیں۔

ہمارے ہندوستان میں ظالم وغاصب برطانیہ نے اسی طرح کی ایک اصطلاحی دہشت

گردی کا مظاہرہ کیا کہ جب صوبہ سرحد پر ایک معاہدے کے تحت اس نے مکمل قبضہ کر لیا تو وہاں موجود عناصر جو تحریک وہابیت کے علمبردار تھے ان کی تگ و دو اور لگ بھگ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۳ء تک ان کی جانب سے جو چھوٹی موٹی جھڑپیں انگریزوں سے ہوئیں ان کا قلع قمع کرنے کے لئے پہلے سے رائج وہابی اصطلاح کو ایک نئے معنی و مفہوم کا لبادہ اڑھا کر ''وہابیت'' کے خلاف پروپگنڈہ کی ایک مہم شروع کی جس کا مقصد یہ تھا کہ سرحد کے سنی حنفی قبائل ان سے متنفر ہو کر ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔ ان عناصر کا وہابی ہونا ایک الگ حقیقت ہے لیکن ان کی وہابیت کی تشہیر یہ برطانوی سیاسی پالیسی کا اپنا مخصوص حربہ اور طریقۂ کار تھا۔

حد یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں ان سارے علما و قائدین کو ان انگریزوں نے وہابی کہنا اور لکھنا شروع کیا جو ان سے برسرپیکار تھے۔ اِحیاے اسلام کا نام جس مسلمان نے لیا اور مذہبی رنگ میں جو بھی مسلمان ان کے سامنے آیا اسے انھوں نے ''وہابی'' کہنا شروع کر دیا جس کے نمونے تاریخِ انقلاب کے ہزاروں صفحات پہ بکھرے ہوئے ہیں۔

یہی نسخہ آج امریکہ بھی اپنا رہا ہے کہ دنیا جہان میں جو مسلمان بھی داڑھی ٹوپی اور نماز روزہ کا پابند نظر آتا ہے وہ اس کی نظر میں القاعدہ کا ممبر یا اس کا ہم درد ہے۔ نوبت بایں جا رسید کہ خود ہمارے ملک کے مسلم مخالف عناصر جس مسلم نوجوان کو چاہتے ہیں اسے لشکر طیبہ یا جیش محمد یا سیمی سے وابستہ قرار دے کر بڑی آسانی کے ساتھ اسے گرفتار کر کے جیل کی سلاخوں کے اندر ڈال دیتے ہیں اور بعض مواقع پر کسی بھی نا کردہ گناہی کا الزام عائد کر کے اس کا انکاؤنٹر بھی کر ڈالتے ہیں جس کے کئی ایک نمونے متعدد صوبوں بالخصوص صوبہ گجرات میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اور اس سلسلے کے کئی ایک مقدمات بھی کورٹوں کے اندر زیر سماعت ہیں۔

کچھ اسی قسم کی دہشت گردی مدارس اسلامی کے خلاف بھی جاری ہے کہ آج تک ہندوستان کے کسی ایک مدرسہ کے خلاف بھی دہشت گردی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ ثابت نہ کیے جانے کے باوجود ان مدارس کو دہشت گردی کا اڈہ کہا جا رہا ہے۔ اور یہ درحقیقت کسی دہشت گردی کی نشان دہی اور اس کے سدِ باب کے لئے نہیں بلکہ خود اپنی دہشت گردی کے جذبے کی تسکین کا نہایت زہریلا طریقۂ اظہار ہے جس کی روک تھام ہر اس انسان کو کرنی چاہیے جو دل سے اس بات کا خواہاں ہے کہ دہشت گردی کا ازالہ ہو اور صرف ہمارا ملک نہیں بلکہ ساری دنیا دہشت

گردی کی اس لہر سے نجات حاصل کرے جس کا سلسلہ اکیسویں میں نہایت تیز رفتاری کے ساتھ اسلام دشمن طاقتوں کی طرف سے جاری ہے اور جس سے امن عالم روز بروز سنگین خطرات سے دوچار ہوتا جا رہا ہے۔

اسرائیل اور امریکہ کا اس وقت جس تیزی کے ساتھ ہندوستان کی طرف رخ اور ان دونوں کی پیش قدمی ہو رہی ہے اور موجودہ حکومتِ ہند کی ان کی طرف جو لپک دکھائی دے رہی ہے اسے خطرے کی گھنٹی ہی سمجھا جانا چاہیے۔ اور بڑا خطرہ اس بات کا ہے کہ خوانخواستہ ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کی ہندوستان واپسی کی تاریخ نہ دہرائی جانے لگے اور پھر ہندوستان کو اس کے چنگل سے نکلنے کے لئے کئی نسلوں کی قربانی نہ دینی پڑے۔

ہندوستان کے انقلاب ۱۸۵۷ء کو آج ڈیڑھ سو سال پورے ہو رہے ہیں۔ یہ ایک ہمہ گیر عوامی انقلاب تھا اور اس نے پہلے مرحلے میں برطانوی سامراج کی چولیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج سے اس سے پہلے بھی شمالی ہند و جنوبی ہند میں کئی سورماؤں نے پنجہ آزمائی کی تھی اور کئی ایک خوں ریز جنگیں ہوئی تھیں لیکن ان میں اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں ایک بڑا واضح اور بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ کمپنی اور راجوں مہاراجوں و نوابوں کی جنگیں مخصوص تھیں جو ایک محدود علاقے میں فتح و شکست سے دوچار ہوتی رہیں۔ جب کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا دائرہ ان کے مقابلے میں کافی وسیع تھا اور اس کے اندر دہلی و دوآبہ و روہیل کھنڈ و بندیل کھنڈ و اودھ سے آرہ (بہار) تک کے لاکھوں عوام براہ راست شریک تھے جو لاکھوں کی تعداد میں مرتے مارتے ہوئے اپنے ملک و وطن کے لئے اپنی جان و مال کی بے دریغ قربانیاں دے رہے تھے۔

افسوس کا مقام ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء پر بہت کچھ لکھے جانے کے باوجود ابھی تک بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔ اور قومی محافظ خانے کے ہزاروں اوراق و صفحات اپنے محققین و مؤرخین کے انتظار میں گریہ کناں ہیں اور کہنگی و بوسیدگی کے ہاتھوں روز بروز ناقابل استفادہ اور تباہ و برباد ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

ایک المیہ یہ بھی ہے کہ اس موضوع پر لکھنے والے حضرات نے جو تاریخ لکھی ہے اس میں ان کا اپنا نقطۂ نظر اور ان کا رجحانِ فکر اتنا زیادہ غالب ہے جس سے تاریخی تقاضے شدت سے مجروح ہوتے ہیں۔ اور بہت سے حقائق کا خون ہو جاتا ہے۔ جب کہ ایسے حضرات حقیقت

پسندی اور غیر جانب داری کا دعویٰ کرنے میں عموماً بہت پرجوش اور نہایت پیش پیش رہتے ہیں۔
کسی خاص طبقے اور طرز فکر سے متاثر ہوئے بغیر جو لوگ آزادانہ رائے قائم کرتے ہیں وہ اپنی حد تک عموماً صحیح تاریخ نگاری کرتے ہیں مگر جو لوگ جانب دارانہ پہلو رکھتے ہیں ان کی تحریر کردہ تاریخ اور اخذ کردہ نتائج میں افراط وتفریط کی بہتات ہوتی ہے۔ اور مورخین کا وہ ایک اچھا خاصہ طبقہ جو کمیونزم حامی ہے اس کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ مذہب اور علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء سے اپنی تحریر کردہ تاریخ کو بالکل "پاک وصاف" رکھا جائے اور ظاہر کیا جائے کہ اس انقلاب کے پیچھے صرف معاشی اسباب ووجوہ تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے سامراجی نظام اور اس کی معاشی پالیسی کے خلاف ہندوستانی عوام کے غم وغصہ کے اظہار کا نتیجہ یہ انقلاب ۱۸۵۷ء ہے۔

ایک دوسرے رخ سے انقلاب کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں اور تاریخ انقلاب سے کم یا زیادہ دل چسپی وعدم دل چسپی رکھنے والوں کے رجحانِ طبع کا تجزیہ کیا جائے تو یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ ہندوؤں کو انقلاب ۱۸۵۷ء سے موجودہ حالات میں اتنی دل چسپی نہیں ہے جتنی مسلمانوں کو ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ انقلاب میں مسلمانوں کا حصہ زیادہ تھا اور قیادت بھی انھیں کی تھی اس لئے اس کے ذکر سے عام ہندوؤں کو کوئی خاص دل چسپی نہیں ہے۔ پرنٹ میڈیا و الیکٹرانک میڈیا میں ۱۸۵۷ء کا ذکر آتا بھی ہے تو کچھ اس طرح کہ منگل پانڈے، رانی لکشمی بائی، تانتیا ٹوپی، بھگت سنگھ اور گاندھی ونہرو سے اس کا رشتہ جوڑ کر عموماً بات ختم کردی جاتی ہے۔ کبھی کبھی تکلفاً "بہادر شاہ ظفر" کا نام بھی لے لیا جاتا ہے۔

اردو زبان میں لکھی گئی تاریخ انقلاب کا جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے اس سے یہ صاف نمایاں ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے دو مذہبی طبقے اس انداز سے ۱۸۵۷ء کی تاریخ لکھتے ہیں۔ اور ان کی لکھی ہوئی تاریخ انقلاب کا عام انداز یہ ہوتا ہے کہ

(۱) تحریک بالاکوٹ جس کا آغاز سید احمد رائے بریلوی وشاہ محمد اسمٰعیل دہلوی کی سرپرستی و قیادت میں از رائے بریلی تا بالاکوٹ (جنوری ۱۸۲۶ء تا مئی ۱۸۳۱ء) ہوا اسی پر سارا زور صرف کیا جائے اور پھر ضمناً ۱۸۵۷ء کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عنایت علی صادق پوری ومولوی ولایت علی صادق پوری کی قیادت میں ۱۸۴۵ء سے دوبارہ جب یہ تحریک شروع ہوئی اس وقت سے مقدمہ انبالہ ۱۸۶۴ء ومقدمہ پٹنہ ۱۸۶۵ء وغیرہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے انقلاب ۱۸۵۷ء کو بھی

اسی تحریک بالاکوٹ کے کھاتے میں ڈال دیا جائے۔ کہ یہ ساری تحریک اور سارا جذبۂ جہاد وقربانی اسی تحریک بالاکوٹ کی دین ہے۔

(۲) آغاز تو مذکورہ انداز سے بالاکوٹ سے کیا جائے اور ۱۸۵۷ء کو بھی اسی کا نتیجہ قرار دیا جائے جس میں واقعۂ شاملی کو پانی پت جیسی کوئی لڑائی بنا کر اپنے چند علما کے نام اجاگر کرنے کی ناکام کوشش کی جائے اور بڑی تیز رفتاری اور چابک دستی کے ساتھ ریشمی رومال تحریک اور جمعیۃ العلما کا ذکر کر کے علمائے دیوبند کو مسلمانانِ ہند کی قیادت کا قابلِ افتخار اعزاز بخش دیا جائے۔

بہت سے وہ علمائے اہل سنت جنھوں نے اپنے مواعظ وخطبات سے مسلمانوں کے اندر جوش وخروش اور اپنے فتوائے جہاد کے ذریعہ ان کے مذہبی جذبات میں تلاطم بیدا کیا۔ جن کا عوام کے اندر بے پناہ اثر تھا۔ فوج اور انقلابی بھی جن کے آگے سر تسلیم خم کرتے تھے ان میں سے بیشتر کے ساتھ موجودہ تاریخ میں بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ انھیں نظر انداز کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں ان کا کچھ ذکر ہے بھی تو ضمنی اور سرسری طور پر ہے اور بعض علما کی کردار کشی کا بھی ناخوشگوار فریضہ انجام دیا گیا ہے۔ جسے اس تاریخ انقلاب کا ایک سیاہ باب قرار دیا جانا چاہیے۔

زیر نظر کتاب میں ہم نے جن شخصیات کی اجمالی تاریخ تحریر کی ہے ان کے سلسلے میں مزید تحقیق وتفصیل کے ساتھ لکھا جانا چاہیے اور ان میں سے ہر شخصیت اس کی مستحق ہے کہ اس پر ایک مستقل ضخیم کتاب لکھی جائے۔ اور فرزندانِ وطن کو ان کی خدمات سے آگاہ کیا جائے۔

جن مسائل ومباحث کو زیر نظر کتاب میں موضوع سخن بنایا گیا ہے ان کے بارے میں صحیح تاریخ اور صحیح موقف پیش کرنے کی دیانت دارانہ کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی جن حقائق کو ایک ڈیڑھ صدی سے چھپایا جارہا ہے۔ ان کی صورت مسخ کی جارہی ہے۔ ان میں افراط وتفریط سے کام لیا جارہا ہے۔ اپنی عقیدت مندانہ وجانب دارانہ سوچ کو تاریخ کا حصہ بنایا جارہا ہے۔ اپنے خیال و فکر اور اپنی قیاس آرائی کو تاریخی شہادت کا درجہ دیا جارہا ہے۔ ان سب باتوں کو ان کے صحیح تناظر میں انھیں حضرات کی کتب ورسائل کے حوالہ سے نذر قارئین کیا گیا ہے جو ان سے جذبۂ عقیدت مندی کے ساتھ براہ راست وابستہ ہیں۔ گویا یہ ساری شہادتیں اور ان سے اخذ کردہ نتائج اور فیصلے افرادِ خانہ ہی کے ہیں جن میں باہر کا نہ کوئی شاہد ہے نہ کوئی وکیل ہے اور نہ ہی کوئی منصف ہے۔

علما وقائدین انقلاب ۱۸۵۷ء مثلاً مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء)،

Scanned by CamScanner

علامہ فضل حق خیرآبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء)، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی (متوفی ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء)، مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی (متوفی نامعلوم)، مولانا سید کفایت علی کافی مرادآبادی (متوفی ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) مفتی عنایت احمد کاکوروی (متوفی ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء)، مولانا رحمت اللہ کیرانوی (متوفی ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۱ء)، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی (متوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۳ء)، مولانا وہاج الدین مرادآبادی (متوفی ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء)، مولانا امام بخش صہبائی دہلوی (متوفی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء) وغیرہم اپنے جن اسلاف و متقدمین سے فیض یاب تھے اور جن کی ہدایات و ارشادات سے انھیں تحریک وترغیب ملی ان میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی درج ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶/۱۷۶۲ء)، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں نقشبندی مجددی دہلوی (متوفی ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء)، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) حضرت قاضی ثناء اللہ مجددی پانی پتی (متوفی ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء) حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء)، حضرت مفتی محمد عوض عثمانی بریلوی (متوفی ۱۲۳۶ھ/ ۱۸۲۱ء)، حضرت مفتی شرف الدین رام پوری (متوفی ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء) وغیرہم۔

یہی افراد و رجال ہماری مذہبی وسیاسی تاریخ کی گراں قدر شخصیتیں اور بیش قیمت امانتیں ہیں اور ہمارے حال کا رشتہ انھیں کے وجود اور ان کے ماضی سے جڑا ہوا ہے۔ اپنے مذہب وملت اور اپنی قوم ووطن سے محبت کا انھوں نے جو پیغام اپنے خون جگر سے تحریر کیا اس کے نقوش شاہراہِ حیات پہ آج بھی زندہ وتابندہ ہیں۔ ان کی شعاعیں آج بھی جگمگا رہی ہیں۔ اور ہمیں دعوتِ فکر و عمل دے رہی ہیں جن کے جلو میں ہمیں اپنا قدم آگے بڑھانا اور اپنی منزل مقصود تک پہنچنا ہے۔

رب کائنات اپنے حبیب پاک صاحب لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ وطفیل میں ہمیں باعزت وباوقار اور متحرک وفعال وبامقصد وباکردار زندگی گذارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

یٰسٓ اختر مصباحی
بانی وصدر دارالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵
فون: 011-26986872
فیکس: 011-26987184
موبائل: 0935090293

مورخہ
۱۱ر رمضان ۱۴۲۸ھ
۲۴ر ستمبر ۲۰۰۷ء
بروز دوشنبہ

پہلی اور آخری عوامی جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء)

دسمبر ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبتھ نے برطانوی تاجروں کو اس بات کی باضابطہ اجازت دی کہ وہ ہندوستان کے اندر تجارت کر سکتے ہیں۔ اس وقت جلال الدین محمد اکبر ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ برطانوی تاجروں نے بہت محدود اور چھوٹے پیمانے پر معمولی سرمائے سے ہندوستان کے اندر ۱۶۰۱ء میں اپنا کاروبار شروع کیا۔ اپنے کاروبار کو منظم اور مربوط کرنے کے لئے انھوں نے ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' بنائی۔ ۱۶۰۸ء میں سورت (گجرات) کے اندر کمپنی سے وابستہ افراد اپنی ایک تجارتی کوٹھی بنانے میں کامیاب ہوئے اور ابتدائی مرحلے میں وہیں سے اپنی تجارت اور اس کی سرگرمیاں بڑھانے اور پھیلانے میں شب وروز مصروف ہوئے۔

دوسرے مرحلے میں کلکتہ کے قریب ہُگلی میں بھی کمپنی نے اپنی ایک تجارتی کوٹھی بنالی۔ تیسرے مرحلے میں اس نے جنوبی ہند کا رخ کیا اور مدراس کے آس پاس ایک قلعہ نما سینٹر بنایا۔ اسی طرح اڑیسہ میں بھی کمپنی نے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلائے، لیکن کمپنی کا زیادہ زور بنگال میں رہا اور رفتہ رفتہ کمپنی نے اتنا منافع کمایا کہ برطانیہ کو اس کا نہایت حوصلہ افزا مالی فائدہ پہنچا۔

تاریخی مطالعہ سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ مغل حکمراں برطانوی تاجروں کے اصل عزائم بھانپنے میں ناکام رہے۔ اکبر کے بعد نورالدین جہاں گیر اور اورنگ زیب عالم گیر کے دور میں بھی انگریزوں کے تجارتی لبادے کے اندر چھپے ہوئے اغراض ومقاصد تک ان کی نظر نہ پہنچ سکی۔ ہندوستان آکر نورالدین جہانگیر کے دل ودماغ پر سرٹامس رو نے ایسا غلبہ جما لیا تھا کہ اس کے عہد میں جگہ جگہ کمپنی کی کوٹھیاں قائم ہوگئیں۔ سورت وہوگلی کے علاوہ احمد آباد، برہان پور، اجمیر، آگرہ، کھمبات وغیرہ میں بھی کمپنی کے گودام بن گئے۔ عہد اورنگ زیب ہی سے کمپنی کی

سیاسی وعسکری شرارتیں شروع ہوگئی تھیں۔ صرف شائستہ خاں گورنر بنگال اور نواب سراج الدولہ حاکم بنگالہ نے اس جانب عملاً توجہ دی اور برطانوی تاجروں کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کی۔ کئی ایک سخت اقدامات کیے مگر ان کا تسلسل باقی نہ رہ سکا اور گھوم پھر کر انگریز وہی کرنے میں معروف رہے جو ان کا اصل نشانہ تھا۔

جنوبی ہند میں سلطان ٹیپو کے حوصلہ مند والد حیدر علی نے انگریزوں کی اصل خواہشات و عزائم کو تاڑتے ہوئے شدید مزاحمت کی، لیکن نظام حیدرآباد اور مراٹھوں سے ساز باز کر کے انگریز اپنے آپ کو بچاتے رہے۔ حیدر علی کی پوری زندگی انگریزوں سے لڑتے ہوئے بیتی۔ مگر وہ جنوبی ہند سے انگریزوں کو نکال باہر کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ یہی حال ٹیپو سلطان کا بھی رہا۔ ٹیپو نے فرانس اور ترکی تک اپنے قاصد بھیجے تا کہ ان کے تعاون سے انگریزوں کو جڑ بنیاد سے اکھیڑا جاسکے۔ مگر بدقسمتی سے ایسا کچھ نہ ہوسکا۔

اس دور کے مذہبی وسیاسی حالات کا ذکر کرتے ہوئے انگریز مؤرخ ڈبلیو ایم ٹارانس لکھتا ہے:

''شیواجی کو متعصب اور سلطان ٹیپو کو کٹر مذہبی کہا جاتا ہے لیکن جس وقت ہم نے جنوبی ہند کی ریاستوں میں دخیل ہونا شروع کیا اس وقت ان کے یہاں اس قسم کے مذہبی تنفر کا کہیں نام تک نہ تھا جس طرح انگلستان اور یورپ کے تقریباً سب حصوں میں مخلوق کو تباہ کرنا روا رکھا جاتا تھا۔

جب آئرلینڈ میں کوئی رومن کیتھولک نہ اپنے بزرگوں کی جاگیر کا حق دار سمجھا جاتا تھا نہ فوج کا افسر ہوسکتا تھا۔ جب سویڈن میں سوائے لوتھر کے معتقدین کے اور کسی عقیدے کا کوئی ملازم نہیں ہوسکتا تھا، ٹھیک اس وقت ہندوستان کے اندر اس کے ہر شہر اور شاہی دربار میں ہندو مسلمان عزت حاصل کرنے، سرمایہ کمانے، اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں آزاد تھے۔'' ایشیا میں شہنشاہیت مؤلفہ ڈبلیو ایم ٹارانس۔ (ص ۵۴و۵۵۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد منگلوری۔ طبع اول ۱۹۳۷ء۔ طبع جدید مکتبہ الحق، جوگیشوری، ممبئی۔ رمضان ۱۴۲۲ھ/نومبر ۲۰۰۱ء)

ادھر شمالی ہند میں اپنے استحکام کے بعد انگریزوں نے سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ایک

جال بچھادیا۔ انھوں نے ایک طرف ہندوستان کی زراعت وتجارت وصنعت وغیرہ پر پنجے گاڑ دیے اور دوسری جانب اپنی حکمت عملی سے کرسیِ حکومت واقتدار کی طرف بڑھنا شروع کیا اور اس کے لئے مال وزر اور دھونس دھمکی کی ساری تدبیریں اپناتے ہوئے راجوں، مہاراجاؤں، نوابوں، زمین داروں، تاجروں، بنیوں کے درمیان ایسے ''وفادار غدار'' پیدا کیے جو ان کے اشارۂ ابرو پر رقص کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے۔ جب بات حد سے زیادہ بڑھی تو شمالی ہند میں بھی محاذ آرائی کی نوبت آنے لگی۔ اور پہلی باقاعدہ جنگ پلاسی (بنگال) کے میدان میں علی وردی خاں کے نواسے نواب سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان ۱۷۵۷ء میں ہوئی۔ میر جعفر کی غداری نے نواب سراج الدولہ کو شکست سے دوچار کیا۔ اس پہلی اور زبردست کامیابی سے کمپنی کے فورٹ ولیم میں سونے کا مینہ برسنے لگا۔ اور مرشدآباد ویران ہو کر کلکتہ پورے طور پر آباد ہوگیا۔

''کمپنی اور اس کے ملازمین پر دولت کی موسلادھار بارش شروع ہوگئی۔ اسی لاکھ روپیہ دریا کے راستے مرشدآباد سے کلکتہ روانہ کیا گیا۔ سو سے زیادہ کشتیاں تھیں۔ جھنڈیاں اُڑ رہی تھیں اور باجا بجتا جاتا تھا۔ چند ماہ پہلے جو کلکتہ ویران تھا آج ایسا خوشحال ہوگیا کہ کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ تجارت چمک اٹھی۔ ہر انگریز کے گھر میں دولت کے آثار دکھائی دینے لگے۔ (ص ۵۱۷۔ سوانح کلایو۔ مؤلفہ لارڈ میکالے)

دولت اور کاشت ہر لحاظ سے بنگال نہایت خوشحال ریاست تھی اس لئے انگریز اس سے چمٹ گئے اور اس کا خون چوسنے لگے۔ بنگال کے مرکزی مقام مرشدآباد کی دولت وشوکت کا یہ عالم تھا کہ —

''شہر مرشدآباد مثل لندن کے وسیع اور خوش حال ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ مرشدآباد میں ایسے ایسے افراد ہیں جو جائداد کے مالک ہونے میں انگلستان کے لوگوں سے بدر جہا بڑھے ہوئے ہیں۔ (لارڈ کلایو)

اس کے بعد میر قاسم ونواب شجاع الدولہ سے بکسر (بہار) کے میدان میں ۱۷۶۴ء میں، پھر حافظ رحمت خاں روہیلہ سے روہیل کھنڈ (موجودہ یوپی) کے اندر ۱۷۷۴ء میں، پھر نواب غلام محمد خاں فرزند نواب فیض اللہ خاں رام پوری سے ۱۷۹۴ء میں دو جوڑہ (بریلی) میں اور آخری فیصلہ کن جنگ سرنگہ پٹنم (جنوبی ہند) میں ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو سے ہوئی جس میں ٹیپو کی

شہادت کے بعد ان کی لاش کے قریب کھڑے ہوکر ایک انگریز کمانڈر نے اعلان کیا کہ آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالم گیر کے انتقال کے بعد مغل حکومت کے زوال وانحطاط کا دور شروع ہوگیا تھا۔ اور جتنے بھی مغل بادشاہ اورنگ زیب کے بعد دہلی کے تخت وتاج کے وارث ہوئے وہ عزم وہمت، بہادری واولوالعزمی اور تدبیر جہاں بانی جیسی صفات سے عاری تھے اور ان کے اندر اتنی صلاحیت ولیاقت نہیں تھی کہ پورے ہندوستان پر اپنا قبضہ اور دبدبہ برقرار رکھ سکیں۔ دوسری جانب انگریز نہایت شاطر اور عزم وحوصلہ سے بھرپور تھے۔ اس لئے نہ مغل حکمراں ان کی راہ میں حائل ہوسکے نہ ہی نواب اور راجا مہاراجا ان کا کچھ بگاڑ سکے۔

بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی کمان میں انگریزی فوج نے دلی پر دھاوا بول دیا اور ایک معاہدے کے تحت وظیفہ خوار کی حیثیت سے شاہ عالم کی برائے نام بادشاہت باقی رہی، لیکن عملاً سارے ہندوستان پر انگریز حکومت کرنے لگے۔ ٹھیک یہی حال اس سے پہلے لکھنؤ میں ہوچکا تھا کہ ۱۸۰۱ء میں نواب واجد علی شاہ کو انگریزوں نے ایک ایسے ہی معاہدے کا پابند بنا دیا تھا۔

بعد کے حالات میں ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے اودھ پر اور ۱۸۵۷ء میں دہلی پر اس طرح قبضہ کرلیا کہ بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت اور نواب واجد علی شاہ کی نوابی کا رہا سہا بھرم بھی ختم ہوگیا اور انگریز بلاشرکت غیرے پورے ہندوستان کے حکمراں بن گئے۔

ایک نہایت تلخ حقیقت کا اس موقعہ پر اظہار ضروری ہے کہ اس دور کے ہندوستانی شاہوں و نوابوں وراجاؤں نے اس پہلو سے زیادہ دانش مندی ودور اندیشی کا ثبوت نہیں دیا کہ وہ انقلاب زمانہ کے نئے تقاضوں کو سمجھ سکیں۔ انھوں نے یورپ کے صنعتی انقلاب کی آہٹ محسوس کی اور نہ وہ اسلحہ سازی کے قدیم طریقوں سے آگے بڑھ سکے۔ اس سلسلے میں ٹیپو سلطان کی سیاسی بصیرت اور عسکری مہارت البتہ قابل داد ہے۔ اور انھوں نے اپنے محدود ماحول سے آگے بڑھ کر کئی باتیں سوچ کر ان پر عمل بھی کیا۔ کاش کہ دہلی اور اودھ وبنگال میں بھی کوئی ٹیپو پیدا ہوگیا ہوتا تو ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

انگریز فاتحین اور ان سے پہلے کے فاتحین ہند کا موازنہ کرتے ہوئے مسٹر برک نے ایک بار برطانوی پارلیمنٹ کی اپنی تقریر میں کہا تھا کہ:

"عربوں، ایرانیوں، اور تاتاریوں نے ہندوستان پر بہت سے حملے کیے جن سے اکثر انتہائی خوں ریزی اور تباہی ہوئی۔ ان کے مقابلے میں عموماً ہمارے قدم اس ملک میں اتنا خون بہا کر نہیں بڑھے۔ البتہ ہم نے دغا اور فریب کی مختلف صورتوں کے ساتھ پیش قدمی کی۔ اور اس اندھی اور احمقانہ عداوت سے فائدہ اٹھایا جو ہندوستانی والیانِ ریاست کے درمیان ایک لاعلاج مرض کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ ہم نے کھلے میدان میں قوت آزمائی نہیں کی لیکن سابق فاتحین میں اور ہم میں ایک فرق تھا اور وہ یہ کہ ان کی خوشحالی اور بربادی ان کے لئے نئے وطن یعنی ہندوستان کی خوش حالی اور بربادی کے ساتھ وابستہ ہوجاتی تھی۔ ان کے ماں باپ سوچتے تھے تو یہ کہ اسی سرزمین میں ان کی اولاد پھلے گی پھولے گی۔ اسی طرح ان کے بیٹوں کو بھی اپنے اسلاف کی یادگاریں یہیں محفوظ نظر آتی تھیں۔ زمانہ سابق کے فاتحین کاشتکار اور صناع سے بھاری بھاری محصول تو لیتے تھے لیکن وہ ان جیبوں کو جن سے دوبارہ فائدہ اٹھانا تھا از سرِ نو بھر بھی دیتے تھے۔ مگر انگریزی حکومت میں یہ نظام بالکل بدل گیا ہے۔ تاتاریوں کی یورش سے بے شک ہندوستانیوں کو نقصان پہنچا تھا مگر ہماری حفاظت ہندوستان کو تباہ کیے ڈال رہی ہے۔ نوعمر لڑکے ملک پر حکومت کر رہے ہیں جہاں کے باشندوں سے نہ ان کا میل جول ہے اور نہ ان سے ہمدردی ہے۔ دولت کی ہوس اور تیز مزاجی جتنی کہ کسی جوان میں ہوسکتی ہے وہ ان لوگوں میں بھری ہوتی ہے۔ اور ملک میں ان کی آمد کا تانتا لگا ہوا ہے۔ ایک کھیپ ٹوٹتی ہے تو دوسری پہنچ جاتی ہے۔ ہندوستانی رعایا کے سامنے مستقبل کی صرف ایک مایوس کن صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک غیر محدود زمانہ تک ان موسمی شکاری نئے پرندوں کے نئے غول اسی طرح آتے جاتے رہیں گے جن کی بھوک ہر مرتبہ اور زیادہ تیز ہوتی رہے گی۔ درآں حالے کہ جس چیز کے وہ بھوکے ہیں وہ کم یاب ہوتی

چلی جائے گی۔ (ص۷۸و۷۹۔ تصانیف برق جلد سوم)

انقلاب ۱۸۵۷ء کا کوئی ایک سبب نہیں بلکہ اس کے متعدد اسباب و وجوہ تھے۔ ہندوستانی عوام اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ہماری زمینی پیداوار کا اصل فائدہ انگریز اٹھا رہے ہیں۔ ہماری تجارت اور صنعت کو انہوں نے اس طرح جکڑ لیا ہے کہ اس کا بیشتر فائدہ برطانیہ کو پہنچ رہا ہے۔ ہمیں یا تو ان پڑھ رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے یا ایسی تعلیم ہمارے بچوں کو دینے کے طریقے اور تدبیریں اپنائی جارہی ہیں جسے حاصل کرنے کے بعد ظاہر میں وہ ہندوستانی رہیں لیکن ان کا دل و دماغ انگریزوں جیسا ہو جائے۔ ہمارے سماجی ڈھانچے توڑنے کی اور ہندو مسلم منافرت پھیلانے کی انگریز لگاتار کوشش کررہے ہیں۔ اپنے پادریوں اور مشنری اسکولوں کے ذریعے ہمارے مذہب پر نہ صرف حملے کیے جارہے ہیں بلکہ ہمیں عیسائی بنانے کی اعلانیہ کوشش ہوری ہے۔ ہمارے معزز شہریوں کو ذلیل و خوار کیا جارہا ہے۔ ہمارے علما کی توہین کی جارہی ہے۔ اور سات سمندر پار سے آکر ہمارے اوپر حکومت کی جارہی ہے۔ یہ وہ مجموعی اسباب ہیں جو انقلاب ۱۸۵۷ء کی بنیاد ہیں تاہم مذہب ایک ایسا عنصر ہے جو سب پر فوقیت رکھتا ہے اور اہم ترین سبب یہی خوف ہے کہ ہمیں یا ہماری نسلوں کو جبراً عیسائی بنادیا جائے گا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی درپردہ کوششوں کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما تھا۔

مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی جنھوں نے ۱۸۴۶ء سے دلی، آگرہ، لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ تک اپنی خفیہ مہم کا جال پھیلا رکھا تھا اور میرٹھ کے انقلابیوں میں بھی ان کے آدمی اپنا کام کررہے تھے، ان کی تگ ودو کا محور یہی مذہبی جذبہ تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں بارک پور (کلکتہ) اور مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ کے انقلابیوں نے گائے اور خنزیر کی ملی ہوئی چربی والے کارتوس کو دانت سے کاٹنے سے انکار مذہبی بنیاد پر ہی کیا تھا۔ اور ۱۰ مئی کو میرٹھ سے چل کر جب ۱۱ مئی کی صبح کو ۸۵ انقلابیوں کا دستہ دہلی میں داخل ہوا تو وہ بھی ''دین دین۔ دھرم دھرم'' کے نعرے لگا رہا تھا۔

دہلی وروہیل کھنڈ اور اودھ انقلاب ۱۸۵۷ء کا اصل میدان کارزار تھے اور اس انقلاب کے دوران صحیح معنوں میں علمائے کرام کے فتاویٰ اور ان کی سرپرستی و حوصلہ افزائی مجاہدین اور انقلابیوں کا اصل سرمایہ تھی۔ مشورے اور اقدامات میں علمائے کرام کی رہنمائی ہر جگہ ضروری سمجھی جاتی تھی اور علما کی پشت پناہی نے ہی انہیں میدان جنگ میں دست وبازو آزمانے کا حوصلہ بخشا تھا۔ اس لئے علمائے کرام کا طبقہ

ہی انقلاب ۱۸۵۷ء میں سب سے زیادہ سرگرم اور سب سے اہم تھا جس کی نمائندگی مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی، علامہ فضل حق خیرآبادی، مولانا احمد اللہ شاہ مدارسی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مفتی کفایت علی کافی مرادآبادی، مفتی عنایت احمد کاکوردی، مولانا وہاج الدین مرادآبادی، مولانا رضا علی خاں بریلوی، مولانا امام بخش صہبائی وغیرہ کررہے تھے۔ اور دہلی سے لکھنؤ وآرہ (بہار) تک کے لاکھوں عوام اس انقلاب میں براہ راست شریک تھے۔ سابقہ جنگوں کی طرح کسی ایک محدود علاقے کے نوابوں جیسی یہ جنگ نہیں تھی بلکہ اس انقلاب و جنگ میں پورے طور پر عوامی شرکت وشمولیت اپنے شباب پر تھی۔

۱۸۵۷ء کی عام ناراضی کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے عدالت عالیہ مدراس وممبر کونسل سر میلکم لوئین نے لندن کے ایک رسالہ میں لکھا تھا کہ:

''ہم نے ہندوستانی ذاتوں کو ذلیل کیا۔ ان کے قانونِ وراثت کو منسوخ کیا۔ بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا۔ مذہبی رسم ورواج کی توہین کی۔ عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کیں۔ سرکاری کاغذات میں انھیں کافر لکھا۔ امرا کی ریاستیں ضبط کیں۔ لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا۔ انھیں تکلیف دے کر مال گذاری وصول کی۔ اونچے خاندانوں کو برباد کرکے انھیں آوارہ گرد بنادینے والے بندوبست قائم کیے۔ (ص۱۰۹و۱۱۰۔ روشن مستقبل از سید طفیل احمد منگلوری)

۱۸۵۷ء سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی مذہبی وتعلیمی پالیسی کا خلاصہ یہ تھا کہ

سر چارلس ٹریولین کہتا ہے:

''میرے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ تمام اسکولوں کو جہاں عمدہ تعلیم دی جاتی ہے مالی مدد دی جائے۔ میرا منشا یہ نہیں کہ وہ وقت کبھی نہ آئے گا جب سرکاری مدارس میں بھی مذہب عیسوی کی براہِ راست تعلیم دی جائے گی۔ میرے نزدیک ہمارا اصل اصول یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں کو وہ عمدہ تعلیم دی جائے جس کے حصول کے لئے وہ رضامند ہوں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کوئی تعلیم جو مذہب عیسوی پر مبنی نہ ہو وہ ناقص ہے۔ نتیجہ یہ کہ جب ہندوستان کا بڑا حصہ تعلیم یافتہ ہو جائے گا تب ہمارا فرض ہوگا کہ مذہب عیسوی کی تعلیم جاری کریں گے مگر ہمیں اس امر کی بہت احتیاط کرنی چاہیے کہ فوجوں میں ناراضی نہ پھیلنے پائے۔

...... میرا یقین ہے کہ جس طرح ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے اسی

طرح یہاں بھی سب کے سب عیسائی ہوجائیں گے۔ ملک میں مذہب عیسوی کی تعلیم بلاواسطہ پادریوں کے ذریعہ اور بالواسطہ کتابوں اخباروں اور یورپیوں سے بات چیت وغیرہ کے ذریعہ نفوذ کرے گی۔ حتیٰ کہ عیسوی علوم تمام سوسائٹی میں نفوذ کر جائیں گے۔ تب ہزاروں کی تعداد میں عیسائی ہوا کریں گے۔ ص ۶۹۔ تاریخ التعلیم سید محمود۔ (ص ۱۷۵۔ ہندوستانی مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد منگلوری)

لارڈ میکالے لکھتا ہے:

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو۔ اور یہ جماعت ایسی ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر ذوق اور رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔ ۱۰۵۔ تاریخ التعلیم از میجر باسو۔ (ص ۱۷۱۔ روشن مستقبل از سید طفیل احمد منگلوری)

۱۸۵۷ء میں دہلی کے اندر انگریزوں کے خلاف جہاد کے کتنے فتاویٰ تحریری طور پر دیے گئے ان کی متعین تعداد یقینی طور پر کسی مؤرخ نے نہیں لکھی تاہم بعض تاریخوں میں تین فتاویٰ کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ان تینوں میں سے صرف ایک فتویٰ کی نقل مطبوعہ شکل میں موجود و محفوظ ہے۔ کیوں کہ ۱۸۵۷ء میں ہی دہلی کے ایک اخبار الظفر دہلی نے اس کی نقل شائع کردی تھی۔

منشی ذکاء اللہ دہلوی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ علامہ فضل حق خیرآبادی نے ۱۸۵۷ء میں جامع مسجد دہلی کے اندر انگریزوں کے خلاف جہاد پر ایک ولولہ انگیز تقریر کی اور اسی روز متعدد علما کے دستخط کے ساتھ خود علامہ ہی کی تحریک پر ایک فتوائے جہاد جاری ہوا۔

اسی طرح بریلی میں مفتی عنایت احمد کاکوروی، مراد آباد میں مولانا کفایت علی کافیؔ، بدایوں میں مولانا فیض احمد بدایونی وغیرہ نے زبانی یا تحریری فتاویٰ جاری کیے اور انگریزوں کے خلاف جہاد کا جذباتی ماحول تیار کیا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو جنوبی ہند میں انقلاب تو کیا کوئی قابل ذکر جنبش بھی نہیں ہوئی اور نظام حیدرآباد چوں کہ انگریز نواز تھے ہی اس لئے وہ اس سے پہلے بھی حیدر علی اور ان کے بیٹے فتح علی ٹیپو سلطان کے مقابلے میں ہمیشہ انگریزوں کا ساتھ دیتے رہے۔

ادھر دہلی سے متصل صوبۂ پنجاب جو ہمیشہ ہندوستان کا بازوئے شمشیر زن مانا جاتا رہا تھا، یہ بازو نہ جانے کیوں مجموعی طور پر مفلوج رہا پھر روہیل کھنڈ میں نواب رام پور نظام حیدرآباد کی طرح انگریزوں کے وفادار ثابت ہوئے۔ اور مراد آباد وغیرہ میں انقلابیوں کی بیخ کنی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

ہندوؤں کے درمیان اگرچہ منگل پانڈے، رام کنور سنگھ، رانی لکشمی بائی، نانا پیشوا، تانتیہ ٹوپے، راجا ناہر سنگھ، راؤ تلارام جیسے جواں مرد اور جیالے نظر آتے ہیں مگر مجموعی طور پر ہندوؤں کے اندر وہ جوش و خروش نہیں تھا جو مسلمانوں کے اندر جگہ جگہ پایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں ہی کو زیادہ نشانہ بنایا اور لاکھوں مسلم عوام کے ساتھ ہزاروں علما کو پھانسی دی یا کالا پانی بھیجا یا انہیں تباہ و برباد کیا۔ اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے اندر جوش و خروش اور جذبۂ جہاد علما کے فتاویٰ کی بنیاد پر ہی تھا اور ان کا جذبہ یہ بھی تھا کہ انگریزوں نے مکر و فریب اور ظلم و جارحیت کے ذریعے یہ ملک ہم سے چھینا ہے اس لئے ہمیں بڑھ کر ان انگریزوں سے بزور قوت و طاقت دوبارہ اپنی اس میراث کا وارث بننا ہے اور اس ملک پر ہمیں اپنی حکومت قائم کرنی ہے۔

انگریز مجموعی طور پر ہندو اور مسلمانوں دونوں کا مشترکہ دشمن تھا، کیوں کہ ہندو اور مسلمان ہی کی اس ملک کی غالب اکثریت تھی اور کئی جگہوں پر ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ کی۔ تاہم ۱۸۵۷ء کے جتنے بھی انقلابی تھے وہ سب کے سب بہادر شاہ ظفر کو ہی اپنا بادشاہ سمجھتے تھے۔ اسی لئے رانی لکشمی بائی، نانا پیشوا، تانتیہ ٹوپے وغیرہ نے سبز پرچم لہرایا تھا۔

کئی مؤرخین نے وضاحت کے ساتھ یہ تحریر کیا ہے کہ ۱۹۴۷ء دراصل ۱۸۵۷ء کا تکملہ ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے زعما و قائدین کو تحریک ۱۸۵۷ء ہی سے ملی اور ہندوستان مدتوں بعد آزادی سے ہمکنار ہوا۔

یہاں یہ حقیقت واضح رہے کہ حال کی تاریخ کا ماضی سے بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے اور بہت سی چیزوں کے اثرات و نتائج کسی نہ کسی شکل میں بعد میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کا بھی ہے۔

فکرِ ولی اللٰہی کے وارث و جانشین؟

دارالسلطنت دہلی کے دو مشاہیر علمائے کرام اپنے دینی و علمی فضل و کمال اور علم حدیث کی نشر و اشاعت میں اولیت کے اعتبار سے شہرۂ آفاق ہیں اور ہندوستان کے تقریباً سبھی علما آج بھی انھیں کے دامن فیض سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے پہلے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) اور دوسرے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) ہیں۔

''اس میں ذرا شک نہیں کہ جناب شیخ عبدالحق محدث دہلوی بڑے پایہ کے شخص تھے۔ اس عہد میں سب سے زیادہ جس چیز نے آپ کو تمام دنیا میں مشہور کر دیا تھا وہ آپ کے علمی کارنامے اور حدیث و تفسیر کا درس تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صفحات تاریخ کو آج تک آپ کے نام نامی سے زینت حاصل ہے۔

لیکن انصاف یہ ہے کہ علم حدیث میں جس اولیت کا تمغہ اس زمانے کے مؤرخوں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے لئے تجویز کیا ہے اس کے مستحق جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب ہیں۔ کیوں کہ علم حدیث کے بانی اگرچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی تھے لیکن جنھوں اس عمارت کا نقشہ تیار اور پھر اشاعت و رواج کے مرقعوں سے اس کے در و دیوار کو سجایا وہ شاہ ولی اللہ صاحب ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ڈالی ہوئی بنیادیں آپ ہی کی انتھک کوششوں سے بلند ہوئیں اور اس عروج کو پہنچیں کہ تھوڑے دنوں میں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ اس بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ جناب شاہ ولی اللہ جیسا محدث، مفسر، فقیہ ہندوستان کو اپنی آغوش پالنا بہت کم نصیب ہوا ہوگا۔ بلکہ آپ جیسا طباع، خوش فہم، نکتہ سنج، دقیقہ رس کوئی دوسرا پیدا ہی نہیں ہوا ہوگا۔'' (ص ۲۱۲۔ حیاتِ ولی مؤلفہ ابو محمد رحیم بخش۔ افضل المطابع دہلی)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) ہندوستان کی وہ عبقری شخصیت ہیں جن کے علوم و فنون کی وسعت و جامعیت کے پیش نظر اصحاب فضل و کمال انھیں ''امام الھند'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور ان کے افکار و نظریات کی تحقیق و ریسرچ پر دینی درسگاہوں سے وابستہ علما اور عصری جامعات سے منسلک دانش ور دونوں طبقے خصوصی توجہ مبذول رکھتے ہیں۔ مطالعۂ فکر ولی اللٰہی کا ایک بڑا ہی اہم اور توجہ طلب پہلو یہ ہے کہ جس طرح اس کے حوالے سے بعض افکار و نظریات کی زور و شور کے ساتھ تحقیق بلکہ تبلیغ کی جاتی ہے اسی طرح بعض ان عقائد و معمولاتِ اہل سنت سے صرف نظر کیا جاتا ہے بلکہ انہیں طاقِ نسیان کی نذر کر دیا جاتا ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ کی مستند کتب و رسائل میں مذکور و موجود ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) کے علم و فضل پر ایک طرف علمائے ہند کے درمیان اتفاق ہے تو دوسری طرف ان کی کتب و رسائل میں اجتہاد، تقلید، اعتدال، تجاوز جیسے متضاد عناصر و اسباب کی وجہ سے ایک عجیب کشمکش اور اختلاف بھی ہے۔ ان کے افکار و نظریات کتنے واقعی اور اصلی ہیں اور کتنے فرضی اور الحاقی ہیں اس کی تحقیق بھی ایک دقت طلب مسئلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''فکر ولی اللٰھی'' کے صحیح خد و خال کیا ہیں؟ اسے ان کے دور میں قبول عام حاصل ہوا یا نہیں؟ ان کے اخلاف و تلامذہ ان کے خیالات و آرا میں سے کن باتوں سے متفق ہیں اور کن سے وہ متفق نہیں؟ ان میں سے سوادِ اعظم اہل سنت کے نزدیک کسے قبول عام نصیب ہوا اور کسے مسترد کر دیا گیا؟ ان کی شہرت خود ان کی ذات سے کتنی ہوئی اور ان کے فرزند عزیز حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) کی وجہ سے انھیں کتنی شہرت حاصل ہوئی؟ یہ کئی ایک سوالات ہیں جو اہل علم کی تحقیقِ مزید کے منتظر ہیں۔

اس سلسلے میں حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) نبیرۂ حکیم سید برکات احمد ٹونکی (متوفی ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء) کی ایک اجمالی تحریر پیش خدمت ہے جس میں انھوں نے اپنے مطالعہ کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی اس تحریر کے آئینے میں خود حکیم صاحب کے خیالات بھی واضح اور نمایاں ہیں۔

''شاہ (ولی اللہ) صاحب کے پانچ صاحب زادے تھے۔ ان میں سب سے بڑے شاہ محمد تھے۔ شاہ محمد اگرچہ فاضل تھے اور بقول صاحب نزہۃ الخواطر محدث تھے مگر ان کی علمی سرگرمیوں اور افادۂ تدریس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ پھر ان پر جذب غالب تھا اس لئے وہ خارج از بحث ہیں۔

باقی چار صاحب زادوں میں سب سے بڑے شاہ عبدالعزیز تھے، جن کی عمر شاہ صاحب کی وفات کے وقت صرف ۱۶ سال تھی اور اگرچہ انھوں نے شاہ صاحب سے بھی تحصیل علوم کی تھی مگر تکمیل وفراغ کی منزل والد کی وفات کے بعد شاہ محمد عاشق، شیخ نور اللہ اور خواجہ محمد امین کی رہنمائی میں طے کی تھی۔ پھر اگرچہ وہ ذکاوت وفطانت کی وافر مقدار سے بہرہ ور تھے مگر بہرحال عمر کی اس منزل پر نہیں پہنچے تھے جہاں باپ اپنے بیٹے کو اپنے اسرار وعلوم منتقل کرتا ہے اور اپنے نظریات کو اس کے قلب میں راسخ اور دماغ میں مستحکم کرتا ہے۔ عمر کی ناپختگی کے علاوہ طالب علمی کا عہد بھی ان کاموں کے لئے ناموزوں اور ناسازگار ہوتا ہے۔ فراغ کے بعد جب طالب علم کو قطع کی ہوئی منزلوں کی طرف پلٹ کر دیکھنے کا موقع ملتا ہے اور حاصل کیے ہوئے ذخیرے کے جائزے کی مہلت ملتی ہے اور تدریس یا تالیف کی ضرورتوں کے پیشِ نظر معلومات کی ترتیب، مختلفات میں تطبیق، اپنے مسلک کی تعیین اور غیر نصابی کتب کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے تو درحقیقت وہ منزل آتی ہے جسے قدیم درس گاہی زبان میں ''حقیقی طلب علم'' کی منزل کہا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ شاہ عبدالعزیز کو نوعمری، والد کی مسلسل بیماری، طلب علم میں مصروفیت کی بنا پر اپنے والد کے مزاج سے تعارف اور ان کے منفردانہ افکار کے جذب وہضم کا موقع نہیں ملتا تھا۔

دوسرے تین بھائیوں کا تو ذکر ہی کیا کہ وہ علی الترتیب ۱۲۔ ۸۔ اور ۴ برس کے تھے۔ حاصل یہ کہ شاہ صاحب کو اس کا موقع نہیں ملا کہ وہ اپنے صاحب زادوں کو اپنے انداز فکر کی تربیت دے سکتے۔

اب تلامذہ کو لیجیے۔ اولاً تو شاہ صاحب کے تلامذہ کی تعداد پہلے ہی بہت مختصر ہے اور اس کی کی وجہ شاہ عبدالعزیز کے بیان (ص ۴۰۔ ملفوظات عزیزی) کے مطابق یہ تھی کہ جب اپنے شاگردوں کی ایک ایسی جماعت تیار کرلی جو مختلف فنون کے ماہر تھے تو مدرسہ ان کے سپرد کر کے خود فکر وتحقیق اور تصنیف وتالیف کے لئے وقف ہوکر رہ گئے تھے۔ اسی بیان سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ یہ محدود تعداد ان سے اس عہد میں مستفید ہوئی تھی جب ان کے افکار میں مجتہدانہ رنگ، انقلابیت، انفرادیت اور پختگی نہیں آئی تھی۔ گویا یہ تلامذہ میاں ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم کے تلامذہ تھے جو اپنے دور کے ایک ممتاز محنت کش، ذہین ومستعد عالم تھے۔ مفکر اسلام، مجدد مأۃ اور مسوّیٰ، مصفّیٰ، حجہ اور ازالہ کے مصنف حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے تلامذہ نہیں تھے۔

ثانیاً: جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں چند تلامذہ شاہ صاحب کے مسلک سے منحرف تھے۔ شاہ اہل اللہ ''حنفی حنیف'' تھے۔ مخدوم معین ٹھٹوی تشیع کی طرف میلان رکھتے تھے۔ قمرالدین منت نے مسلکِ تشیع اختیار کر ہی لیا تھا۔

ثالثاً: شاہ صاحب کی وفات کے صرف دس سال کے بعد حلقۂ ولی اللٰہی کو ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس نے اس حلقے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ ہوا یہ کہ ایک ہی سال ۱۱۸۷ھ میں حلقہ کے ایک دو نہیں پانچ اراکین واساطین ''باجماعت'' رحلت کر گئے۔

(۱) شاہ اہل اللہ برادر خورد اور شاگرد۔

(۲) شیخ نور اللہ پھلتی، رفیق درس، شاگرد، دوست، ممیرے بھائی، نسبتی بھائی اور خلیفہ۔

(۵) حاجی محمد سعید بریلوی، شاگرد۔

یہ تھے وہ حالات جن کا تعلق بخت واتفاق سے تھا اور جن کی بنا پر مسلک شاہی کے متبعین و مؤیدین کا دائرہ وسیع نہ ہوسکا۔

فکر ولی اللٰہی کے عدمِ قبول کا وہ سبب بھی بہت اہم ہے جس کا تعلق خود شاہ صاحب سے ہے۔ اور اسی سبب کا تعلق ہم مخاطبین و قارئین سے بھی ہے۔ شاہ صاحب دراصل غیر معمولی انسان تھے، دل کے لحاظ سے بھی اور دماغ کے لحاظ سے بھی۔

ان کا تفکر حقیقت پسندانہ اور ابلاغ دیانت دارانہ تھا۔ وہ کسی بھی مسئلے پر خواہ اس کا تعلق فقہ سے ہو یا عقائد وکلام سے، تفسیر سے ہو یا تصوف سے، پہلے سے کوئی رائے قائم کر کے غور نہیں کیا کرتے تھے۔ پھر ان کے نتائج فکر جو کچھ ہوتے تھے ان کو جوں کا توں نذرِ قرطاس وسپردِ قلم کردیا کرتے تھے۔

ان کا اندازِ فکر غیر جانب دارانہ اور ''غیر فرقہ وارانہ'' تھا۔ وہ خاندانی طور پر فقہ، کلام اور تصوف کے مکاتبِ فکر میں سے ایک مکتب فکر سے وابستہ تھے، لیکن فکر وتحقیق کے مرحلے میں وہ ہر مسئلے اور ہر جزیئے میں اپنے مکتب فکر کی ہم نوائی اور تائید وانتصار کے پابند ہوکر نہیں رہتے تھے۔

ان کا اندازِ فکر ''غیر مقلدانہ'' اور ''مجتہدانہ'' بھی تھا۔ وہ صرف نقلِ اقوال اور جمع وترتیب پر اکتفا کے قائل نہیں تھے۔ وہ اپنے دماغ کو بھی زحمتِ تفکر دیتے رہنے کے عادی تھے۔

تاریخ اسلام کے عمیق مطالعے، عالمِ اسلام کے عہد حال پر وسعتِ نظر، اسباب زوال امت کے مفصل جائزے، کثرت مطالعہ، وسعتِ نگاہِ صوفیانہ اور دردمندانہ افتاد مزاج کی وجہ سے وہ

خلافیات میں رفع نزاع اور دفع تعارض کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ اسباب اختلاف کا سراغ لگا کر وجوہ اشتراک معلوم کر لینے کی فکر میں رہتے تھے۔ تطبیق و توافق ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اربابِ تسنن اور اصحابِ تشیع کے مختلفات ہوں یا فقہائے اربعہ کے تعارضات یا صوفیا کے باہم متناقض نقطہ ہائے نظر، وہ جہاں تک امکان ہوتا ان میں تطبیق کی کوشش کرتے تھے اور متحاربین کو راہِ اعتدال دکھاتے تھے۔

..........آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ شاہ صاحب جیسا ''اعتدال پسند''، ''تطبیق کوش'' اور ''خود فکر عالم'' ہم جیسے ''خانہ نشینوں'' اور ''انتہا پسندوں'' میں کس طرح قبول حاصل کر سکتا تھا اور اس کی تحریک ہمارے معاشرے میں کس طرح رسوخ و رواج پا سکتی تھی؟

......شاہ صاحب نے ''وحدت وجود'' اور ''وحدتِ شہود'' میں تطبیق فرمائی تو وجودی خوش ہوئے نہ شہودی۔ مرزا مظہر جان جاناں نے خود بھی ناپسندیدگی ظاہر فرمائی اور ''کلمۃ الحق'' بھی لکھوایا۔

..........فقہی مسائل میں اعتدال و توسط اختیار کرنے کے جرم میں احناف نے ان سے برأت کی ضرورت محسوس کی۔ مگر اہل حدیث نے ان کے افکار میں خامی محسوس کر کے خود رسائل تصنیف کیے اور ان کے نام سے منسوب کر دیئے۔ اپنی باتیں ان کی زبان سے کہلوائیں اور احناف سے ان کو مزید بدظن اور دور تر کر دیا۔ (ص ۹۰ تا ۹۳۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے اصحاب۔ مرتبہ حکیم محمود احمد برکاتی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵۔ مارچ ۲۰۰۶ء)

فکر ولی اللّٰہی کا ایک وہ رخ ہے جس کا بیشتر محققین و مؤرخین کی کتب و رسائل میں شہرہ ہے۔ اور ایک رخ یہ ہے جس سے نظریں چرائی جاتی ہیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ کوئی اس مسلکِ ولی اللّٰہی پر مطلع نہ ہونے پائے۔ یہ تحقیق نہیں بلکہ کتمانِ حق ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنی متعدد کتب و رسائل میں اپنے معتقدات، اپنے مشاہدات اور معمولات و مراسم اہل سنت کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں:

(۱) اور میں نے دیکھا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اکثر امور میں اُسی صورت مقدس میں جس میں آپ تھے، بار بار۔ باوجودیکہ میری کمال آرزو تھی کہ روحانیت میں دیکھوں جسمانیت میں نہ دیکھوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ مجھ کو دریافت ہوا کہ آپ کا خاصہ ہے روح کو صورت جسم میں کرنا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اور یہی بات ہے جو آپ نے فرمایا ہے کہ:

انبیا نہیں مرتے اور نماز پڑھا کرتے ہیں اپنی قبروں میں۔ اور انبیا حج کیا کرتے ہیں اپنی قبروں میں۔ اور وہ زندہ ہیں۔ الیٰ غیر ذالك (ترجمہ ص ۲۸۔ فیوض الحرمین مؤلفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مطبوعہ مطبع احمدی متعلق مدرسہ عزیزی دہلی۔ باہتمام سید ظہیر الدین عرف سید احمد دہلوی نواسۂ شاہ رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ دہلوی)

(۲) اور اس سے پہلے مکہ مبارکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مولد مبارک میں تھا۔ میلاد شریف کے روز اور لوگ جمع تھے۔ درود شریف پڑھتے تھے اور بیان کرتے تھے وہ معجزے جو وقتِ ولادت ظاہر ہوئے تھے۔ اور وہ مشاھدے جو نبوت سے پہلے ہوئے تھے۔

تو میں نے دیکھا کہ یکبارگی انوار ظاہر ہوئے۔ میں نہیں کہتا کہ ان آنکھوں سے دیکھا اور نہ کہتا ہوں کہ روح کی آنکھوں سے فقط۔ خدا جانے کیا امر تھا۔ ان آنکھوں سے دیکھا یا روح کی آنکھوں سے۔ تأمل کیا تو معلوم ہوا کہ یہ نوران ملائکہ کا ہے جو ایسے مشاہد اور ایسی مجلسوں پر مؤکل و مامور ہیں۔ اور میں نے دیکھا کہ انوار ملائکہ اور انوارِ رحمت دونوں ملے ہوئے ہیں۔ (ترجمہ ص ۲۷۔ فیوض الحرمین)

میرے والد بزرگوار (شاہ عبدالرحیم) نے مجھے خبر دی۔ فرمایا کہ

میں میلاد النبی کے روز کھانا پکوایا کرتا تھا میلاد پاک کی خوشی میں۔ ایک سال میں اتنا تنگ دست تھا کہ میرے پاس کچھ نہ تھا سوائے بھُنے ہوئے چنے کے۔ وہی میں نے لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیے۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو بھُنے ہوئے چنے رکھے ہوئے ہیں اور آپ بہت خوش اور ہشاش بشاش ہیں۔ (ترجمہ ص ۴۰۔ الدر الثمین فی مبشراتِ النبی الامین۔ مؤلفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ مطبوعہ دار الاشاعت علویہ لائل پور، پنجاب، پاکستان۔ ۱۹۷۰ء)

بارہویں ربیع الاول کو حسب دستور قدیم میں نے قرآن مجید پڑھا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نیاز تقسیم کی اور موئے مبارک کی زیارت کی۔ اثناء زیارت ملأ اعلیٰ حاضر ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ پُرفتوح نے اس فقیر (شاہ ولی اللہ) اور فقیر کے دوستوں کی طرف نہایت التفات فرمایا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ملاءِ اعلیٰ اور مسلمانوں کی جماعت کا ایک دائرہ ہے کہ ان کے ناز و نیاز اس سے عروج کر رہے ہیں اور برکات و نفحات اس سے نزول کر رہے

ہیں۔ (ص ۹۸۔ القول الجلی فی ذکر آثار الولی۔ مرتبہ شیخ محمد عاشق پھلتی خلیفہ شاہ ولی اللہ محدث
دہلوی۔ مترجم مولانا حافظ تقی انور علوی کاکوروی۔ مطبوعہ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاظمیہ کاکوری شریف
ضلع لکھنؤ۔ ۱۹۸۸ء)

(۳) پس شان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مرد واحد کی شان نہیں ہے بلکہ ایک عالم
مبتدأت منبسطہ ہے اور صورت بشری اور بشر ایک عالم منبسط ہے وجہِ موجودات کا۔ تو گویا آں
حضرت صلی اللہ علیہ وسلم غایت الغایات ہیں اور ظہور کے آخرِ نقاط ہیں۔ اور ہر موج کی حرکت ہے
اُس کی منتہا تک اور ہر سیل کو شوق ہے اپنے مبلغ تک۔ پس غور کر کہ سرِ دقیق ہے۔

مشہدِ آخر۔ میں نے دیکھا کہ حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں شفاعت اور توسل ہے
ان کو جو علمائے حدیث ہیں اور جو اُن کی گنتی میں داخل ہیں۔ (ترجمہ ص ۵۳۔ فیوض الحرمین)

جب میں داخل ہوا مدینہ منورہ میں اور زیارت کی روضۂ مقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی۔ آپ کی روح مبارک و مقدس کو دیکھا ظاہر اور عیاں نہ فقط بیچ عالم ارواح کے بلکہ ان آنکھوں
کے قریب قریب۔ (ترجمہ ص ۲۷۔ فیوض الحرمین)

جب تیسرا روز ہوا میں نے سلام پڑھا آپ پر اور حضرت ابو بکر صدیق و حضرت عمر فاروق
رضی اللہ عنہما پر۔ پھر عرض کیا کہ

یارسول اللّٰہ! عنایت ہو اس میں سے جو اللہ نے آپ کو دیا ہے۔ ہم آپ کی عطا کے
شوق میں آئے ہیں اور آپ رحمة للعالمین ہیں۔

تو آپ نے میری طرف کمالِ التفات کیا یہاں تک کہ میں نے خیال کیا کہ گویا چادر
مبارک کے دامن سے لپیٹ لیا اور اڑھالیا خوب اچھی طرح۔ اور ظاہر کیے مجھ پر اسرار اور پہچنوایا
مجھ سے خود کو اور امداد کی مجھ کو امدادِ اجمالی بہت بڑی۔ اور بتایا مجھ کو کہ کس طرح آپ سے اپنی
حاجتوں میں مدد چاہوں اور کس طرح وہ جواب دیتے ہیں جب آپ پر کوئی درود پڑھے۔ اور کیسے
خوش ہوتے ہیں اس سے جو آپ کی مدح میں کوشش کرے یا آپ سے اِلحاح کرے۔

پس دیکھا میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہ اپنے جوہر روح اور دیدن نفس و جبلت
وفطرت کے سبب ہو گئے مظہر تدلی سے ایسے جو تدلی عظیم اور منبسطہ ہے جہتِ بشر پر۔ جس میں ظاہر
اور مظہر کی تمیز نہیں ہوتی۔ اور یہی تدلی عظیم ہے وہ جو صوفیہ کی رائے میں حقیقت محمدیہ ہے۔

(ترجمہ ص ۲۸، ۲۹۔ فیوض الحرمین)

یارسول اللّٰہ! آپ مجھے پناہ دینے والے ہیں جب مصیبت ہجوم کر آئے اور اپنے
اذیت ناک تیز پنجے میرے دل میں گاڑ دے۔

یارسول اللّٰہ! مجھے ان مصیبتوں اور گردشِ زمانہ کا کوئی اندیشہ اور فکر نہیں۔ کیوں کہ میں
حضور کی نگاہِ کرم سے مضبوط قلعوں میں محفوظ ہوں اور جنگ کرنے والے کی تلوار کے درمیان اور
میرے درمیان ایک آہنی دیوار حائل ہے۔ (ترجمہ ص ۱۹۳۔ قصیدہ اطیب النغم از شاہ ولی اللہ
محدث دہلوی، مطبوعہ لاہور)

آخر میں اِستادہ ہوا روبرو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور سلام عرض کیا اور کمالِ عاجزی
سے ہاتھ پھیلائے آپ کے حضور اور اپنی روح کو ملا دیا آپ سے۔ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم
سے ایک نور چمکا اور میری روح نے بہت اچھی طرح اس سے ملاقات کی۔ ایک لحہ بھر کے عرصہ
میں یا اس کے قریب۔ تو میں نے بہت تعجب کیا کہ کس قدر جلدی ملاقات کی اور اصل و فرع و تمام
اطراف کو محیط رہا ایک آن میں بلکہ آن سے بھی کم میں۔ اور وہ نور ایک تجلی ہے اس حبل ممدود کی
جس سے تمام عالم بندھا ہوا ہے۔

پس میں نے دیکھا کہ یہ تجلی آپ کے جوہر روح مبارک میں داخل ہے اور اصل اس حبلِ
ممدود کی تدبیر واحد فائض ہے اُس مبدأ سے جس کی تفصیل تمام عالم ہے۔ اور فروع اس حبلِ ممدود
کی وہ تدبیراتِ تفصیلیہ ہیں جن سے عالم کا قوام ہے۔ (ترجمہ ص ۴۴۔ فیوض الحرمین)

(۴) میں نے سوال کیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث شریف کے معنی جو
آپ نے فرمایا ہے۔ كنت نبياً و آدم بين الماء و الطين۔ ابھی آدم آب و گل میں تھے
کہ میں نبی تھا۔ اور میرا سوال زبانِ مقال سے نہ تھا اور نہ دل کے خطرات سے بلکہ اس سر کے شوق
و آرزو سے میری روح بھری ہوئی تھی۔ پھر میں چمٹ گیا اس جناب سے بہت اپنی طاقت کے
موافق۔ پھر میں بھر گیا اس جناب سے ساتھ صورت مثالی کے۔

پس آپ نے دکھائی صورتِ مبارک مثالی جو عالمِ اجسام سے پہلے پائی جاتی تھی۔ پھر
آپ نے دکھائی مجھ کو کیفیت اس عالم میں آنے کی عالم مثال سے۔ اور دکھائیں مجھے صورتیں
انبیائے مبعوثین کی کہ کس طرح ان پر افاضہ ہوئی نبوت حضرتِ تدبیر سے۔ مقابل اس کے جو لی

آپ کو عالم مثال میں اس حضرت سے۔ اور دکھائیں مجھ کو صورتیں اولیا کی اور جس طرح ملے ان کو علم اور معرفت۔ بعد اس کے تو حال مجھ کو معلوم ہو گیا اور ظاہر ہو گیا اور میں ظرف بن گیا اس چیز کا جو مجھ کو ملا صورتِ مثالیہ سے۔ اور میں نے جان لیا جو آپ نے اس افاضہ میں چاہا۔
(ترجمہ ص ۳۴۔ فیوض الحرمین)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے روحانی سوال کیا کہ کنت نبیاً و آدم منجدل بین الماء و الطین کے کیا معنی ہیں؟ تو میری روح پر روحِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوئی اور ایک ایسی صورت مثالیہ دکھائی گئی جو عالم اجسام میں آنے سے پہلے تھی اور اس کا فیضان بارگاہ مثال میں نمایاں ہو رہا تھا۔ گویا جب حضرت آدم کا خمیر ہو رہا تھا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس بارگاہِ مثال میں ظہور تام تھا اس لئے جب آپ عالم جسمانی میں ظاہر ہوئے اور عالم جسمانی میں منتقل ہوئیں قوائے مثالیہ تو وہ علوم ظاہر ہوئے جن کا کوئی حساب نہیں۔ (ترجمہ ص ۲۹۔ الدر الثمین)

(۵) مجھے میرے والد (شاہ عبدالرحیم) نے بتایا کہ انھوں نے بحالتِ بیماری ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا! اے بیٹے تیرا کیا حال ہے؟ پھر آپ نے میرے والد کو صحت و شفا کی خوشخبری دی۔ اور اپنی مبارک داڑھی کے دو بال عنایت فرمائے۔ جس کی برکت سے وہ اسی وقت تندرست ہو گئے۔ اور جب وہ خواب سے بیدا ہوئے تو وہ دو موئے مبارک موجود تھے جس میں سے ایک موئے مبارک میرے والد نے مجھے دیا جو میرے پاس موجود ہے۔ (ترجمہ ص ۳۵۔ الدر الثمین)

(۶) شیخ ابوطاہر کردی سے واسطہ در واسطہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو دلائل الخیرات مؤلفہ حضرت شیخ محمد بن سلیمان جزولی و قصیدۂ بُردہ از امام ابوصیری کی اجازت حاصل ہوئی تھی۔
(الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ مؤلفہ شاہ ولی اللہ مطبوعہ دہلی)

(۷) مجھے میرے والد (شاہ عبدالرحیم) نے بتایا کہ انھوں نے خواب میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، اور بیعت سے مشرف ہوئے اور آں حضرت نے نفی و اثبات کا طریقہ تلقین فرمایا بطور صوفیہ کے۔ اور جناب والد نے بیعت لی مجھ سے اور اسی طرح ذکر نفی و اثبات کی تلقین کی۔ (ترجمہ ص ۳۴۔ الدر الثمین)

مجھے میرے چچا (ابوالرضا محمد) نے بتایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایسے راستے پر میں چل رہا ہوں جہاں کوئی اور نہ تھا۔ پس اچانک ایک مرد نے اشارہ کیا کہ میرے پاس آؤ۔ پھر فرمایا کہ اس مرد بزرگ نے کہا کہ
اے ست رفتار مرد! میں علی ہوں۔ مجھے تیری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے تا کہ میں تجھے آپ کے پاس لے چلوں۔
پھر میرے چچا نے بتایا کہ ہم گئے بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں۔ فرمایا میرے چچا نے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ کے نیچے لیا اور اپنا ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو کیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! یہ ہاتھ ابوالرضا محمد کا ہے۔
پس بیعت فرمائی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ پھر فرمایا حضرت علی نے کہ میں واسطہ ہوں درمیان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اولیاء اللہ کے۔ اور اشارہ کیا تیری طرف۔ پھر ذکر تلقین کیا۔
(ترجمہ ص ۴۴۔ الدر الثمین)

(۸) میں نے غور کیا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مذاہب فقہ میں سے کس مذہب کی طرف مائل ہیں تا کہ میں بھی وہی مذہب اختیار کروں؟ تو معلوم ہوا کہ سب مذہب آپ کے نزدیک برابر ہیں۔ علم فروع ایک حالت میں نہیں۔ (ترجمہ ص ۳۰۔ فیوض الحرمین)
مجھ کو پہچوایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنفی مذہب میں ایک بہت اچھا طریقہ ہے۔ وہ بہت موافق ہے اس طریقہ سنت سے جو تنقیح ہوا زمانہ بخاری اور اس کے اصحاب میں۔
اور وہ یہ ہے کہ اقوالِ ثلثہ یعنی امام اعظم اور صاحبین سے جو اقرب ہو وہ لے لیا جائے۔ پھر اس کے بعد ان فقہائے حنفی کی پیروی کی جائے جو علمائے حدیث سے ہیں۔ کیوں کہ بہت چیزیں ہیں کہ امام اعظم اور صاحبین نے اصول میں نہیں بیان کیں اور نہ ان کی نفی کی ہے اور حدیثیں ان پر دلالت کرتی ہیں۔ تو ان کا اِثبات ضرور ہے اور سب مذہب حنفی ہیں۔ (ترجمہ ص ۴۸، ۴۹۔ فیوض الحرمین)
اور خبردار کبھی قوم کا مخالف فروع میں نہ ہونا اس لئے کہ یہ مناقضہ ہے حق کی مراد کا۔
پھر مجھ پر کھلا ایک نمونہ۔ اس سے ظاہر ہوئی کیفیت و تطبیق سنت کے ساتھ فقہ حنفیہ کے اخذ کرنے سے ایک کے قول اقوال ثلثہ یعنی امام اعظم اور صاحبین سے۔ اور کشف ہوئی تخصیص ان

کے عمومات کی۔ اوران کے مقاصد کا وقوف اور اقتصار اس پر جو لفظ سنت سے سمجھا جاتا ہے۔
اور اس میں نہیں تاویل بعید اور نہ ضرب کسی حدیث کا دوسری حدیث پر اور نہ ترک کرنا ہے
حدیث کا امت میں سے کسی کے قول سے۔ اور یہ طریقہ کہ اسے اللہ تعالیٰ تام و کامل کردے تو
کبریت احمر و اکسیر اعظم ہے۔ (ترجمہ ۶۲، ۶۳۔ فیوض الحرمین)
ہم کہتے ہیں کہ دکھائی دیا ہم کو کہ مذہب حنفی میں کہ ایک سر غامض ہے۔ پھر میں ہمیشہ اس
میں غور کیا کرتا تھا کہ کیا سر غامض ہے؟ یہاں تک کہ میں نے پایا جو بیان کر چکا ہوں۔
اور مجھ کو مشاہدہ ہوا کہ اس مذہب حنفی کے واسطے اس زمانہ میں ترجیح ہے سب مذہبوں پر
موافق اس معنی دقیق کے۔ اگر چہ بعضے مذہب زیادہ ترجیح رکھیں موافق پہلے معنوں کے۔
میں نے مشاہدہ کیا کہ یہ وہ سر ہے جس کو اکثر صاحب کشف دریافت کرتے ہیں اور اک
ایک نوع کا، پس ترجیح ہے اس مذہب کو سب مذہبوں پر۔ اور اکثر اوقات متمثل ہوتا ہے الہام اس
میں مضبوط رہنے کا یا خواب میں دیکھتا ہوں اسی پر عمل کرنے کو۔ اور حق صریح وہی ہے جو ہم نے کہا
ہے۔ اس کو خوب مضبوط داڑھوں سے پکڑو پھر غور کرو۔ (ترجمہ ص ۱۰۵۔ فیوض الحرمین)

(۹) میں ایک دفعہ شہر کھمبات کی مسجد میں عصر کے بعد مراقبہ میں تھا تو روحِ رسول مکرم صلی
اللہ علیہ وسلم کو مشاہدہ کیا کہ جلوہ گر ہوئی اور رسول مکرم نے مجھے ایک چادر اڑھائی تو اسی وقت
مجھ پر علوم شریعت کے بعض دقائق ظاہر ہوئے اور وہ برابر زیادہ ہوتے چلے گئے۔ (ترجمہ
ص ۲۸۔ الدر الثمین)

حضرت حسن و حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے گھر تشریف
لائے ہیں اور حضرت حسن کے ہاتھ میں ایک قلم ہے جس کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے۔
آپ نے دستِ مبارک بڑھا کر مجھے قلم عنایت فرمانے کے ارادہ سے ارشاد فرمایا کہ ھذا
قلمُ جَدّی۔ یہ میرے نانا جان کا قلم ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ پھر آپ نے ہاتھ روک لیا
اور فرمایا کہ حسین اس کی اصلاح کر کے اسے سنوار دیں۔ پھر حضرت حسین نے اس قلم کو سنوار
کر کے مجھے عنایت فرمایا۔

پھر حضرت حسن نے مجھے ایک چادر سے سرفراز فرمانا چاہا تو اسے حضرت حسین نے لے کر
اٹھایا اور فرمایا کہ ھذا رداءُ جدّی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ چادر میرے نانا

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ پھر وہ چادر مجھے اڑھادی۔ اس روز سے میرا سینہ علوم شریعت
میں تصنیف و تالیف کے لئے کھل گیا۔ فالحمد للہ۔ (ترجمہ ص ۲۸ و ۲۹۔ الدر الثمین)

ایک دن میرے دل میں ایک بات ڈالی گئی۔ جس کا اجمال یہ ہے کہ آج مجھے ایک نعمت
ملے گی۔ میں سیر و تفریح کے خیال سے باہر نکل کر شہر کے بعض مقامات سے گذرا تو میرے دل نے
گواہی دی کہ تیرا مطلوب یہیں ہے۔ میں نے وہاں کے لوگوں سے پوچھا! یہاں کوئی درویش یا
فاضل ہے؟ لوگوں نے جواب دیا! ہاں اس جگہ فلاں درویش رہتے ہیں۔
میں ان کی زیارت کو پہنچا تو درویش کہنے لگے کہ حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کا جبہ مبارکہ
مجھ تک پہنچا ہے۔ اور آج رات مجھے حکم دیا گیا ہے کہ آج کے دن جو آدمی سب سے پہلے میرے
سامنے آئے اسے میں یہ جبہ مبارکہ دے دوں۔ چنانچہ میں نے وہ جبہ مبارکہ اس درویش سے لیا
اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ (ص ۹۸۔ انفاس العارفین مؤلفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ مکتبۃ الفلاح دیوبند)

(۱۰) اولیا و مشائخ کرام کی ارواح طیبہ کی طرف متوجہ ہو۔ ان کے لئے فاتحہ پڑھے یا ان
کی قبر کی زیارت کے لئے جائے اور وہاں انجذاب کی طلب کرے۔ (ص ۳۴۔ ہمعات از شاہ
ولی اللہ محدث دہلوی۔ مطبوعہ حیدر آباد)

اعراسِ مشائخ کی پابندی کرنا، ان کے مزارات پر ہمیشہ جاتے رہنا، ان کے لئے فاتحہ
پڑھنے کو لازم کرنا اور ان کے ایصالِ ثواب کے لئے صدقہ دینا۔ (ص ۵۸۔ ہمعات)

۸ ربیع الآخر ۱۱۴۳ھ کو شاہ ولی اللہ صاحب اپنے ماموں کے ساتھ لاہور کے لئے روانہ
ہوئے۔ اس سفر میں جہاں کہیں بھی کسی ولی و بزرگ کا مزار ہوتا وہاں جاتے۔ اور اس کو جس قسم کی
نسبت حق سے ہوتی وہ آپ کو مکشوف ہوتی اور اسے آپ بالتفصیل بیان فرماتے۔

جب پانی پت پہنچے تو حضرت شاہ بو علی قلندر، شاہ شمس الدین ترک، شاہ جلال الدین
تھانیسری علیہم الرحمہ کے مزارات پر حاضری دی۔ اس کے بعد سرہند پہنچ کر مجدد الف ثانی حضرت
شیخ احمد فاروقی سرہندی کے مزار پر حاضری دی۔ وہاں سے لاہور پہنچ کر حضرت شیخ علی ہجویری
معروف بہ داتا گنج بخش لاہوری کے مزار پر حاضر ہوئے۔ پھر ملتان پہنچ کر حضرت مخدوم بہاء
الدین زکریا اور شاہ رکن الدین عالم کے مزارات پر گئے۔ اور تمام اہلِ قبور کے احوال بیان
فرمائے۔ (ملخص ص ۵۲۔ القول الجلی۔ مؤلفہ محمد عاشق پھلتی خلیفۂ شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مطبوعہ لکھنؤ)

ماضی قریب کے نقشبندی مجددی عالم شاہ ابوالحسن زید فاروقی دہلوی (متوفی ۱۹۹۳ء) القول الجلی مرتبہ حضرت شاہ محمد عاشق پھلتی خلیفہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے ایک فارسی عبارت مع ترجمہ وتشریح لکھنے کے بعد جونتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ ذیل میں انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت ایشاں فرمودند کہ دوازدہم ربیع الاول بہ حسب دستور قدیم قرآن خواندم و چیزے نیاز آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم قسمت کردم و زیارت موئے شریف نمودم۔ در اثنائے تلاوت ملأ اعلیٰ حاضر شدند و روحِ پُرفتوح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہ جانب ایں فقیر و دوست دارانِ ایں فقیر بہ غایت التفات فرمود۔

ودرآں ساعت کہ ملأ اعلیٰ و جماعتِ مسلمین کہ بافقیر بود بہ ناز و نیازش صعود می کنند۔ و برکات و نفحات ازاں حال نزول می فرماید۔ (ص ۷۴۔ و ترجمہ ص ۹۸۔ القول الجلی)

یعنی حضرت (شاہ ولی اللہ) نے فرمایا کہ قدیم طریقہ کے موافق بارہ ربیع الاول کو میں نے قرآن مجید کی تلاوت کی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ نیاز تقسیم کی۔ اور آپ کے بال مبارک کی زیارت کرائی۔ تلاوت کلام پاک کے دوران میں ملأ اعلیٰ کا ورود ہوا (فرشتے نازل ہوئے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پُرفتوح نے اس فقیر اور اس سے محبت کرنے والوں کی طرف بہت التفات فرمائی۔

اس وقت میں نے دیکھا کہ ملأ اعلیٰ (فرشتوں کی جماعت) اور ان کے ساتھ مسلمانوں کی جماعت نیازمندی اور عاجزی کی بنا پر بلند (عروج کررہی ہے) ہورہی ہے (اوپر اٹھ رہی ہے) اور اس کیفیت کی برکتیں اور اس کی لپٹیں نازل ہورہی ہیں۔

تشریح:

اس ملفوظ سے صاف طور پر ثابت ہے کہ خاص بارہ ربیع الاول کو شاہ ولی اللہ دہلوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فاتحہ اور نذر ونیاز دلوایا کرتے تھے۔ اور یہ آپ کا پرانا طریقہ تھا۔ اور نیک بخت

حاضرین کو موئے مبارک از بس مکرم ومقدس کی زیارت کراتے تھے۔ اور شیرینی تقسیم کرتے تھے۔ تاریخ کی تعیین کی وجہ سے (پناہ بخدا) کراہت تو درکنار آپ کو برکات اور انوار نظر آتے تھے۔ آپ حاضرینِ محفل کے درجات بلند ہوتے ہوئے دیکھتے تھے (تفصیل کے لئے دیکھیے فیوض الحرمین) هذهٖ سبيلي ادعو الى الله علىٰ بصيرة انا و من اتبعني۔

آپ نے رسالہ الدر الثمین کے صفحہ ۸ حدیث ۲۲ میں اپنے والد حضرت شاہ عبدالرحیم کا بیان نقل کیا ہے کہ:

میں ایام مولود میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے میلاد کا کھانا پکوایا کرتا تھا۔ ایک سال کچھ پاس نہ تھا۔ کچھ بھنے چنے تھے جن کو میں نے تقسیم کیا۔ میں نے دیکھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھُنے چنے رکھے ہوئے ہیں۔ اور آپ شاد اور بشاش ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اور آپ کے والد بزرگوار پابندی کے ساتھ میلاد مبارک کے دن خوشی کا کھانا اور شیرینی تقسیم کیا کرتے تھے۔ اور یہی حضرت شاہ عبدالعزیز اور آپ کے شاگردوں کا طریقہ رہا۔ رحمة الله عليهم اجمعين۔ (ص ۲۳ تا ۲۵۔ القول الجلی کا مقدمہ از شاہ ابوالحسن زید فاروقی۔ ناشر شاہ ابوالخیر اکاڈمی، چتلی قبر، دہلی ۶۔ ۱۴۱۰ھ/۱۹۸۹ء)

شیخ محمد اکرام (متولد ۱۹۰۸ء۔ متوفی جنوری ۱۹۷۳ء) سید احمد رائے بریلوی وشاہ اسمٰعیل دہلوی اور ان کے متبعین کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب وہ حج کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو انھیں وہابیوں کے عقائد سے باخبر ہونے کا موقعہ ملا۔ جو ان کے سفر حج سے چند سال پہلے مقاماتِ مقدسہ پر قابض تھے۔ حضرت سید صاحب اور وہابیوں کے مقاصد میں بہت اشتراک تھا اس لئے ان کے کئی ساتھی وہابی عقائد سے متاثر ہوآئے۔

مثلاً وہابی عقائد میں ایک اہم عقیدہ عدم وجوبِ تقلید شخصی کا ہے۔ اہل سنت مسلمان فقہ کے چاروں بڑے اماموں، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک، اور امام احمد بن حنبل میں سے کسی ایک کے پیرو اور ان کے طے کردہ مسائلِ فقہ میں سے کسی ایک کے مقلد ہوتے ہیں۔ لیکن وہابی اسے غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

اس مسئلے پر شاہ اسمٰعیل شہید نے سفر حج کے بعد اپنے آپ کو غیر مقلد ظاہر کیا۔ مولوی عبدالحی

(بڈھانوی) ان سے متفق نہ تھے۔اور سید صاحب کے عقائد کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔(ص ۶۱و۶۲۔موج کوثر از شیخ محمد اکرام۔ادبی دنیا، ضیا محل، دہلی ۶)

مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کی وفات کے بعد یہ اختلاف مسلک بہت نمایاں ہوگیا۔مولانا کے کئی معتقدوں کو نجدی اور یمنی راہنماؤں اور ان کے خیالات سے زیادہ واقفیت ہوئی۔اور انھوں ان کا اتباع کرلیا اور غیر مقلد یا اہل حدیث یا وہابی مشہور ہوئے۔لیکن مدرسۂ دیوبند کے بانیوں نے جن کا سلسلۂ فیض مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید تک پہنچتا تھا مسلکِ ولی اللّٰھی کی پیروی کی اور اپنے آپ کو حنفیوں سے علیحدہ نہ کیا۔(ص ۶۵۔موج کوثر از شیخ محمد اکرام)

''فکرِ ولی اللّٰھی'' اور دارالعلوم دیوبند کا ماضی کیا تھا اسے صحیح طور پر جاننے کے لئے مولانا عبیداللہ سندھی (متوفی ۱۹۴۴ء) شاگردِ خاص مولانا محمود حسن دیوبندی (متوفی نومبر ۱۹۲۰ء) کا ایک بیان نہایت معنی خیز ہے۔

دیوبند میں شاہ ولی اللہ کے متعلق صحیح رائے کا اندازہ مولانا سندھی کے اس قول سے کیجیے کہ ان کے زمانہ طالب علمی میں مولانا محمود حسن کو جب شاہ ولی اللہ یا شاہ عبدالعزیز کی رائے کسی مسئلہ میں بیان کرنی ہوتی تو وہ ان حضرات کا نام لینے سے پرہیز کرتے اور یہ کہتے کہ محققین کی اس مسئلہ میں یہ رائے ہے۔کیوں کہ:

> ''حضرت جانتے تھے کہ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی بات سننے کے لئے طلبہ تیار نہیں ہوں گے۔(شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ از مولانا عبیداللہ سندھی)

مولانا انظر شاہ کشمیری فرزند مولانا انور شاہ کشمیری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

> ''اکابر دیوبند جن کی ابتدا میرے خیال میں سیدنا الامام مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور فقیہ اکبر مولانا رشید احمد گنگوہی سے ہے۔''دیوبندیت'' کی ابتدا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے کرنے کے بجائے مذکورہ بالا دو عظیم انسانوں سے کرتا ہوں۔(ص ۴۸۔ماہنامہ البلاغ کراچی۔شمارہ ذوالحجہ ۱۳۸۸ھ/ مارچ ۱۹۶۹ء۔بقلم مولانا انظر شاہ کشمیری)

کتبِ شاہ ولی اللہ میں تحریف والحاق

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) و حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) و بعض دیگر اسلاف کرام کی کتب و رسائل میں حیرت انگیز طور پر تحریف والحاق بلکہ ان حضرات کے نام سے مستقل کتابیں لکھ کر شائع کیے جانے کی روایتیں اور تاریخی شہادتیں عام طور پر اہل علم و تحقیق کی تحریروں میں موجود ہیں۔

چنانچہ سید ظہیرالدین عرف سید احمد ولی اللّٰھی نواسۂ شاہ رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سلسلے میں حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (مقیم کراچی) نبیرۂ حکیم سید برکات احمد ٹونکی (متوفی ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء) لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب کی تیسری اہم خدمت یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے اسلاف کرام کی کتابیں شائع کیں بلکہ ایک مہم ان حضرات کے خلاف چلائی جو اپنے افکار و نظریات کی اشاعت کے لئے شاہ ولی اللہ اور ان کے اخلاف کا نام استعمال کررہے تھے۔اور ان بزرگوں کی طرف وہ کتابیں منسوب کررہے تھے جو درحقیقت ان کی نہیں تھیں یا ان کی کتابوں میں وہ اپنی طرف سے اضافات کررہے تھے۔مولوی صاحب نے پہلے ''تاویل الاحادیث'' کے خاتمے میں لکھا:

> ''آج کل بعض لوگوں نے بعض تصانیف کو اس خاندان کی طرف منسوب کردیا ہے اور درحقیقت وہ تصانیف اس خاندان میں سے کسی کی نہیں۔اور بعض لوگوں نے جو ان کی تصانیف میں اپنے عقیدے کے خلاف بات پائی تو اس پر حاشیہ جڑا اور موقعہ پایا تو عبارت کو تغیر تبدل کردیا۔
>
> تو میرے کہنے سے یہ غرض ہے کہ جو اَب تصانیف ان کی چھپیں تو اچھی طرح اطمینان کرلینا چاہیے جب خریدی جائیں۔''

اس کے بعد انفاس العارفین کے آخر میں ''التماس ضروری'' کے عنوان سے لکھا:

"فی زماننا، الدنیا زور و لایحصلها الا بالزور۔تو بعض حضرات نے کمر باندھی ہے اور دنیا کمانے کے واسطے حضرات موصوفین کی طرف اکثر کتابیں منسوب کر کے چھاپ دی ہیں جو کسی طرح ان حضرات کی کتابوں میں نہیں ہیں۔اور ارباب بصیرت ان کو پڑھ کر ان کے عیب اور مفاسد کو اس طرح جان لیتے ہیں جس طرح ایک تجربہ کار نقاد کھوٹے کو کسوٹی پر لگا کر پہچان لیتا ہے۔مگر مجوائے العوام کالانعام بیچارے اردو پڑھنے والے علم سے بے بہرہ لوگ اکثر ان جعلی اور مصنوعی رسائل کو پڑھ کر ضلالت اور گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں اس واسطے میرا فرض ہے کہ میں ان رسائل کے نام اس کاغذ کو تاہ میں لکھ دوں اور اپنے دین دار بھائیوں کو ارباب زمانہ کی گندم نما جو فروشی سے آگاہ کر دوں۔آگے اس پر عمل کرنا نہ کرنا ان کا فعل ہے۔

منت آنچہ حق بود گفتم تمام
تو دانی دگر بعد ازیں والسلام

اور جعلی اور مصنوعی رسائل یہ ہیں:

(۱) تحفۃ الموحدین مطبوعہ اکمل المطابع دہلی۔منسوب بہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب۔

(۲) بلاغ المبین مطبوعہ لاہور۔منسوب بہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب

(۳) تفسیر موضح القرآن مطبوعہ خادم الاسلام دہلی۔منسوب بہ طرف مولانا شاہ عبد القادر صاحب مرحوم۔

(۴) ملفوظات مطبوعہ میرٹھ۔منسوب بہ طرف حضرت مولانا شاہ عبد العزیز''

مولوی صاحب کی تصانیف (یادگار دہلی اور حالات عزیزی) کے علاوہ ان کے دو مضمون بھی قابل ذکر ہیں:

(۱) شاہ ولی اللہ پر ایک مضمون جو تاویل الاحادیث کے آخر میں شائع ہوا ہے اور کئی نئی

معلومات پر مشتمل ہے۔اس مضمون کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ القول الجلی مولوی صاحب کے مطالعہ میں تھی۔

(۲) شاہ اہل اللہ پر ایک مفصل مضمون جو تکملۂ ہندی کے آخر میں شائع ہوا تھا اور جو شاہ اہل اللہ پر ایک اولین اور معتبر ماخذ ہے۔

مولوی صاحب کی کتاب یادگار دہلی پر دہلی کے مشہور بزرگ اور مصنف خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی نے جو تقریظ لکھی وہ درج ذیل ہے:

''مولوی صاحب ممدوح ایک ذی علم اور لائق خاندان سے منسوب ہیں جس میں صدہا سال سے تصنیف و تالیف کا مشغلہ چلا آتا ہے......

آپ مولانا شاہ رفیع الدین کے نواسے اور شاہ عبد العزیز کے سچے جانشین ہیں اور بہ اعتبار علم و نسب شاہ صاحب کے خاندان میں آپ ہی باقی ہیں۔

آپ شاہ صاحب کی ایک لائق یادگار ہیں۔آپ نے شاہ صاحب کا نام روشن کر دیا ہے۔

شاہ ولی اللہ...... وغیرہ حضرات کی کتابوں کو جن کا ہم نام ہی سنا کرتے تھے، چھاپ کر آپ نے ہندوستان سے ایران، ایران سے عرب اور شام تک پھیلایا ہے۔'' (ص ۲۰۱ و ۲۰۲۔شاہ ولی اللہ اور ان کے اصحاب مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی۔مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵۔طبع دوم مارچ ۲۰۰۶ء)

اس سے پہلے بھی حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) نبیرۂ حکیم سید برکات احمد ٹونکی (متوفی ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء) تحریر فرما چکے ہیں کہ

''فتنۂ تاتار اور ''زوال ملک مستعصم'' سے ماقبل کے علما اور مصنفین کی کتابیں نایاب اور ناپید ہو گئیں تو ان کا سبب ظاہر تھا اور اسی سبب کے زوال کی بنا پر مابعد فتنہ کے علما و مصنفین میں سے بیش تر کی بیش تر کتابیں آج کہیں کہیں دستیاب ہیں۔

لیکن جو معاملہ شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کی تالیفات کے ساتھ ہوا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔کہا جا سکتا ہے کہ سقوط دہلی (۱۸۵۷ء) کے اثرات کو اس میں دخل ہو گا مگر یہ بات اس لئے قرین صحت نہیں ہے کہ ان حضرات کی تالیفات کی کم یابی، نایابی اور ان میں تحریفات کا سلسلہ تو

سقوط دہلی سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ ۱۸۳۴ء میں سید عبداللہ بن بہادر علی نے مطبع احمدی ہوگلی (بنگال) سے الفوز الکبیر شائع کی تو انھیں اس کتاب کا صرف ایک نسخہ ملا تھا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ سقوط دہلی سے ۲۳ سال پہلے ہی شاہ صاحب کی کتابیں کم یاب تھیں، کیوں کہ سید عبداللہ اس خانوادے کے نیاز مندوں میں سے تھے اور ان کے اکابر حلقہ سے مراسم تھے۔ مطبع احمدی بھی صرف اسی حلقے کی کتابوں کی اشاعت کے لئے قائم کیا تھا۔

شاہ صاحب کی کتابوں کی نایابی کا یہ عالم ہے کہ تقریباً ۱۲ رسائل و کتب ایسے ہیں جن کے صرف ناموں ہی کی حد تک دنیا ان سے واقف ہے۔ آج تک کم سے کم خاکسار کے علم میں ان کتابوں کا کوئی مخطوطہ نہیں ہے۔ (کتب نمبر ۱ سے ۷ تک کے نام مقالات طریقت میں ہیں۔ کتب نمبر ۸، نمبر ۹ کے نام مکتوب سید محمد نعمان (مکتوبات المعارف) میں ہیں۔ کتاب نمبر ۱۰ کا نام شاہ عبدالعزیز کی ایک تحریر (مجموعہ فتاویٰ) میں ہے۔ نمبر ۱۱ کا ذکر بھی فتاویٰ میں ہے۔ نمبر ۱۲ کا نام خود شاہ صاحب کی اپنی ایک سند عطا کردہ شیخ جار اللہ ہے)

(۱) فتح الودود فی معرفة الجنود (۲) شفاء القلوب (۳) عوارف (۴) نہایات الاصول (۵) الانوار المحمدیہ (۶) فتح السلام (۷) کشف الانوار (۸) اسرار فقہ (۹) منصور (۱۰) حاشیہ رسالہ لبس احمر (۱۱) دعاء الاعتصام (۱۲) النخبة فی سلسلة الصحبة۔

شاہ صاحب کے مصنفات کو نایاب کر کے دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ اپنے مصنفات کو شاہ صاحب کی طرف منسوب کر دیا اور اپنے نظریات کی تبلیغ شاہ صاحب کے نام سے کی گئی۔

(۱) البلاغ المبین، پہلی بار ۱۳۰۷ھ مطبع محمدی لاہور سے ایک اہل حدیث عالم مولانا فقیر اللہ نے شائع کی۔ (پروفیسر محمد ایوب قادری وصایا اربعہ)

(۲) تحفة الموحدین، سب سے پہلے ایک اہل حدیث بزرگ حاجی عبدالغفار دہلوی (علی جان والے) نے شائع کی۔ (حیات ولی طبع اول اکمل المطابع۔ صفحۂ آخر۔ ۱۹۰۱ء)

(۳) اشارۂ مستمرہ، پہلی بار مولوی فضل الرحمٰن استاذ جامعہ ملیہ دہلی نے ۱۹۳۶ء میں مکتبہ عربیہ قرول باغ دہلی سے شائع کیا تھا۔ (وصایا اربعہ، پروفیسر محمد ایوب قادری)

(۴) قول سدید کے نام سے بھی ایک رسالہ شاہ صاحب کے نام سے شائع ہوا ہے، جس میں عدم تقلید کی تلقین و تائید کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی اہل حدیث حضرات نے ہی شائع کیا

ہوگا۔ (وصایا اربعہ، پروفیسر محمد ایوب قادری)

مندرجہ رسائل میں اہل السنة والجماعة کے نظریات سے متضاد نظریات اور وہ متشددانہ افکار پیش کیے گئے ہیں جن کو یہ حضرات "تمسك بالكتاب و السنة" کا نام دیتے ہیں اور جو کتاب "التوحید" کی بازگشت ہیں۔ اس طرح شاہ صاحب سے احناف کو جن کی برصغیر میں اکثریت ہے بدظن اور دور کرنے کی کوشش کی گئی۔

ایک دوسرے فرقے ارباب تشیع نے ایک دوسرے پہلو سے یہی کوشش کی اور شاہ صاحب کی طرف دو ایسی کتابیں منسوب کیں جو ان کے تاریخی اور کلامی مسلک سے متناقض ہیں:

(۱) قرة العینین فی ابطال شہادة الحسنین (۲) جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ۔ مرزا علی لطف نے اپنے تذکرہ شعرائے گلشن ہند (مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند حیدر آباد دکن۔ ص ۲۴۔ ۱۹۰۶ء، مرتبہ مولانا شبلی نعمانی) میں ان دونوں کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ گلشن ہند ۱۸۰۱ء کی تالیف ہے۔ گویا شاہ صاحب کی وفات کے ٹھیک چالیس سال بعد ہی سے یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

مولوی محبوب علی دہلوی لکھتے ہیں: (تنبیہ الضالین۔ ص ۱۲۸) ''شاہ ولی اللہ پر رافضیوں نے تہمت اور بہتان کیا کہ اس نے رد شہادت حسین کا کیا ہے۔''

مکمل رسائل و کتب تصنیف کر کے شاہ صاحب کی طرف منسوب کر دینے کے علاوہ ایک ہلاکت خیز حرکت یہ کی گئی کہ شاہ صاحب کی تالیف میں جا و بے جا ترمیم و اضافہ و تحریف بھی کر دی گئی۔

(۱) تاویل الاحادیث کی تازہ اشاعت مرتبہ مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی شائع کردہ شاہ ولی اللہ اکاڈمی حیدر آباد ۱۹۶۷ء کے مقدمہ میں ایک عجیب اختلاف نسخ کی نشان دہی کی گئی ہے اور شق قمر کے سلسلہ میں شاہ صاحب کے منفردانہ نقطۂ نظر کے سلسلے میں یہ انکشاف ہوا ہے کہ شاہ صاحب نے وہ ایک دوسرے عالم کا قول نقل کیا ہے مگر عام متداول و مطبوعہ نسخے میں مقولہ رہ گیا اور قائل کا نام حذف ہو گیا۔ کیا یہ بدنام اور نشانۂ اعتراض بنانے کی سازش نہیں ہو سکتی؟

(۲) ہمعات، حیدر آباد سندھ سے ۱۹۶۴ء میں طبع ہوئی ہے۔ اس کے حواشی کے اختلاف نسخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس رسالے کے مطبوعہ و مخطوطہ نسخوں میں نمایاں اختلاف ہیں۔

(۳) عقد الجید کا اردو ترجمہ مولانا محمد احسن نانوتوی نے ''سلک مروارید'' کے نام سے

۱۳۰۹ھ میں شائع کیا تھا۔ اس رسالے کے آخری اوراق میں ایک جگہ فتح القدیر کا اقتباس ہے۔ اس پر حاشیے میں مولانا محمد احسن لکھتے ہیں:

"قلمی نسخے میں انجام اس رسالے کا اس نقطہ پر ہے۔ فتح القدیر کی عبارت آخر کتاب تک اس (نسخ) میں نہیں ہے۔ معلوم نہیں خود مؤلف نے بعد کو بڑھائی یا کسی اور نے؟" (ص ۸۹۔ سلکِ مروارید ترجمہ عقد الجید)

یہی معاملہ شاہ صاحب کے اخلاف کرام کی تالیفات کے ساتھ کیا گیا۔ شاہ عبدالعزیز کا "تحفہ اثنا عشریہ" شائع ہونے کے بعد ایک صاحب نے لکھنؤ سے انھیں خط لکھا جس میں تحفہ کے بعض ایسے الفاظ و عبارات کا حوالہ دیا جو شاہ صاحب نے لکھے ہی نہیں تھے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز نے اس خط کے جواب میں تحریر فرمایا:

"تعریضات در باب معاویہ رضی اللہ عنہ از فقیر واقع نہ شدہ۔ اگر در نسخۂ از تحفۂ اثنا عشریہ یافتہ شود الحاق کسے خواہد بود کہ بنا بر فتنہ انگیزی و کید و مکر کہ بنا مذہب ایشاں یعنی گروہ رفضہ از قدیم برہمیں امور است ایں کار کردہ باشد۔ چنانچہ بسمع فقیر رسیدہ کہ الحاق شروع کردہ اند۔" (فضائل صحابہ و اہل بیت (مع مقدمہ پروفیسر محمد ایوب قادری) طبع لاہور)

"اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر چوٹیں میں نے نہیں کیں۔ اگر تحفۂ اثنا عشریہ کے کسی نسخہ میں ایسی عبارتیں ہیں تو وہ کسی نے اپنی طرف سے بڑھادی ہوں گی کیوں کہ روافض کے مذہب کی بنیاد شروع ہی سے فتنہ انگیزی اور مکر و کید پر ہے۔ یہ کام بھی انھوں نے ہی کیا ہوگا۔ چنانچہ میں نے سنا ہے کہ تحفہ میں بھی انھوں نے الحاق شروع کر دیا ہے (جس کا ثبوت آپ کا یہ خط بھی ہے)"

(۲) مولوی سید احمد ولی اللٰہی نے شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات مطبوعہ میرٹھ کو جعلی بتایا ہے (انفاس العارفین صفحہ آخر)

ہماری ناقص رائے میں مولوی سید احمد کی یہ رائے کلیۃً تو صحیح نہیں ہے، ملفوظات شاہ صاحب کے ہی ہیں مگر ان میں الحاق ضرور ہوا ہے اور بعض فحش اشعار اور فحش واقعات درج

کر دیے گئے ہیں۔ (ملفوظات پر ہمارا مضمون (شاہ ولی اللہ کے حالات شاہ عبدالعزیز کی زبانی) ملاحظہ ہو۔

(۳) تفسیر فتح العزیز کے متعلق بعض حضرات کی رائے ہے کہ یہ تفسیر مکمل ہے۔ مقالات طریقت (ص ۳۰ و ۳۳) میں اس سلسلے میں دو روایتیں تحریر کی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ مولوی یار محمد صاحب نے آپ کے درس قرآن کے کئی دوروں پر اپنے مصحف پر حواشی لکھ لیے تھے۔ وہ ان کے فرزند مولوی محمد اسحٰق صاحب کے پاس موجود ہیں۔ دوسری روایت "حاجی محمد حسین صاحب سہارن پوری سلمہ تعالیٰ، مولوی نور اللہ صاحب سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی ایک تفسیر فارسی تمام قرآن مجید کی اکبرآباد کے قاضی کے یہاں موجود ہے مگر وہ چھپی نہیں۔" (ص ۳۰، ۳۳)

(۴) حال ہی میں کتب خانہ رام پور سے موسیقی پر ایک مخطوطہ برآمد ہوا ہے۔ کتاب کا نام ہے "سانکیت شاستر"— مصنف ہیں "شاہ عبدالعزیز دہلوی"۔ مخطوطہ کے کاتب اور واحد راوی ہیں ایک ہندو منشی کندن لال اشکی! جناب عضدالدین خاں صاحب نے معارف اعظم گڑھ (جلد ۳، شمارہ ۹۶۔ ستمبر ۱۹۶۵ء) میں اس مخطوطہ کا تعارف کرایا ہے اور اس مخطوطہ کی نسبت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی طرف تسلیم کر لی ہے۔ مگر ہماری عقیدت نے ابھی تک یہ انتساب گوارا نہیں کیا۔

شاہ ولی اللہ کے دوسرے فرزند شاہ رفیع الدین نے اردو، فارسی اور عربی میں متعدد رسائل و کتب تالیف فرمائیں۔ مگر ان میں سے متعدد ابھی تک مخطوط صورت میں برصغیر کے صرف دو ایک کتاب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ کئی رسائل و کتب کا نام کے سوا کوئی نشان نہیں ملتا۔

تحریف کا نشانہ بھی شاہ صاحب کی تالیفات ہوئیں۔ شاہ صاحب کا اردو ترجمۂ قرآن کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ قرآن مجید کا مکمل ترجمہ ہے۔ مگر عبدالرحیم ضیا کا بیان ہے کہ:

ترجمہ قرآن تحت لفظی بعض کہتے ہیں کہ آپ نے شروع کیا تھا مگر ناتمام رہا دوسروں نے تمام کرکے آپ کے نام سے شہرت دی۔ (مقالات طریقت۔ ص ۱۸)

شاہ رفیع الدین صاحب نے فارسی میں ایک رسالہ تنبیہ الغافلین کے نام سے لکھا تھا۔

ایک نومسلم منشی بنی نارائن جہاں لاہوری نے اس رسالے کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ سید عبداللہ بن بہادر علی (صاحب مطبع احمدی ہوگلی) کا بیان ہے کہ یہ ترجمہ بے محاورہ تھا اور ترجمہ آیات کلام اللہ بھی غلط تھا، لیکن خود سید عبداللہ نے جو ترجمہ ۱۸۳۰ء میں کیا تھا اس کے لئے خود ان کا بیان ہے کہ اس میں آیات واحادیث قصص کا اضافہ کیا ہے۔ اس سے پہلے یہ رسالہ کسی صاحب نے اپنے نام سے شائع کر دیا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ تنبیہ الغافلین کے تالیفِ شاہ رفیع الدین ہونے کا علم ہی دنیا کو صرف منشی جہاں لاہوری کے حوالے سے ہے۔ (تنبیہ الغافلین کے سلسلے میں تمام تفصیل مولانا عبدالحلیم چشتی کے ایک محققانہ مقالہ سے ماخوذ ہے۔ ماہنامہ بینات کراچی۔ رمضان ۱۳۸۳ھ)

شاہ ولی اللہ کے تیسرے فرزند شاہ عبدالقادر کے ایک اردو رسالے تقریر الصلوٰۃ کا مولوی سید عبدالحی نے ذکر کیا ہے مگر اس رسالہ کا وجود تو درکنار اس کا نام بھی مولوی عبدالحی کے سوا کسی اور نے نہیں کیا۔ (الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند۔ طبع بیروت۔ ص ۱۱۸)

شاہ صاحب نے قرآن کریم کا جو اردو ترجمہ کیا تھا، اس کا سب سے پہلا ایڈیشن سید عبداللہ نے مطبع احمدی ہوگلی سے ۱۸۳۸ء میں شائع کیا تھا مگر یہ ترجمہ موضح القرآن کے نام سے اور اضافات کے ساتھ ۷۔۱۳۰۸ھ میں دہلی سے شائع کیا گیا۔ مشہور اہل حدیث عالم میاں نذیر حسین دہلوی کے داماد سید شاہ جہاں نے اس پر تقریظ لکھی تھی اور اس کے ملنے کا پتہ بھی ”مدرسہ میاں نذیر حسین“ تھا۔

مولوی سید احمد ولی اللٰہی نے انفاس العارفین کے صفحہ آخر پر جن جعلی کتابوں کی نشان دہی کی تھی ان میں تحفۃ الموحدین، البلاغ المبین وغیرہ کے ساتھ ”تفسیر موضح القرآن مطبوعہ خادم الاسلام دہلی منسوب بہ طرف مولانا شاہ عبدالقادر صاحب مرحوم“ بھی تھی۔

مجلّہ نقوش لاہور (اپریل ۱۹۵۶ء) میں ایک احمدی قلم کار شیخ اسمٰعیل پانی پتی نے موضح القرآن کا مقدمہ شائع کیا تھا۔ یہ مقدمہ عام متداول مقدمے سے سراسر مختلف ہے۔ پانی پتی صاحب کا بیان ہے کہ یہ مقدمہ انھیں حکیم نورالدین بھیروی (قادیانی) کے کتب خانے سے دستیاب ہوا ہے۔ یاد رکھیے کہ آں جہانی حکیم پہلے اہل حدیث تھا پھر احمدی اور خلیفۃ المسیح ہوگیا تھا۔ اللہ اللہ!

کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

شاہ ولی اللہ کے ابنا ہی نہیں احفاد بھی تحریف وترمیم اور غلط انتساب کا ہدف بنے۔ شاہ صاحب کے حفید شہیر شاہ اسمٰعیل کی طرف ایک کتاب ”تنوير العينين فى رفع اليدين“ منسوب ہے۔ مولوی کریم اللہ کا بیان (تنبیہ الضالین ص ۸۲) ہے کہ ایک رسالہ تنویر العینین بعضے آدمیوں نے ان کی شہادت کے بعد ان کا کر کے شائع کیا۔

شاہ اسمٰعیل کی مشہور کتاب تقویت الایمان کے متعلق سید احمد شہید کے خلیفہ پیر مرتضٰی خاں رام پوری نے دافع الفساد ونافع العباد (مطبوعہ مطبع محمدی ٹونک۔ ص ۹۶ و ۱۱۴) میں لکھا ہے کہ اس میں تحریف کی گئی ہے۔ (الیانع الجنی۔ ص ۷۶)

شاہ اسمٰعیل صاحب کا رسالہ منصب امامت ناقص الآخر ہے۔ یہی حال ايضاح الحق الصريح فى احكام الميت و الضريح کا ہے۔ وہ بھی ناتمام ہے۔

شاہ عبدالعزیز کے نواسے اور جانشین شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی کی طرف دو کتابیں منسوب ہیں، مسائل اربعین اور مأۃ مسائل۔ ہم نے اپنی کتاب ”حیات شاہ محمد اسحٰق“ میں بدلائل ثابت کیا ہے کہ ان دونوں کتابوں کی نسبت شاہ صاحب کی طرف صحیح نہیں ہے۔ شاہ صاحب کے ترجمۂ مشکوٰۃ (مظاہر حق) کے متعلق نواب قطب الدین خاں دہلوی نے لکھا ہے کہ ”..........کاتبوں سے اس کی صحت میں فرق آنے لگا تھا۔“ (مظاہر حق۔ ص ۳)

آیۂ کریمہ ”ما اهل به لغير الله“ (سورہ بقرہ آیت ۱۷۳) کا جو ترجمہ وتفسیر فتح العزیز کے مطبوعہ نسخوں میں ملتا ہے اس کے متعلق شاہ صاحب کے معروف شاگرد شاہ رؤف احمد نقشبندی نے اپنی کتاب تفسیر رؤفی میں لکھا ہے کہ تفسیر فتح العزیز میں کسی عدو نے الحاق کر دیا ہے۔ اور یوں لکھا ہے:

> ”اگر کسی بکری کو غیر کے نام منسوب کیا ہو اور بسم اللّٰہ، اللّٰہ اکبر کہہ کر ذبح کرے، وہ حلال نہیں ہوتی اور غیر کے نام کی تاثیر اس میں ایسی ہوگئی ہے کہ اللہ کے نام کا اثر ذبح کے وقت حلال کرنے کے واسطے بالکل نہیں ہوتا۔“

یہ بات کسی نے ملا دی ہے۔ (ص ۱۳۹۔ تفسیر رؤفی، جلد اول مطبع فتح الکریم بمبئی ۱۸۸۷ء)

(ص ۲۳ تا ۲۹۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے اصحاب۔ مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی۔ مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ ۲۰۰۶ء)

حضرت شاہ ولی اللہ کی کئی کتابوں کے طابع وناشر سید ظہیر الدین معروف بہ سید احمد نواسۂ حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی فرزند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں۔

''بعد حمد وصلوٰۃ کے بندہ ظہیر الدین عرف سید احمد اول عرض کرتا ہے بیچ خدمت شائقین تصانیف حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ومولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہما وغیرہ کہ آج کل بعض لوگوں نے بعض تصانیف اس خاندان کی طرف منسوب کر دیا ہے اور در حقیقت وہ تصانیف اس خاندان میں سے کسی کی نہیں۔ اور بعض لوگوں نے جو ان کی تصانیف میں اپنے عقیدہ کے خلاف بات پائی تو اس پر حاشیہ جڑا اور موقعہ پایا تو عبارت کو تغیر وتبدل کر ڈالا۔ (خاتمہ تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء مطبوعہ احمدی کلاں محل دہلی)

قاری عبدالرحمٰن پانی پتی (متوفی ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء) لکھتے ہیں:

اور ایسا ہی ایک جعل کرتے ہیں کہ سوال کسی مسئلہ کا بنا کر اور اس کا جواب موافق اپنے مطلب کے لکھ کر علماء سابقین کے نام سے چھپواتے ہیں۔ (ص ۹۔ کشف الحجاب۔ مطبع بہار کشمیر ۱۲۹۸ھ)

مولانا وکیل احمد سکندر پوری ثم حیدر آبادی (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) البلاغ المبین کے بارے میں لکھتے ہیں:

یہ کتاب کسی وہابی کی تصنیف ہے جسے کافی لیاقت نہ تھی مگر اعتبار واستناد کے لئے مولانا شاہ ولی اللہ کی طرف منسوب کی گئی۔ (ص ۲۳۔ وسیلۂ جلیلہ۔ مطبع یوسفی لکھنؤ)

غیر مقلد عالم غلام رسول مہر (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) لکھتے ہیں:

البلاغ المبین تو یقیناً شاہ ولی اللہ کی کتاب نہیں۔ اس کا اسلوب تحریر وطریق ترتیب مطالب شاہ صاحب کی تمام تصانیف سے متفاوت ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ابتدائی دور کی تصنیف ہوگی۔ (مکتوب غلام رسول مہر بنام پروفیسر محمد ایوب قادری۔ محررہ ۲۸ر فروری ۱۹۶۴ء۔ مقدمہ وصایا اربعہ از محمد ایوب قادری مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد)

مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے بھانجے مولوی محمد علی کاندھلوی لکھتے ہیں:

میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب میں سنتا ہوں کہ لوگ غیر مقلدیت کو پروان چڑھانے کے لئے حضرت شاہ صاحب کی کتابوں سے ادھوری اور تراشیدہ عبارتیں نقل کر کے بیچارے عوام کو دھوکہ دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ''قولِ سدید'' کے نام سے ایک من گڑھت کتاب کو شاہ صاحب کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ (ص ۵۳۔ شاہ ولی اللہ اور تقلید، مطبوعہ سیالکوٹ پنجاب)

نقشبندی مجددی عالم شاہ ابوالحسن زید فاروقی دہلوی (متوفی ۱۹۹۳ء) لکھتے:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں کئی جگہ اس فعل قبیح (تحریف والحاق) کی برائی بیان فرمائی ہے۔ افسوس ہے مولوی اسمٰعیل کے پیروان اس کام میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبدالعزیز کی تحریرات، مکتوبات، حضرت شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن اور ان کی کتابیں، حضرت مجدد الف ثانی، ان کی اولاد، حضرت شاہ غلام علی، حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلوی، اور دیگر اکابر کے احوال میں بہت ہی تحریفات کر کے محمد بن عبدالوہاب نجدی اور مولوی اسمٰعیل دہلوی کا ہمنوا سب کو قرار دیا ہے۔ (القول الجلی کا مقدمہ اور اختتامیہ از شاہ ابوالحسن زید۔ مطبوعہ شاہ ابوالخیر اکیڈمی، چتلی قبر، دہلی ۶۔ ۱۴۱۰ھ/۱۹۸۹ء)

ہندوستان! دار الاسلام یا دار الحرب؟

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) کی سیاسی بصیرت اور آپ کے سیاسی مکتوبات وغیرہ کے تعلق سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کا بھی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی کہ دیگر معاصر علما و مشائخ کی جانب بھی خاطر خواہ توجہ دی جائے۔

یہاں میں ایک حقیقت کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر زیر نظر تحریر کے ساتھ ہر موقعہ اور ہر موڑ پہ قارئین کرام ذہن نشین رکھیں کہ یہ سارے علما و مشائخ کرام بنیادی طور پر دینی و علمی و فکری شخصیات ہیں اور ان کے ہر قول و عمل کا مرکز و محور محض دین اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی خیر خواہی ہے جس سے الگ ہٹ کر اس دور کی عملی سیاست سے ان حضرات کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ نہ یہ حضرات کسی جاہ و منصب اور دولت و شہرت کے طلب گار تھے۔

ہاں نصاریٰ و سکھ و مرہٹہ کے مظالم سے چوں کہ خلقِ خدا عاجز تھی اس لئے ان حضرات نے بھی ان کی طرف اپنی کچھ توجہ مبذول کی اور اپنی دینی و شرعی ذمہ داری پوری کی۔ اس لئے ان حضرات کے بیان کردہ احکام اور جملہ اقوال و ارشادات کو اسی پس منظر میں دیکھنا سننا سمجھنا چاہیے اور اسی کی روشنی میں ان حضرات کی ہر فکری و عملی سرگرمی کا تجزیہ بھی کرنا چاہیے۔

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں نقش بندی مجددی دہلوی (متوفی ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) کو دہلی و مضافاتِ دہلی اور ملک کے حالات سے کتنی تشویش تھی اور مرہٹہ سکھ وغیرہ کی یورشوں سے وہ کتنے رنجیدہ خاطر تھے اس کا اندازہ ان کے مکتوبات سے ہوتا ہے۔ یہاں اختصار کے ساتھ چند نمونے پیش کیے جا رہے ہیں۔

قاضی ثناء اللہ مجددی پانی پتی (متوفی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) کے نام تحریر فرماتے ہیں۔

اور شہر کے لوگوں کو کافر سکھوں کے فتنہ کی وجہ سے بے حد فکر و تردد لاحق ہے۔ خدا تعالیٰ کافروں پر اپنا قہر و غضب نازل فرمائے اور مسلمانوں کو کامیابی عطا کرے۔ آپ سے ملاقات کا جو اشتیاق ہے وہ ضبطِ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا ہے۔ راستہ کے خطرے کو گذر جانے کے بعد حسب وعدہ دہلی کا قصد کرنا چاہیے۔ اور یہ فقیر بھی پانی پت کی سیاحت کے لئے ہمیشہ ارادہ رکھتا ہے۔ خدا تعالیٰ راس لائے۔ الخ (ص ۷۔ مکاتیب مرزا مظہر جانِ جاناں۔ تدوین عبدالرزاق قریشی۔ اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد عمر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ مطبوعہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ۔ ۱۹۹۵ء)

ان دنوں سکھوں کے بارے میں وحشت انگیز خبروں سے شہر میں عجیب قسم کی ایک گھبراہٹ پھیلی ہوئی ہے۔ فقیر اختلاجِ قلب کا مریض ہے۔ اور میری اہلیہ جنون کی مریضہ ہیں۔ پچھلے ہنگاموں کی وجہ سے دل متفکر اور شہر میں کوئی حاکم نہیں ہے۔ اور اگلے غارت گروں کے مقابلے میں یہ کافر کہیں زیادہ اذیت رساں ہیں۔ (ص ۸۔ مکاتیب مرزا مظہر جان جاناں)

مقدمہ کے بارے میں نجیب الدولہ کی طرف سے پروانہ دوبارہ خط کے ساتھ بھیجا جاتا ہے۔...... اصلیت محض اتنی ہے کہ نجیب الدولہ نے حاجی یٰسین صاحب، میر صدر جہاں، اور آپ کے چچا شاہ محمد رضا کے نام ایک ایک روپیہ کا پروانہ کرور نامی مقام سے لکھ کر حکیم محمد شریف خاں صاحب کی معرفت بھیجے تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے وہ پروانے قبول کر لیے۔ شاہ محمد رضا نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ فقیر کے لئے چالیس روپے تجویز ہوئے تھے لیکن حکیم صاحب مذکور نے انھیں اس بات سے روک دیا۔ حکیم صاحب کی زبانی صرف اتنی سی بات معلوم ہوئی ہے۔ ان دنوں فقیر بذاتِ خود سنبھل میں مقیم تھا۔ اور واپسی کے بعد میرے کان میں یہ بات پڑی۔ (ص ۹۔ مکاتیب مرزا مظہر جان جاناں)

سکھوں کے فتنے کی طرف سے بہت فکر لاحق ہے۔ خدا تعالیٰ ان کافروں پر قہر نازل کرے اور لشکر اسلام کو نصرت عطا کرے اور مسلمانوں کے تمام شہروں کو محفوظ رکھے۔ اور دوستوں سے ملاقاتوں کے لئے مواقع فراہم کرے۔ (ص ۱۰۔ مکاتیب مرزا مظہر جانا جاناں)

اور ان شاء اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کے بعد کافروں (سکھوں) کی شورش جب ختم ہو جائے گی اس وقت دہلی کے لئے واپسی کا مصمم ارادہ ہے۔ خدا راس لائے۔ اور سکھوں کے

مقابلے میں نجیب الدولہ کی فتح یابی اور کافروں کے ہاتھوں پانی پت کا محفوظ رہنا مقام شکر ہے۔ (ص۱۱۔ مکاتیب مرزا مظہر جان جاناں)

کل ماہ محرم کی ۱۸ تاریخ تھی۔ نجیب آباد سے پانی پت صحیح و سالم اور دولت مند ہو کر آپ کی واپسی اور خیر و عافیت کی خوش خبری پر مشتمل آپ کا خط یہاں پہنچا..... اگر ماہ صفر کے آخر تک یہ رکاوٹیں دور ہو جائیں اور برسات بھی شروع ہو جائے اور سکھ واپس چھاؤنیوں میں چلے جائیں تو اس وقت فقیر کا جانا ممکن ہے۔ (ص۱۲۔ مکاتیب مرزا مظہر جان جاناں)

بہت دنوں سے آپ کے حالات معلوم نہیں ہوئے۔ مگر یار علی خاں جیو کی زبانی مجملاً آپ کی خیریت معلوم ہوئی جو نجیب الدولہ کے ساتھ آئے تھے جو اپنے بیٹے کی شادی کی تقریب میں اس علاقے میں آئے تھے۔ (ص۱۳۔ مکاتیب مرزا مظہر جان جاناں)

اور اس زمانے میں نواب (نجیب الدولہ) موصوف اس فقیر سے بہت زیادہ خوش گمانی رکھتے ہیں اور اس بات کی آرزو رکھتے ہیں کہ میں ان کے علاقے میں سکونت اختیار کروں۔ اور اس بارے میں انھوں نے خطوط لکھے اور سنبھل میں بذات خود انھوں نے مجھ سے یہ بات کہی تھی۔ (ص۱۴۔ مکاتیب مرزا مظہر جان جاناں)

رمضان سے پہلے فقیر کا پانی پت آنا آسان معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے بعد کہوں اور سنوں گا۔ اور شاہ ابدالی کے حالات معلوم ہوئے۔ (ص۱۵۔ مکاتیب مرزا مظہر جاناں)

شجاع الدولہ صلح میں اپنی بہتری دیکھ کر کسی دوسرے کے توسط کے بغیر عالی گہر کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اور ملہار جو شکست کھا کر کالپی چلا گیا تھا واپس نہ لوٹا۔ اور عماد الملک اپنی جان بچا کر فرخ آباد چلا گیا۔ اور روہیلہ سردار اس کا ساتھ دینے پر رضامند نہ ہوئے۔ اور شاہ درانی اٹک تک پہنچ گیا۔ سکھوں کے شر سے خدا محفوظ رکھے۔ (ص۱۹۔ مکاتیب مرزا مظہر جان جاناں)

یہاں صورت حال یہ ہے کہ اس ماہ (صفر) کی بیسویں تاریخ بروز چہار شنبہ جمنا ندی کے اس پار سے اچانک مرہٹہ فوج نمودار ہوئی اور دوسرے دن تڑکے بروز پنج شنبہ سیف الدین خاں کشمیری بادشاہ کی صادر کردہ سند دکھا کر بلا مزاحمت شہر میں داخل ہوا۔ اس نے امان کی منادی کرادی اور کسی شخص کو کوئی ضرر نہ پہنچا۔ الحمد للہ علیٰ ذلك۔

قلعہ دار اور ناظر دو تین دن تک قلعہ کے اندر بند رہے اور سخت گولہ باری کی وجہ سے قلعہ کا

برج منہدم ہو گیا۔ بدرجۂ مجبوری معاہدہ کے بعد قلعہ (انھوں نے) اس کے حوالے کر دیا۔ لیکن سیف الدین خاں بھی قلعہ پر قابض نہیں ہے۔ قاصد بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔

وہ لوگ وہ رقم مانگتے ہیں جو بادشاہ نے روہیلوں کے قبضے سے دہلی کو آزاد کرانے کے عوض مرہٹوں کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔ دیکھنا چاہیے کہ کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اس معاملے میں عماد الملک کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ وہ جا کر جے نگر میں بیٹھ گیا ہے۔ زیادہ لکھنا فضول ہے۔

مرہٹہ بڑے اشتیاق سے شہر (دہلی) دیکھنے آتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں۔ پابندی لگا دی گئی ہے کہ وہ لوگ شہر میں داخل نہ ہوں۔ غلہ گراں ہو گیا تھا اب ارزاں ہو گیا ہے۔ دوسرے مرہٹہ سردار تکوجیو کو فریب دے کر یلغار کر کے دہلی آ پہنچے۔ کیوں کہ اس کی ضابطہ خاں کے ساتھ دوستی تھی۔ اس بات کی خبر پانے کے بعد اپنے معاہدہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ بے چارہ ضابطہ خاں کو اپنے ساتھ لے کر خیریت سے سکرتال پہنچا کر واپس لوٹ پڑا۔ کیوں کہ اس کی فوج بد دل تھی۔ لیکن وہ ابھی تک یہاں نہیں پہنچا ہے۔ شہزادہ غازی آباد تک آ گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ کافر لوگ ضابطہ خاں کو ایک مقررہ رقم دے کر اس سے معاملہ کر لیں گے۔ اور یہ بات قرائن کی رُو سے دور ہے۔ گمانِ غالب ہے کہ تمام روہیلے متحد ہو کر جنگ کریں گے۔ خدا خیر کرے۔ (ص۳۴و۳۵۔ مکاتیب مرزا مظہر جان جاناں)

حضرت مرزا مظہر جان جاناں نقش بندی مجددی دہلوی کے اس مجموعۂ مکاتیب میں کل ایک سو سینتالیس (۱۴۷) مکاتیب ہیں جن میں سے ایک سو تیس مکاتیب حضرت قاضی ثناء اللہ مجددی پانی پتی کے نام مرقوم ہیں۔ یہ مکاتیب نجی اور ذاتی قسم کے ہیں۔ ضمناً اس وقت کے سیاسی حالات بھی سپرد قلم ہو گئے جن کا تجزیہ کیا جائے اور آپ کی تحریرات و ملفوظات وغیرہ کی مزید تحقیق کی جائے تو بہت سے اہم امور و معاملات پر اچھی خاصی روشنی پڑ سکتی ہے۔ اور کئی ایک نئے تاریخی گوشے واضح ہو سکتے ہیں۔

اسی دور کے عظیم المرتبت بزرگ حضرت سید شاہ حمزہ قادری مارہروی (متوفی ۱۱۹۸ھ/ ۱۷۸۴ء) بھی روہیلہ اور نجیب الدولہ کی خاموش اور مؤثر سرپرستی فرما رہے تھے۔ چنانچہ مشہور مؤرخ حکیم نجم الغنی خاں رام پوری تحریر کرتے ہیں۔

نے ''فصل الکلام'' میں بیان کیا ہے۔
شاہ حمزہ صاحب مقیم مارہرہ خلف شاہ آل احمد بن شاہ برکت اللہ
اس وقت دتا سندھیا اور جھنکو نے اس فقیر کو بھی عرائض بھیجے اور ان میں لکھا کہ نواب سید
عبداللہ خاں بن نواب سید علی محمد خاں آپ کی سرکار سے عقیدت اور ارادت رکھتے ہیں اور وہ نجیب
خاں کی مدد کو نہیں گئے ہیں۔ کیوں کہ ان کو اپنے باپ کے ملک کا دعویٰ ہے۔ نجیب خاں وغیرہ
سرداروں نے ان کے ملک پر قبض و تصرف کرلیا ہے۔ ہم ان کو دو لاکھ روپے دیتے ہیں۔ یہ روپے
وہ اٹاوہ کے سرکاری خزانہ سے جہاں مرہٹوں کی حکومت ہے، وصول کر کے فوج مرہٹہ جس کا سردار
گووند مرہٹہ ہے اپنے ہمراہ لے کر روہیلوں کے مقامات کو تاخت و تاراج کریں۔ ادھر سے ہم گھیر
کر سب کو تہِ تیغ کرڈالیں گے۔ یا گرفتار کرلیں گے۔ پھر آدھا ملک ہمارا ہے اور آدھا اُن کا۔
اور ان خریطوں میں بیل بھنڈار کی قسم بھی یاد کی تھی چوں کہ اس فقیر کے نزدیک ان ہندوؤں
کی مدد کرنا بہت بڑا جرم ہے اس لئے جواب لیت و لعل کے ساتھ دے کر ٹال دیا۔ اور نواب سید
عبداللہ خاں سے بھی جواب لکھ کر بھجوادیا۔ نواب موصوف تو مرہٹوں کے اس مشورے سے رضا
مند تھے لیکن فقیر نے ان کو سمجھا کر اس ارادے سے روک لیا۔
اسی طرح اس فقیر کی معرفت نواب احمد خاں بنگش کو بھی پیغام بھیجے تھے۔ فقیر نے بھی تغافل
میں ڈال دیا۔ قصہ طویل طویل ہے۔ (ص ۳۰۹۔ جلد اول اخبار الصنادید۔ مرتبہ حکیم نجم الغنی خاں
رام پوری۔ طبع جدید رضا لائبریری رام پور، یوپی۔ ۱۹۹۷ء)

کچھ علما و مشائخ کرام کے خیالات و فتاویٰ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا محمد فیصل ندوی بھٹکلی کی کتاب ''تحریک آزادی میں علما کا کردار'' پر رقم کردہ اپنی تحقیقی تقریظ میں مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ ولی اللہ کے نامور معاصرین میں سے حضرت مرزا مظہر جان جاناں ان خیالات و نظریات میں حضرت شاہ صاحب کے قریب نظر آتے ہیں۔ اگرچہ حضرت مرزا صاحب کی رائے کا بہت کھل کر اظہار نہیں ہوا لیکن مرزا صاحب کے کلام میں اس کے اثرات جھلکتے ہیں۔ اور جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ شیعوں اور مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی قوت اور ان کے اقتدار کو اس ملک کے عمومی معاشرتی نظام اور خصوصاً اسلام اور مسلمانوں کے لئے خطرہ سمجھتے تھے، یہی رائے حضرت مرزا صاحب کی معلوم ہوتی ہے۔ اور جس طرح حضرت شاہ ولی

اللہ کو اپنے خیالات و فکر کا پرتو نجیب الدولہ میں نظر آتا تھا اور وہ ان کو ایک بڑا مدبر اور دوراندیش مانتے تھے، یہی کیفیت حضرت مرزا صاحب کی معلوم ہوتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے روابط و مراسم میں روہیلوں کا ایک مقام تھا، بالکل اسی طرح حضرت مرزا صاحب کے معتمد اور خانقاہ مظہریہ کے بنیادی کارکن روہیلہ رہتے تھے۔ اور جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ کی نیابت حضرت شاہ عبدالعزیز نے فرمائی، اسی طرح مرزا صاحب کے علمی و عملی جانشین حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی تھے۔

حضرت قاضی صاحب نے بھی اسی راہ میں قدم اٹھایا جس پر شاہ عبدالعزیز گامزن ہوئے تھے۔ اور جس طرح شاہ عبدالعزیز نے دہلی پر انگریزوں کے قبضے کے بعد ہندوستان کو دار الحرب قرار دینے میں کچھ تأمل نہیں کیا، اسی طرح حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب نے بھی اس ملک کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ صادر فرمادیا۔ اور اگرچہ حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت مرزا صاحب کی طرح حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت قاضی صاحب کو نہایت سخت حالات سے مقابلہ کرنا پڑا۔ جس طرح شاہ عبدالعزیز کو طرح طرح کی سازشوں اور منصوبوں کا شکار بنانے کی کوشش کی گئی، اسی طرح حضرت قاضی صاحب بھی غیر متوقع سخت حالات نیز سکھوں، شیعوں اور جاٹوں کے نشانہ پر رہے۔ لیکن جس طرح ان حوادث کی وجہ سے حضرت شاہ ولی اللہ اور مرزا صاحب کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی تھی، اسی طرح حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت قاضی صاحب کے قدموں میں بھی جنبش نہیں ہوئی۔ جس طرح وہ اپنی بات پر راسخ تھے، یہ بھی اپنے نظریات پر ثابت رہے۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے دار الحرب ہونے کا برملا فتویٰ دینے میں حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب کو اولیت حاصل ہے۔ ہر چند کہ شہرۂ عام حضرت شاہ (عبدالعزیز) صاحب کے فتویٰ کو حاصل رہا اور ان دونوں اکابر علما کے علاوہ بھی متعدد بڑے علما نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کی وضاحت و صراحت فرمائی اور اس کو پوری قوت کے ساتھ اس طرح آشکارا کیا کہ کسی کو مجال گفتگو نہیں رہی۔

حضرت قاضی صاحب نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے اور اس کے متعلق مسائل پر متعدد فتاویٰ جاری کیے۔ قاضی صاحب کا اس موضوع پر ایک مختصر مگر جامع فتویٰ جس میں اس خطہ کے دارالحرب ہونے کے حکم کے علاوہ یہاں کے چند مالی مسائل پر بھی حکم صادر کیا ہے۔ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔ (یہ فتویٰ غالباً مفتی الٰہی بخش صاحب کے سوال کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ یہ اصل فتویٰ جو قاضی صاحب کے قلم سے ہے اور اس پر قاضی صاحب کی مہر بھی ثبت ہے۔ ہمارے ذاتی ذخیرے میں موجود ہے)

نیز قاضی صاحب نے اس مبحث پر اور بھی کئی فتوے جاری کیے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب ملک کے سیاسی حالات سے نہایت پریشان اور غیر مطمئن ہیں اور اپنے دور کے سیاسی مذہبی منظرنامہ کو ملک اور مسلمانوں دونوں کے لئے خطرناک سمجھتے ہیں۔ (یہ فتویٰ اور اس کے علاوہ متعدد اہم فتاویٰ جن میں ہندوستان کی آراضی کے مسائل پر بھی بحث ہے، قاضی صاحب کے اس مجموعہ فتاویٰ میں شامل ہے، جو قاضی صاحب کے پڑپوتے عبدالسلام پانی پتی نے قاضی صاحب کی اصل تحریروں کی مدد سے مرتب کیا تھا۔ اس مجموعہ فتاویٰ کا مکمل فوٹو اسٹیٹ ہمارے ذخیرے میں موجود ہے)

بہرحال حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت قاضی صاحب جیسے مایۂ فخر روزگار علما کے فتاویٰ نے پورے ملک کو متاثر کیا تھا اور اسی وجہ سے اور بھی بہت سے علما نے اس سمت میں پیش قدمی کی اور ہندوستان کی مذہبی، سیاسی اور معاشی صورت حال کا جائزہ لیا اور پس منظر میں کئی کئی تحریریں مرتب کیں، اپنی فقہی رائے اور فتاوے جاری کیے۔

اس تحریک اور فضا کی آبیاری اور اس نظریہ کی ترویج واشاعت میں اور علما کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان کے دوسرے بڑے علما کا بھی خاصہ حصہ ہے۔ حضرت شاہ رفیع الدین (وفات ۱۲۳۳ھ/ اگست ۱۸۱۸ء) بھی ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے۔ شاہ صاحب کا اس موضوع پر ایک مختصر مگر جامع فتویٰ موجود ہے۔ مفسر قرآن حضرت شاہ عبدالقادر (وفات رجب ۱۲۳۰ھ/ جون ۱۸۱۵ء) کی بھی یہی رائے تھی۔ (ص ۳۲ تا ۳۵۔ تحریک آزادی میں علما کا کردار۔ مؤلفہ فیصل احمد ندوی، مطبوعہ ندوہ لکھنؤ ۱۴۲۷ھ/ ۲۰۰۶ء)

مولانا فیصل ندوی حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی برصغیر کے بہت مشہور اور راسخ علما میں سے تھے۔ نسباً عثمانی تھے۔ مشہور بزرگ شیخ جلال الدین کبیر الاولیا پانی پتی (م ۷۶۵ھ) ان کے اجداد میں ہیں۔ پانی پت میں ۱۱۴۳ھ/ ۱۷۳۰ء میں ولادت ہوئی۔ سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے شہر کے اساتذہ سے حاصل کر کے دہلی کا رخ کیا اور حضرت شاہ ولی اللہ کی خدمت میں رہ کر متعدد علوم میں رسوخ پیدا کیا اور فراغت حاصل کی۔ شیخ محمد عابد سنامی سے طریقت کی تعلیم پائی۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت مرزا مظہر جان جاناں سے فیض حاصل کیا۔ انہی سے اجازت وخلافت تھی۔ حضرت مرزا مظہر نے آپ کو ''علم الہدیٰ'' کے لقب سے سرفراز فرمایا تھا۔ شیخ کو آپ پر فخر تھا۔ تفسیر میں آپ کا پایہ بہت بلند تھا۔ ان کی تفسیر مظہری اس کی شاہد ہے۔

حدیث وفقہ میں بھی کمال حاصل تھا۔ فقہ میں ان کی مشہور کتاب ''مالا بد منہ'' آج تک بہت سے مدارس عربیہ میں داخل نصاب ہے۔ فقہ وحدیث میں تبحر کے پیش نظر شاہ عبدالعزیز آپ کو ''بیہقی وقت'' کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ حقائق ومعارف مجددیہ کے بیان میں آپ حضرت شاہ ولی اللہ کے تلامذہ میں سب پر فائق ہیں۔ شاہ ولی اللہ کی مجتہدانہ شان اگر آپ کے کسی شاگرد میں نمایاں ہے تو وہ صرف آپ کی ذات گرامی ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی جو امام انقلاب حضرت شاہ ولی اللہ کے شاگرد رشید، اور قائد تحریک اصلاح وجہاد حضرت شاہ عبدالعزیز کے دوست اور رفیق تھے۔ وہ طبعاً ملک میں رونما ہونے والے واقعات اور دن بدن بدلتے ہوئے حالات پر گہری نظر رکھتے اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے تھے۔ پھر ان کا زیادہ وقت خدمت افتاء اور حل مشکلات میں صرف ہوتا تھا۔ اس لئے یقیناً ان کے پاس ملک کی شرعی حیثیت اور متعلقہ احکام کے سلسلہ میں کثرت سے سوالات آتے رہے ہوں گے۔ اسی قسم کا ایک سوال مولانا ابوالحسن حسن ابن مفتی الٰہی بخش کاندھلوی نے کیا تھا۔ اس کے جواب میں قاضی صاحب نے تحریر فرمایا:

> کفار کہ بریں ملک مسلط شدہ اند، مسلمانان ایں دیار حکم مستأمنان دار الحرب دارند۔ مسلمانان مستأمنان کہ در دار الحرب باشند، آنہارا گرفتن مال حربیان بغدر جائز نیست، اگر بطریق قمار و مانند آں اگر گرفتہ باشد مضائقہ ندارد، جائز است۔ وبسرقہ وخیانت یا با مقتضائے غدر است گرفتن

جائز نیست۔ عاصی میشود۔ لیکن خوردن مال حرام است۔

کفار اس ملک پر مسلط ہو چکے ہیں اس لئے اس پورے دیار کے مسلمان
دارالحرب کے مستامن مسلمانوں کے حکم میں ہیں اور جو مستامن مسلمان
دارالحرب میں رہتے ہیں ان کو حربیوں کا مال غدر سے لینا جائز نہیں۔ اگر
ربا قمار (سود اور جوا) یا اس کے مانند کسی طریقہ سے لیا جائے تو کوئی
مضائقہ نہیں، جائز ہے۔ اور اگر چوری خیانت یا غدر سے ہو تو لینا جائز
نہیں۔ گناہ ہوگا۔ یہ مال کھانا حرام ہے۔

یہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے فتویٰ دارالحرب کا واضح اقتباس ہے۔ (یہ پورا فتویٰ قاضی
صاحب کے قلم سے مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کے پاس محفوظ ہے) جس میں وہ صراحت
سے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر حربیوں کا مال بطریق سود و قمار لینا جائز فرما رہے ہیں۔
قاضی صاحب کا انتقال ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں ہوا۔ اس لئے اس کا احتمال ہے کہ یہ فتویٰ شاہ
عبدالعزیز صاحب کے فتویٰ سے پہلے کا ہو۔ اس کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ مستفتی مولانا ابوالحسن
حسن کاندھلوی تھے۔ جن کے خاندان کے شاہ عبدالعزیز سے دیرینہ اور مستحکم تعلقات تھے۔ اس
لئے شاہ صاحب کے فتویٰ کے ہوتے ہوئے قاضی صاحب سے رجوع کرنے کی بظاہر کوئی وجہ
نہیں معلوم ہوتی۔ وہ شاہ صاحب کے فتویٰ کو یقیناً شافی و کافی سمجھتے۔ واللہ اعلم۔
(ص ۲۶۶ تا ۲۶۸۔ تحریک آزادی میں علما کا کردار۔ مؤلفہ فیصل احمد ندوی۔ مطبوعہ ندوہ لکھنؤ
۱۴۲۷ھ/۲۰۰۶ء)

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) مولانا عبدالرحمٰن خاں رام
پوری (متوفی ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء) کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

عمل کفار و غلبۂ آنہا دریں بلاد وانسداد طرقِ معاشِ مسلمین خصوصاً زمرۂ فقرا
وعلماء بسیار بے مزہ می دارد۔ حق تعالیٰ غلبہ اسلام و انفتاح ابواب جمعیت
ظاہر و باطن نصیب فرماید۔ زیادہ بجز دعائے خیر چہ نویسد۔ (ص ۲۰۳۔
تذکرۂ کاملان رام پور۔ مؤلفہ احمد علی خاں شوق رام پوری۔ مطبوعہ ہمدرد
پریس، کوچہ چیلاں، دہلی، بار اول ۱۹۲۹ء)

ان شہروں میں کفار کا عمل دخل اور ان کا غلبہ بہت زیادہ ہوگیا ہے۔
مسلمانوں اور خصوصاً زمرۂ گروہِ فقرا اور علما کا طریق معاش بہت بے مزہ
ہوگیا ہے۔ حق تعالیٰ غلبۂ اسلام اور ظاہر و باطن کے اطمینان کے دروازے
کھول دے۔ بجز دعاے خیر کے زیادہ کیا لکھا جائے۔

نا مساعد اور سنگین حالات سے تنگ آ کر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے دہلی سے
اپنی ہجرت کا بھی ارادہ کرلیا تھا۔ چنانچہ ایک خط میں آپ لکھتے ہیں:

بناء براں قصد مصمم میشود کہ طرفے ہجرت باید کرد...... چارونا چار تا حال در
دارالحرب اقامت گزیدہ ایم۔ (ص ۲۰۴ و ۲۰۵۔ تذکرۂ کاملانِ رام پور)

ایک استفتا کے جواب میں دارالاسلام اور دارالحرب کی تفصیلات و شرائط بحوالۂ کتب فقہ
بیان کرنے کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں:

دریں شہر حکم امام المسلمین اصلاً جاری نیست۔ و حکم روساے نصاریٰ بے
دغدغہ جاری است۔

ترجمہ: اس شہر میں مسلمانوں کے امیر و حاکم کا حکم بالکل جاری نہیں۔ عیسائی
حکام کا حکم بے دغدغہ اور بے روک ٹوک جاری ہے۔

ومراد از اِجرائے اِحکام کفر ایں ست کہ در مقدمۂ ملک داری، و بندوبستِ
رعایا، واخذِ خراج و باج، و عشورِ اموال تجارت، و سیاست قطاع الطریق و
سراق، و فصلِ خصومات، و سزائے جنایات، کفار بطور خود حاکم باشند۔

ترجمہ: اور احکام کفر کے جاری اور نافذ ہونے سے مراد یہ ہے کہ ملک داری
کے مقدمات، رعایا کے انتظام، خراج و لگان، مال تجارت کے عشر کی
تحصیل، ڈاکوؤں اور چوروں کی سزا، رعایا کے باہمی معاملات اور جرم و سزا
کے مقدمات میں بطور خود کفار حاکم بنے بیٹھے ہیں اور انھیں کا حکم نافذ ہے۔

آرے اگر بعضے احکام اسلام را مثل جمعہ و عیدین و اذان و ذبح بقر تعرض
نکنند نکردہ باشند۔ لیکن اصل الاصول ایں چیز ہا نزدِ ایشاں ہبا و ہدر است۔
زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم مینمایند و ہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمانِ
ایشاں دریں شہر و در نواح آں نمی تواند آمد۔

برائے منفعت خود از واردین و مسافرین وتجار مخالفت نمی نمایند۔ اعیان دیگر
مثل شجاع الملک وولایتی بیگم بغیر حکم ایشاں دریں بلاد داخل نمی توانند شد۔
واز یں شہر تا کلکتہ عمل نصاری ممتد است۔ آرے در چپ و راست مثل
حیدرآباد ولکھنؤ ورام پور احکام خود جاری نکردہ اند، بسبب مصالحت واطاعت
مالکانِ آں ملک۔

ترجمہ: اگرچہ بعض احکام اسلام مثلاً جمعہ وعیدین واذان اور ذبیحۂ گاؤ میں کفار
تعرض نہ کریں۔ لیکن اصل اصول ان چیزوں کا ان کے نزدیک بے وزن اور
بے فائدہ ہے۔ اسی وجہ سے مسجدوں کو بے تکلف منہدم کر دیتے ہیں۔ کوئی
مسلمان یا ذمی ان کی اجازت کے بغیر ان اطراف میں نہیں آسکتا۔
مصلحتاً زائرین ومسافرین اور تاجروں سے جھگڑا نہیں مول لیتے۔ دوسرے
امراء جیسے شجاع الملک اور ولایتی بیگم بلا ان کی اجازت کے بغیر ان شہروں
میں نہیں آسکتے۔
اس شہر سے کلکتہ تک ہر جگہ نصاریٰ کا عمل دخل ہے۔ البتہ دائیں بائیں مثلاً
حیدرآباد، لکھنؤ اور رام پور میں انھوں نے اپنے احکام جاری نہیں کیے۔ اس
لئے کہ ان کے والیان ملک نے ان سے صلح کر کے ان کی تابعداری اور
فرماں برداری منظور کر لی ہے۔

واز روئے احادیث وتتبع سیرتِ صحابۂ کرام وخلفاے عظام ہمیں مفہوم
میشود، زیراکہ در عہد حضرت صدیق اکبر ملک بنی یربوع را حکم دار الحرب
دانند، حال آں کہ جمعہ وعیدین واذان درآں جا جاری بود مگر انکارِ حکم زکوٰۃ
کردہ بودند۔ وہم چنیں یمامہ وگرد ونواحِ آں را حکم دار الحرب دادند
باوجودیکہ مسلمانان درآں بلاد موجود بودند۔ و علی هذا القیاس۔

ترجمہ: احادیث نبوی، صحابہ کرام اور خلفائے عظام کے حالات کے تتبع
سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ عہدِ ابوبکر صدیق میں بنی یربوع کے
علاقہ کو دار الحرب قرار دیا گیا تھا۔ حالاں کہ جمعہ وعیدین اور اذان سب
وہاں جاری تھے مگر وہاں کے لوگ زکوٰۃ کے منکر تھے۔ اسی طرح یمامہ اور

اس کے گرد ونواح کے بارے میں یہی حکم تھا کہ وہ دار الحرب ہے جب کہ
ان شہروں میں مسلمان بھی تھے۔ علی هذا القیاس۔

در عہد خلفائے کرام ہمیں طریق سلوک بود، بلکہ در عہد حضرت پیغمبر صلی اللہ
علیہ وسلم فدک وخیبر را حکم دار الحرب فرمودند، حالاں کہ تجار اہل اسلام بلکہ
بعضے سکنۂ آں جا نیز درآں مکانات در وادی القری مشرف باسلام بودند۔
وفدک وخیبر را کمالِ اتصال بود از مدینہ منورہ۔ (ص ۱۶ و ۱۷۔ جلد اول
فتاویٰ عزیزی، مطبع مجتبائی دہلی)

ترجمہ: خلفائے کرام کے زمانہ میں بھی یہی طریقہ جاری رہا، بلکہ خود حضرت نبی
کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے زمانہ میں فدک وخیبر کو دار الحرب قرار دیا
تھا۔ حالاں کہ مسلمانوں کے تاجر بلکہ وہاں کے بعض باشندے بھی وادی القریٰ
میں مسلمان ہو چکے تھے۔ اور فدک وخیبر کا مدینہ منورہ سے کمالِ اتصال تھا۔

ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں:

معمولۂ انگریزاں وأشباہ ایشاں لاشبہ دار الحرب است۔ (ص ۱۱۰۔ فتاویٰ
عزیزی جلد اول۔ مطبوعہ دہلی)

انگریزوں اور ان جیسے کافر حکمرانوں کی عمل داری بلاشبہ دار الحرب ہے۔

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) بارگاہِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ
وسلم میں ہدیۂ درود وسلام پیش کرتے ہوئے اپنے دور کے حالات اور سکھوں و مرہٹوں کے ساتھ
غاصب وقابض کفار یعنی نصاریٰ کی زیادتیوں وستمگاریوں کا ذکر کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں:

سلام علیٰ مولیٰ جسیم الفضائل — کریم الوریٰ حاوی فنون الفواضل
حماہٗ الٰہ العالمین عن الاذیٰ — و عن کل شر فی الخلیقة نازل
و بعد فان العبد یحمد ربه — علیٰ ما حماہ عن صنوف الغوایل
لاغدو و اثواب النعیم ملابسی — و امسی و ایدی الطیبات حمایل
و لکن اریٰ الکفار ارباب ثروة — لقد افسدوا مابین دهلی و کابل
اریٰ الخلق طراً مشتکین معانهم — و امرهم مابین فقر و عائل

جزی اللّٰه عنا قوم سکھ و مرهته — عقوبة شرعا جلاً غیر اٰجل
فقد قتلوا جمعاً کثیراً من الوریٰ — و قدا و جعوا فی اهل شاه و جاهل
و لم یدعوا قوماً مصونین عنهم — و ان واقعوهم بالذریٰ و الکلاکل
هم کل عام نهبة فی بلادنا — یخوضون فینا بالضحیٰ و الاصائل
فهل بعد هذا من معاذٍ لعائذٍ — و هل من مغیثٍ یتقی اللّٰه عادل
کفیٰ اللّٰه سلوانا الوجع مفاصل — الیس بکافٍ عروة للاوائل
و ان کانت الاقوام لاخیر فیهم — فنحن تمسکنا بخیر الوسائل
رسول الٰهِ العالمین فانه — ثمال الیتامیٰ عصمة للارامل
یلوذبه آلاف من اهلِ حاجةٍ — فهم عنده فی نعمةٍ و فواضل
و یستهزم الجیش العرمرم باسمه — و ان کان جراراً کثیر الصواهل

(منتخب اشعار۔ از ص ۳۲۸ و ۳۲۹۔ حیات ولی مؤلفہ رحیم بخش دہلوی۔ مطبوعہ دہلی)

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۹۲۴ء) کے موقف اور آپ کے رجحان میں بعد کے حالات وادوار میں جو تبدیلی آئی اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء) لکھتے ہیں:

"دہلی میں جب انگریزی حکومت قائم ہوئی تو علماءِ ثقات کا عام مسلک یہ رہا کہ انگریزی ملازمت سے اجتناب کیا جائے۔ شاہ صاحب کا بھی ابتدا میں یہی مسلک تھا۔ جب کمپنی نے کلکتہ میں قاضی القضاۃ کا عہدہ قائم کیا اور اس کے لیے لکھنؤ لکھا تو لکھنؤ سے ایک استفتاء شاہ صاحب کے نام گیا تھا۔ شاہ صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر اس سے احتراز واجب ہے......لیکن جب انگریزی حکومت پر کچھ عرصہ گذر چکا تو انگریزوں کی کوششیں جو وہ شمالی ہند میں مسلمانوں کی تالیف قلب کے لئے برابر کیے جارہے تھے، بہت کچھ کامیاب ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ وہ وقت آگیا کہ خود شاہ صاحب تیار ہوگئے کہ اپنے داماد مولوی عبدالحیٔ کو میرٹھ کے مفتیِ عدالت ہونے کی اجازت دے دیں اور مدرسہ عزیزی کی طرف سے ان کا نام پیش کریں۔

اس وقت شاہ غلام علی خانقاہ والے زندہ تھے۔ انھوں نے جوں ہی یہ بات سنی، نہایت درجہ کبیدہ خاطر ہوئے اور شاہ صاحب کے نام خط لکھ کر اظہار تعجب کیا۔ شاہ صاحب نے اس کے

جواب میں ایک مفصل خط لکھا ہے، اس میں حضرت یوسف اور فرعون کے معاملہ سے استدلال کرتے ہیں، اور انھیں باتوں پر زور دیتے ہیں جن کا چند سال پہلے لکھنؤ والے مکتوب میں بشد و مد رد کر چکے تھے۔

ڈاکٹر ہنٹر نے اپنے رسالہ "انڈین مسلمانز" میں شاہ صاحب کے اس خط کا ترجمہ نقل کیا ہے۔ ان کے مجموعۂ فتاویٰ میں جو مجتبائی پریس نے شائع کردیا ہے۔ دونوں تحریریں موجود ہیں۔"
(نقش آزاد۔ ص ۳۱۳، ۳۱۴)

اس دور میں ایک نہایت اہم کردار حضرت مولانا شرف الدین رام پوری مفتی ریاست رام پور (متوفی ۱۸۵۲ء) کا ہے جن کے کچھ احوال ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

"مفتی شرف الدین رام پوری کا تعلق علوی سادات سے تھا۔ مشہور زمانہ عالم، مدرس اور مفتی تھے۔ اصل میں پنجاب کے رہنے والے تھے۔ سکھوں کے عمل دخل کی وجہ سے وہاں سے ہجرت کر کے رام پور آ گئے تھے۔

حافظ احمد علی شوق لکھتے ہیں کہ رام پور آ کر علم وفضل میں وہ شہرت حاصل کی کہ علمائے رام پور کا سلسلہ علم آپ تک منتہی ہوتا ہے۔ نواب احمد علی خاں نواب رام پور (۱۲۲۵ھ۔ ۱۲۵۶ھ) آپ کی نہایت تکریم کرتے تھے۔ عہدۂ قضا آپ کے سپرد تھا۔ (تذکرہ کاملان رام پور۔ ص ۱۷۰)

مولوی عبدالقادر رام پوری نے جو آپ کے شاگرد تھے، آپ کا اس طرح تذکرہ کیا ہے:

اگر میں قرار واقعی ان کی تعریف لکھوں تو مرتبہ فنافی الشیخ پر محمول ہوگا۔ اکثر علوم میں فہم عالی کی قوت سے پوری قدرت رکھتے ہیں۔ افتاء میں قاضی القضاۃ ابو یوسف کی یادگار ہیں۔ اس وقت اس شہر میں ہر فن کی کتابیں پڑھانا اور ہر بات کا جواب دینا انھیں کا کام ہے۔ طلبہ کی تعلیم و تربیت کی جانب جب کبھی متوجہ ہوجاتے ہیں تو اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ اس بات کا یہ کھلا ہوا ثبوت ہے کہ جس کسی نے چندروز ان کی خدمت میں علم کی چاشنی حاصل کی پھر جس آفت میں بھی مبتلا ہوا اس فن کے مشغلے کو کبھی ہاتھ سے نہ دیا۔ (علم وعمل۔ ص ۷۸ تا ۸۰۔ ترجمہ مولوی معین الدین افضل گڑھی۔ ترتیب وحواشی محمد ایوب قادری)

نواب صدیق حسن خاں صاحب بھوپالی رقم طراز ہیں:

دراستحضار کتب درسیہ وعلوم قوم باجمعھا و بخدافیرھا عدیم المثال وقت خود بودند۔ طنطنۂ درس

میان زمرۂ علماء توجہے وترحمے وشفقتے کہ ایشاں را
وتدریس شان در چارسوئے عالم رسیدہ است۔ طلبہ علم بحلقہ درس ایشاں رسیدہ بمنتہائے کمال
برحال طلبہ علم مبذول می بود، ہیچ کس راشنیدہ نشد۔ (تاریخ قنوج (قلمی)
علمی رسیدند و کتب فنون متداولہ را از بدایت تا نہایت گذرانیدند۔
صفحہ ۲۶۵، مخزونہ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مفتی صاحب نے کئی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ سراج المیزان (منطق) حاشیہ میر زاہد قطبیہ، شرح سلم العلوم، شرح کافیہ ابن حاجب، حل الاشکال، علم فرائض میں ایک مختصر رسالہ اور بعض فتاوی۔ ان میں سے اکثر کتابیں رضا لائبریری رام پور میں موجود ہیں۔ ۵/شعبان ۱۲۶۸ھ (مئی ۱۸۵۲ء) میں مفتی صاحب نے وفات پائی۔

آپ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دہلی، کلکتہ اور لکھنؤ وغیرہ کا سفر کیا تھا، جہاں آپ کو انگریزی سیاست کا داؤ پیچ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے فتوی دیا۔ (مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی کی بیاض (ورق ۱۳۱و۱۳۲ الف، مملوکہ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی) میں تحقیق جہاد کے سلسلہ میں مفتی صاحب کا ایک مفصل فتوی موجود ہے۔ جس کے اسلوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب بشرط طاقت موجودہ حالات میں جہاد ضروری سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں موقع ملتے ہی تیاری شروع کی۔ مولانا نورالحسن راشد صاحب کا کہنا ہے کہ ان کے پاس ایک بیاض تھی جس کی بازیابی اس وقت مشکل ہو رہی ہے اس میں ہندوستان کے دار الحرب ہونے کے متعلق مفتی شرف الدین صاحب کا صریح فتوی موجود تھا)

چوں کہ مفتی صاحب انگریزوں کے تسلط کی وجہ سے ہندوستان کو دار الحرب سمجھتے تھے۔ اس لئے عملاً بھی انھوں نے انگریزوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیریں کیں۔

رام پور دراصل اودھ کے کنٹرول میں تھا۔ جس کو ایک معاہدہ کے تحت نواب فیض اللہ خاں نے خرید لیا تھا، اور ریاست کی بنیاد رکھی تھی۔ اس لئے یہ ریاست شروع دن ہی سے والی اودھ اور اس کے سرپرست انگریزوں کے رحم وکرم پر تھی۔

۱۷۹۹ء میں شاہ افغانستان زمان شاہ درانی کے اودھ پر حملہ کا خطرہ دکھا کر انگریزوں نے اس میں اپنے پنجے گاڑ لیے، اور ۱۸۰۱ء میں ایک معاہدہ کے موافق چند اضلاع انگریزوں کے حوالے کیے گئے، جس میں روہیل کھنڈ کا علاقہ بھی شامل تھا جس کا صدر مقام رام پور تھا۔ اس وجہ

سے روہیلے اور بالخصوص ان کے سربرآوردہ حضرات جن میں بڑی تعداد علمائے کرام کی تھی، اور بگڑ گئے۔ جو پہلے ہی انگریزوں کے زخم خوردہ تھے۔ رام پور جو نواب فیض اللہ خاں کی علم دوستی کی وجہ سے علما کا ملجا بنا ہوا تھا۔ مگر انگریزوں کے عمل دخل کی وجہ سے یہاں سے بھی چین وسکون غارت تھا۔ اس لئے انھوں نے انگریزوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا منصوبہ بنایا۔ اس وقت نواب احمد علی خان (۱۷۹۴ء۔۱۸۴۰ء) رام پور کے نواب تھے۔ وہ زیادہ تر لہو ولعب اور سیر وشکار میں مصروف رہتے تھے، اور اپنا اکثر وقت زنانے میں بسر کرتے تھے۔ اور دوسرے معتمدین نیابت کرتے تھے۔ اس زمانہ میں غلام حسن خاں پٹھان نیابت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ چند اہل کاروں نے سازش کر کے اس کو قتل کروا دیا۔ اس کے قتل کے بعد نواب احمد علی خاں کی مدد کے نام پر انگریزی افسروں کی سرکردگی میں انگریزی فوج کا دستہ رام پور آ گیا۔ نواب صاحب نے انگریزی پالیسی کو اپنے حق میں دیکھ کر مظالم میں شدت شروع کی۔ (مظالم تو پہلے سے جاری تھے۔ حکیم نجم الغنی رام پوری کے بقول نواب صاحب کو اختیارات حاصل ہوتے ہی بدنظمی پیدا ہو گئی۔ ہزاروں نوکر تخفیف میں آئے۔ بہت سی مسجدیں ویران ہو گئیں۔ زیارت گاہیں کھنڈر، مدرسے ندارد۔ اکثر بزرگان اکابر اور روشناس مشاہیر شہر میں تنگ دست ہو کر جلاوطن ہو گئے۔ تباہ ہو گئے۔ جور ہے بدنام کرنے والے، آرام کے بندے، باپ دادا کی ہڈیاں بیچنے والے، جن کو بھی نواب نے نان شبینہ کو محتاج کر دیا، اور جو کچھ حسن عقیدت سے دیا وہ ان کی بسر اوقات کو کافی نہ تھا۔ سرکشی اور خانہ جنگی کی چاروں طرف سے پکار مچ سی۔ بے گناہوں کا خون باتوں باتوں میں اڑ جاتا تھا۔ (اخبار الصنادید جلد اول۔ ص ۱۰۷۔۱۱۷)

اس کے کچھ عرصہ بعد نواب صاحب مجنوں بن کر ایک بنگلے میں مقیم ہو گئے۔ انگریزی فوج کا دستہ بھی یہیں مقیم تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر سرداران قوم متفکر ہو گئے اور یکجا ہو کر مشورہ کرنے لگے کہ انقلاب احوال اور امن عامہ کو بحال کرنے کے لئے اس وقت کیا اقدام کرنا چاہئے؟ مفتی شرف الدین نواب احمد علی خاں کو قتل کر کے انگریزوں کے خلاف تحریک چلانا چاہتے تھے۔

خالد حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں:

مفتی شرف الدین صاحب ان سب میں انتہا پسند تھے۔ ان کی رائے تھی کہ احمد علی خان کو قتل کر کے روہیلوں میں سے کسی کو نواب منتخب کیا جائے اور انگریز کے خلاف اعلان جہاد کر کے روہیلوں

کو جمع کیا جائے تا کہ جنگ دو جوڑہ اور جنگ کٹرہ کمال الدین کی شکستوں کا انتقام لیا جا سکے۔ اس وقت اس فوجی مقابلے کے لئے حالات سازگار تھے یا نہ تھے۔ (غالباً نہ تھے) لیکن نتائج سے بے پروا ہو کر روہیلوں کا اٹھ کھڑا ہونا بعید از امکان نہ تھا۔ وہ انگریز کے ہاتھوں بے پناہ مصائب و آلام جھیلنے کے بعد بھی دہشت زدہ نہیں ہوئے تھے، اور ان کا غم و غصہ باقی تھا۔ اگرچہ جمعیت منتشر ہو چکی تھی اور کوئی سر دھرا باقی نہ تھا۔ مگر ابھی انھوں نے زمانہ سے ساز کرنا نہ سیکھا تھا۔ ''متاع کارواں'' لٹ چکا تھا مگر ''احساس زیاں'' باقی تھا۔ اس دور سے کئی نسلوں بعد تک تنزل کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر ساتھ ہی مقابلہ اور مجادلہ کی اسپرٹ بھرنے کی خواہش و کوشش بھی چلتی رہی۔ خصوصاً اس عہد میں یہ کشمکش نمایاں تھی۔ انگریز کو بھی اس کا اندازہ تھا۔ اس لئے تشدد کی پالیسی پر کاربند تھا۔

بس ایک تسلسلِ تغیرِ حال قائم ہے
نصیب عشق فسادِ دوام بھی تو نہیں

مفتی صاحب مذکور نے کیا پروگرام بنایا تھا۔ ان کے وسائل کہاں تک تھے اور جماعت کی کس حد تک تائید حاصل تھی؟ اس سلسلہ میں بہت سی روایات ہمارے کان میں پڑی ہوئی ہیں۔ ان کا دربار سے واسطہ تھا، اس لئے انھیں روہیلوں کا اعتماد حاصل ہونے میں بھی کلام ہے۔ کیوں کہ جماعت نواب سے عملاً عدم تعاون کیے ہوئے تھی اور کسی ملازم سرکار کو اچھی نظر سے نہ دیکھتی تھی۔ ہمیں تو صرف اس سے بحث ہے کہ احمد علی خان کے دیوانہ ہونے کا مغالطہ کھا کر انھوں نے رائے کے اظہار میں جلدی کی اور عمل میں تاخیر۔ ورنہ تلوار تو دیوانے اور فرزانے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتی۔ (تاریخ روہیل کھند ص ۵۵۸ تا ۵۵۹۔ تاریخ روہیل کھنڈ پر اسی نام سے کئی کتابیں ہیں مگر خالد حسن خاں کی یہ کتاب بعض اعتبار سے سب سے ممتاز ہے۔ اس میں بہت سی باتیں ایسی ملتی ہیں جو دوسری کسی کتاب میں نظر نہیں آتیں۔ انھیں میں سے مفتی شرف الدین کے متعلق یہ تفصیل بھی ہے۔ تقسیم ہند کے وقت اس کا مخطوطہ پاکستان پہنچ گیا تھا جو بہت خوش خط تھا۔ عابد رضا بیدار صاحب نے جب وہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے ڈائرکٹر تھے، اس کو حاصل کیا اور لائبریری کی طرف سے اس کا عکس شائع کیا۔ بیچ بیچ سے کئی صفحات غائب ہیں جس کی ناشر نے تفصیل دی ہے۔ جو موجود ہے بہت غنیمت ہے اور بیدار صاحب کا احسان اور ان کی بیداری کی دلیل ہے)

چوں کہ انگریزوں اور نواب (احمد علی خان) کے درمیان یارانہ تھا جس کی وجہ سے روز بروز

رام پور میں ان کا اثر بڑھ رہا تھا۔ مفتی شرف الدین صاحب انگریزوں سے مقابلہ کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ پہلے نواب کو ٹھکانے لگایا جائے پھر انگریزوں سے نمٹا جائے۔ کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ ورنہ اندرون ملک انگریزوں سے مقابلہ دشوار ہو جائے گا۔ بہت سے مار آستین نکل آئیں گے اور خود گھر کے چراغ سے گھر کو آگ لگ جائے گی۔ نواب کی دیوانگی نے اس کا بہترین موقع دیا۔ گویا اس کے عزل و قتل کا جواز فراہم کیا۔ چنانچہ مفتی صاحب نے نواب کے قتل کا مشورہ دیا۔ حکیم نجم الغنی رام پوری لکھتے ہیں:

> نواب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے کانوں سے مفتی صاحب کی زبانی یہ لفظ سنے تھے۔ ہاں اب دیر کیا ہے؟ بعض صاحبوں کا بیان ہے کہ جب نواب صاحب کی مصنوعی دیوانگی میں ان کے قید اور معزول کرنے کا مشورہ ہوا تو مفتی صاحب نے نواب صاحب کے قتل کرنے کے لئے ایما کیا تھا۔ (اخبار الصنادید۔ اول۔ ص ۷۴۳)

اخبار الصنادید کی یہ عبارت نقل کر کے خالد حسن خاں لکھتے ہیں کہ

بعض صاحبوں کا بیان ہی نہیں متفقہ قومی روایت ہے کہ مفتی صاحب نے احمد علی خاں کے قتل کا پرزور مشورہ دیا تھا اور انگریز سے مقابلہ کی بھی تحریک کی تھی۔ تحریک کی ہو یا نہ کی ہو انگریز کی مخالفت کے علی الرغم احمد علی خان کو قتل کر کے کسی دوسرے شخص کو نواب بنانے کا انجام فوجی مقابلہ کے سوا اور کیا ہوتا؟ مفتی صاحب کی اس تجویز ہی میں معرکہ دو جوڑہ کی طرح ایک اور معرکہ برپا کرنے کی تمنا موجود تھی۔ (تاریخ روہیل کھنڈ۔ ص ۵۶۰)

بہر حال! جب احمد علی خاں کو اپنی اس حکمت عملی سے معلوم ہو گیا کہ درباریوں اور معتمدین خصوصی میں سے کون ان کا مخلص و وفادار ہے، اور کون ان کا مخالف اور ان کے عزل و قید و قتل کا طرفدار؟ تو انھوں نے دیوانگی کا سوانگ ختم کر کے گہرے انتقامی جذبے کو چھپاتے ہوئے مذاق میں بات ٹال دی۔ کئی ہفتے شکار میں گذارنے کے بعد احمد علی خاں شہر میں واپس آئے۔ انگریزی فوج کا ہندوستانی دستہ ان کی حفاظت کے لئے موجود تھا ہی۔ اس کے انگریز افسر عطایا و عنایات کی بدولت ان کے حکم بردار تھے ہی۔ چند دن توقف کے بعد ان ملازمان کو جن کی عداوت ثابت ہو چکی تھی۔ اور جو ان کو معزول، مقید اور قتل کرنے کی تجویز کے روح رواں تھے فرداً فرداً سزا دینا

شروع کی۔ کسی سردار کو جان سے مارا گیا اور کسی کو انتہائی دردناک اور رسوا کن سزادی گئی۔ اب مفتی شرف الدین کی باری تھی۔ مفتی صاحب چوں کہ سرکاری مفتی تھے اور حکومت میں ان کا ایک وزن تھا۔ اس لئے نواب کے لئے ان سے بدلہ لینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مگر گورنر جنرل سے مشورہ کے بعد یہ بھی آسان ہوگیا۔

خالد حسن خاں لکھتے ہیں: گورنر جنرل مارکوئس ہسٹنگز اسی زمانہ میں بریلی آئے ہوئے تھے۔ احمد علی خاں وہیں جاکر ان سے ملے۔ روہیلوں کے بارے میں ان سے کیا کہا اور انھوں نے کیا جواب دیا۔ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔ پھر بھی اتنا جانتے ہیں کہ احمد علی خاں پوری جماعت کے خلاف عناد کی آگ میں جل رہے تھے اور مارکوئس ہسٹنگز سے مل کر آنے کے بعد وہ اپنی منتقمانہ پالیسی میں بے باک تر ہوگئے۔ چنانچہ اب مفتی شرف الدین صاحب کی باری آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بدلہ لینا احمد علی خاں ذرا مشکل سمجھتے تھے اور جب تک گورنر جنرل سے اپنی پالیسی کی ازسرنو تصدیق وتوثیق نہ کرالی، ان پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ پڑی۔

اس جگہ یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ افغانوں پر علما کا بہت اثر ہوتا ہے، اسے انگریز بھی جانتا ہے، اور احمد علی خاں نے غالباً انہیں کے خلاف گورنر جنرل کو ورغلایا تھا۔ جب ہی تو اب کے بار اسی گروہ کو مشق ستم بنایا گیا۔

قصہ مختصر احمد علی خاں نے بریلی سے واپسی کے بعد مفتی شرف الدین صاحب کو گرفتار کرالیا اور گدھے کی دم سے ان کے ہاتھ اس طرح بندھوائے کہ رسی کے ایک سرے میں دم بندھی ہوئی تھی اور دوسرے میں ان کا ہاتھ۔

اس طرح تمام شہر میں تشہیر کرایا۔ انگریز فوج کا مسلح دستہ ساتھ تھا۔ گدھے کے آگے آگے شہنائی بجتی جاتی تھی جس میں یہ شعر گایا جارہا تھا:

نکل کے وادیِ وحشت سے دیکھ اے مجنوں
کہ شور و دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلیٰ

اس کے بعد انھیں ایک چھت پر قید کردیا گیا۔ عام لوگوں نے اس واقعہ کا جو بھی اثر لیا ہو، مگر ان کے شاگردوں نے حق استادی ادا کردیا۔ انھوں نے قید میں ایک رات گذاری تھی۔ دوسری رات دس پندرہ پٹھان نوجوان چھت پر سے مفتی صاحب کو نکال لے گئے۔ نواب ان کی اس چیرہ دستی سے حیران

اور خجل ہوکر رہ گئے۔ مفتی صاحب لکھنؤ چلے گئے اور نواب کو پھر ان سے بدلہ لینے کی ہمت نہ پڑی۔

پھر لکھتے ہیں کہ:

احمد علی خاں نے گورنر جنرل سے مل آنے کے بعد جو نا قابل تلافی اجتماعی نقصان پہنچایا وہ یہ تھا کہ علمائے شہر کو چن چن کر بتدریج شہر بدر کردیا اور وہ رام پور جو اس وقت ''بخارائے ہند'' کہلاتا تھا اس امتیازی شرف سے محروم ہوگیا۔

اخیر میں تجزیہ کرتے ہوئے بہت صحیح لکھا ہے کہ اگر احمد علی خان کو انگریز کی پوری پوری تائید اور فوجی تقویت حاصل نہ ہوتی، انگریز اور احمد علی خاں کے مصالح ہم آہنگ نہ ہوتے، یا کم از کم روہیلے فرداً فرداً علماء کے نکالے جانے کی پالیسی کو بروقت سمجھ لیتے، تو یہ کام اتنا آسان نہ تھا جس آسانی سے ہوگیا۔ (تاریخ روہیل کھنڈ۔ ص۵۶۲، ۵۶۳)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے علما کو کس درجہ خطرناک سمجھتے تھے۔ (ص ۲۸۵ تا ۲۹۱۔ تحریک آزادی میں علما کا کردار، مؤلفہ فیصل احمد ندوی۔ مطبوعہ لکھنؤ۔ باردوم ۲۰۰۶ء)

انگریزوں کی ملازمت کے تعلق سے ایک استفتا کا جواب دیتے ہوئے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) نے ایک نہایت جامع جواب تحریر فرمایا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

نصاریٰ اور کافروں کی مختلف اقسام اور ان کے مختلف احکام ہیں۔ ان میں سے کسی کی ملازمت مباح، کسی کی حرام، کسی کی گناہِ کبیرہ قریب بکفر۔

اگر چوروں ڈاکوؤں کو سزا یا عمارتیں تعمیر کرنے کی ملازمت ہو تو ایسی ملازمت جائز بلکہ مستحب ہے۔

جن ملازمتوں سے کافروں کے ساتھ خلط ملط ضروری ہوتا ہو، برے کام کرنے پڑتے ہوں، یا کسی پر ظلم کرنا پڑتا ہو جیسے منشی گیری، سپاہ گیری یا اٹھتے بیٹھتے ان کی تعظیم کرنی پڑتی ہو یا جس سے اپنی عزت نفس مجروح ہوتی ہو اور اپنی توہین لازم آتی ہو تو ایسی نوکری حرام ہے۔

اور اگر کسی مسلمان کو قتل کرنے، کسی ریاست کو تباہ کرنے، اعمال کفر رائج کرنے یا دین کے اندر کوئی نقص وعیب تلاش کرنے کے لئے ہو تو ایسا کرنا گناہ کبیرہ قریب بہ کفر وارتداد ہے۔ (ص۸۶۔ فتاویٰ عزیزی اول)

نصاریٰ سے دوستانہ میل جول اور ان کے ساتھ محبت و ہم دردی کا برتاؤ شاہ عبدالعزیز صاحب کی نظر میں ناجائز تھا مگر ان کی بعض ملازمتوں کو آپ شرعاً جائز بھی سمجھتے تھے۔

آپ نے اور بعض دیگر علمائے کرام نے ہندوستان کو دار الحرب قرار دینے کے باوجود نہ یہاں سے ہجرت کی اور نہ ہی حکم جہاد دیا جب کہ دار الحرب سے ہجرت یا جہاد ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ نکتہ بھی قارئین کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

کسی دار الاسلام کے بارے میں اگر کسی وقت خرابیٔ حالات و توہین اسلام و مسلمین و اجرائے احکام شرک و کفر وغیرہ کی وجہ سے علمائے کرام اس کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ دے دیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ملک ہمیشہ کے لئے دار الحرب ہو گیا بلکہ حکم یہ ہے کہ جب سابقہ حالات بحال ہو جائیں تو وہ دار الحرب پھر دوبارہ دار الاسلام ہو جائے گا۔ خواہ وہاں کفار و نصاریٰ کی حکومت کیوں نہ ہو۔

دار الاسلام ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ پھر دوبارہ وہاں مسلم حکمران ہوں جبھی وہ ملک دار الاسلام ہوگا۔ اس کے دار الاسلام ہو جانے کے لئے ادائے شعائرِ اسلام اور امورِ مذہبی انجام دینے کی اجازت و عمل ہی کافی ہے۔ کتب فقہ اسلامی میں اس کی صراحت اس طرح مذکور ہے:

و دار الحرب تصیر دار الاسلام باجراء احکام اهل الاسلام فیها کجمعة و عید۔ و ان بقی فیها کافرا صلی و ان لم تتصل بدار الاسلام۔ (الدر المختار)

اعلموا ان دار الحرب تصیر دار الاسلام بشرطٍ واحدٍ و هو اظهار حکمِ الاسلام فیها۔ (الفتاویٰ الهندیة عن السراج الوهاج)

تقویۃ الایمان اور مباحثۂ جامع مسجد دہلی

شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی (متولد ربیع الاول ۱۱۹۳ھ/ مارچ ۱۷۷۹ء۔ متوفی ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ/ مئی ۱۸۳۱ء) کی تقریروں، تحریروں بالخصوص "تقویۃ الایمان" کے ذریعہ ہندوستان کی مذہبی فضا میں ارتعاش آیا جو رفتہ رفتہ ایک بڑی ہلچل اور بڑے طوفان کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔

دہلی کے معاصر علما و مشائخ کرام اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) کے تلامذہ و منتسبین نے خصوصیت کے ساتھ شاہ اسمٰعیل دہلوی کے جدید و نامانوس خیالات اور سوادِ اعظم سے متصادم افکار و نظریات کی پر جوش تردید کی جس کا ایک اجتماعی مظاہرہ ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۵ء میں جامع مسجد دہلی کے اندر ہوا۔

شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی (متوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) و مولوی عبدالحئ بڈھانوی (متوفی ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء) سے دہلی کے علمائے کرام کے مباحثۂ جامع مسجد دہلی منعقدہ در ۱۲۴۰ھ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے علامہ فضل رسول بدایونی (متوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) تحریر فرماتے ہیں:

"مجلس جامع مسجد (دہلی) کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے ایک استفتا مرتب ہوا بمہر و دستخط مولوی رشید الدین خاں صاحب و مولوی فضل حق صاحب و مولوی مخصوص اللہ صاحب و مولوی محمد موسیٰ صاحب و مولوی محمد شریف صاحب و مولوی عبداللہ صاحب واخون شیر محمد صاحب کے۔

صبح کے وقت منگل کے دن انتیسویں ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ کو کہ مولوی عبدالحئ جامع مسجد (دہلی) میں وعظ کہہ رہے تھے۔

مولوی رشید الدین خاں صاحب و مولوی مخصوص اللہ صاحب اور مولوی محمد موسیٰ صاحب

مولوی رفیع الدین صاحب مرحوم کے صاجزادہ اور مولوی محمد شریف صاحب وغیرہ علما وطلبہ خاص وعام حوض پر مجتمع ہوئے۔ جب مولوی عبدالحی وعظ کہہ چکے عبیداللہ طالب علم نے استفتاء پیش کیا کہ اپنی مہر اس پر کردیجیے۔ مولوی عبدالحی نے کہا میں نہیں مہر کرتا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ اس نے کہا یہی لکھ دیجیے اور اصرار کیا۔ مولوی عبدالحی نے انکار کیا اور ملال ظاہر کرنے لگے۔ مفتی محمد شجاع الدین علی خاں صاحب نے کہا اس کا تصفیہ ضرور ہے کہ بڑا اختلاف پڑ گیا ہے۔ مرزا غلام حیدر شاہزادے طالب علم کی تکرار سے رنجیدہ ہوئے اور مولوی عبدالحیؒ وغیرہ کو مجمع علما میں واسطے مناظرہ کے لائے۔ مجمع بیشمار خاص و عام امیر فقیر کا ہوگیا۔ کوتوال بھی واسطے بندوبست کے آپہنچا۔ پھر مولوی عبدالحیؒ نے فاضلوں سے پوچھا کہ تم کیوں آئے ہو؟ کسی نے کہا کہ آپ کے بلانے کے موافق کہ ہر روز کہا کرتے تھے کہ جس کو تاب مناظرہ کی ہو ہمارے سامنے آوے۔ سن کر چپ ہوگئے۔

مولوی موسیٰ نے کہا کہ تم ہمارے استادوں کو بُرا کہتے ہو۔ بولے کہ میں نہیں کہتا۔ مولوی موسیٰ نے کہا یہ ایسے مسئلے نئے بتاتے ہیں کہ ان سے برائی استادوں کی ثابت ہوتی ہے۔ پوچھا وہ کیا ہے؟ کہا کہ مثلاً قبر کے بوسے کو شرک کہتے ہو اور ہمارے اکابر اس کے مباشر ہوتے تھے۔ مولوی عبدالحی نے انکار کیا۔ کسی نے کہا کہ لکھ دو تا کہ تمہارے اوپر جھوٹ باندھنے والوں کی تکذیب کی جاوے۔ مولوی عبدالحی نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے لکھ دیا۔ بوسہ دہندۂ قبر مشرک نیست۔

مولوی رشید الدین خاں صاحب کے ہاتھ میں فتویٰ دیا گیا اور قریب مولوی عبدالحی کے آبیٹھے۔ مولوی عبدالحی نے گلہ شکوہ ان سے شروع کیا کہ خاں صاحب مجھے آپ کی خدمت میں دوستی تھی تم برملا مجھے ذلیل کرتے ہو۔ خاں صاحب نے فرمایا کہ ہم تمہارے اعزاز واظہار کمال کے واسطے آئے ہیں۔ لوگوں نے مشہور کیا ہے کہ تم مسئلے خلاف سلف کے کہتے ہو۔ اس سبب سے تم سے خلق کو وحشت ہے۔ ایسے مجمع میں مفتریوں کی تکذیب ہو جاوے گی۔ مولوی عبدالحیؒ شکوے ہی کی پریشان باتیں کرتے رہے۔

خاں صاحب نے فرمایا کہ تمہارے لوگ کہتے ہیں کہ عبدالعزیز کی راہ راہ جہنم کی ہے۔ اسی وقت گواہی سے یہ بات ثابت ہوگئی۔ لوگ بُرا کہنے لگے۔ مولوی عبدالحیؒ نے بھی تبرا کیا باآواز بلند اور مولوی رشید الدین خاں صاحب سے کہا کہ مولانا عبدالعزیز کی محبت اور اعتقاد علم و بزرگی میں

میں مثل تمہارے ہوں۔ طحاوی اور کرخی کے برابر جانتا ہوں۔

پھر استفسار شروع ہوا ہر مسئلے کا جواب دیا کہ چنداں مخالف جمہور کے نہ تھا۔ مولوی اسمٰعیل نے پہلے ہی استفسار سے ارادہ کیا اوٹھ جانے کا۔ مولوی رحمت اللہ صاحب نے کہا کہ ذرا تشریف رکھیے کہ جناب کے بھی دستخط اس تحریر پر ضرور ہیں۔ مولوی اسمٰعیل نے کہا کہ میں کسی کے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔ میرے واسطے محتسب لا۔ اے مردود! میرے ساتھ سختی کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ حضرت میں سختی نہیں کرتا عرض کرتا ہوں۔ پھر مولوی اسمٰعیل نے کہا کہ میرے رسالہ کا جواب لکھ۔ مولوی رحمۃ اللہ صاحب نے کہا کہ رسالہ آپ کا میری بغل میں ہے اگر فرمائیے اسی مجمع میں جواب عرض کروں۔ غصہ کھا کر کچھ نہ کہا۔ پھر مولوی رحمۃ اللہ نے کہا کہ جواب عقلی لکھوں یا نقلی؟ کہا جیسا چاہے۔ پھر مولوی رحمۃ اللہ نے کہا کہ رد جواب اس کا لکھو گے؟ کہا کہ میں محکوم کسی کا نہیں ہوں۔ مولوی رحمۃ اللہ نے کہا کہ نئے عقیدے اپنے دل کے بنائے ہوئے کسی سے نہ فرمائیے۔ اور نہیں تو ابھی بحث کر لیجیے۔ مولوی اسمٰعیل اٹھ بھاگے۔ اور چلتے ہوئے رشید الدین خاں صاحب مولوی عبدالحیؒ سے پوچھا کیے۔ وہ جواب دیتے تھے ایسے کہ قدما کے بہت خلاف نہ تھے۔

تیرہویں سوال میں کہ بدعت کی بحث تھی۔ مولوی عبدالحی نے کہا کہ میرے نزدیک بدعت حسنہ یہی ہے گو اصل ہر بدعت کی بد ہے مگر سبب نیکی کا اس میں ہو تو حسنہ ہو جاتی ہے و اِلّا فلا۔

مولوی رشید الدین خاں صاحب نے کہا کہ اصل ہر بدعت کی بد نہیں ہے۔ بموجب حدیث من سن سنة حسنةو من سن سنة سيئة ۔الحدیث۔ کے اور حدیث من احدث فی امرنا هذا ما ليس منه اور حدیث من ابتدع بدعة ضلالة لايرضا هاالله کہ ان تینوں حدیثوں سے ثابت ہوا کہ نیا طریقہ نیک بھی ہوتا ہے بد بھی۔ اور خدا ورسول کی مرضی کے موافق بھی، مخالف بھی، گمراہ بھی، غیر گمراہ بھی۔ اسی سبب سے علما نے کہا ہے کہ بعض بدعت واجب ومندوب ومباح بعضے حرام ومکروہ۔

مولوی مخصوص اللہ صاحب نے کہا جس بدعت کی وجہ حسن وقبح کی ظاہر نہ ہو وہ کیا ہے؟ مولوی عبدالحیؒ نے کہا سیئہ۔ انھوں نے کہا اس تقدیر پر بدعت ومباح میں کیا فرق ہے؟ مولوی عبدالحیؒ ساکت ہوگئے۔ کسی نے کہا کہ احکام خمسہ میں سے ایک حکم کم ہوگیا۔ پھر مولوی عبدالحیؒ نے کہا کہ ہر بدعت کو برا اس واسطے کہتا ہوں کہ کل بدعة کا کلیہ ظاہر پر رہے اور مخصوص نہ

ہوجائے۔ خاں صاحب نے کہا کہ تخصیص سے کیا قباحت لازم آتی ہے اور عمومات میں تخصیص مشہور ہے۔ مولوی محمد شریف نے پڑھا ما من عام إلا و قد خص منه البعض۔ خاں صاحب نے کہا کہ تینوں حدیثیں مذکورہ بالا تخصیص کو چاہتی ہیں۔ پس تخصیص ضرور ہوئی۔ مولوی عبدالحئی نے کہا کہ اصل ہر بدعت کی قبیح بعض علما کا مذہب ہے۔ خاں صاحب نے کہا کہ یہ قول حضرت مجدد کا ہے مگر تمہارے مذہب سے نہایت دور کہ ان کے مذہب میں جس کی اصل شرع میں پائی جائے وہ سنت ہے۔ بدعت وہی ہے کہ جس کی اصل نہ پائی جائے۔

پھر مولوی عبدالحئی نے غوطہ میں جا کر کہا کہ یہ قول نووی کا فتح المبین میں لکھا ہے۔ اس وقت فتح المبین شرح اربعین امام نووی کی پیش کی گئی۔ عبارت اس مقام کی بآواز بلند مع ترجمہ پڑھی گئی۔ پھر تو مولوی عبدالحئی اچھی طرح سے قائل معقول ہو گئے۔

پھر اذان میں بعد دفن کے کلام ہوا۔ بعد کسی قدر تکرار کے کہا کہ میں کسی کو منع نہیں کرتا۔

پھر کلام ہوا سوم کے فاتحہ میں۔ بعد قیل و قال کے کہا کہ اگر اس دن مین ثواب زیادہ جانتا ہے ممنوع اور اگر ثواب زائد نہیں جانتا اور برعایت مصلحت کے کرتا ہے تو منع نہیں ہے۔ تمام ہوا خلاصۂ نقل مجلس۔

پھر تو یہ حال ہوا کہ ہر ایک مسئلہ میں ادنیٰ ادنیٰ سے آدمی سے قائل ہونے لگے اور اطراف و جوانب میں بھی یہ تقریریں اور تحریریں جابجا پھیل پڑیں۔ سب پر ظاہر ہو گیا کہ مولوی اسمٰعیل کا طریقہ مخالف ہے تمام سلف صالح کے اور اپنے خاندان کے بھی مخالف ہیں۔ اور سبب اعتبار کا وہی نسبت خاندان کی تھی۔ جب اس کے بھی خلاف ٹھہرے تو کچھ اعتبار نہ رہا اور ساری قلعی کھل گئی اور ہر ایک جگہ جو اہل علم تھے متوجہ ہوئے ان کی بددینی کے اظہار اور اس کا رد لکھنے پر۔

ایسے سببوں سے آگ ان کے فتنے کی ٹھنڈی ہو گئی اور نئے دین والے انہیں پر زبان دبا کر بات کرنے لگے اور توجیہ بات بنانے میں اور تقیہ جاری ہوا۔ ہزاروں ہزار آدمی اس طریقے سے تائب ہوئے۔ صرف وہی لوگ کہ جن کو سخن پروری کا پاس دین پر غالب ہوا۔ یا جن کو وہ پیشہ واسطہ ہوا دنیا پیدا کرنے کا اُس طریق پر قائم رہے مگر نہایت ذلت وخواری کے ساتھ۔ اہل علم کی مجلسوں میں تقیہ سے گذارا کر کے۔" الیٰ آخرہٖ۔ (ص: ۵۰ تا ۵۵۔ سیف الجبار از علامہ فضل رسول بدایونی۔ طبع جدید ادارہ مظہر حق بدایوں ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء۔ عکسِ طبع دوم مطبع غالب الاخبار

سیتاپور، اودھ۔ رمضان ۱۲۸۹ھ/ اکتوبر ۱۸۷۲ء)

اس سلسلے میں علامہ فضل رسول بدایونی (متوفی ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) کے سوالات اور حضرت مولانا شاہ مخصوص اللہ دہلوی (متوفی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۸ء) فرزند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) کے جوابات نقل کرتے ہوئے نقشبندی مجددی عالم مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی دہلوی (متوفی ۱۹۹۳ء) لکھتے ہیں:

> "مولانا بدایونی نے اپنا مکتوب اور مولانا مخصوص اللہ کے جواب کو رسالہ "تحقیق الحقیقۃ" میں نقل کر دیا ہے اور یہ رسالہ ۱۲۶۷ھ میں بمبئی سے شائع ہوا ہے۔ مولانا قاضی فضل احمد لدھیانوی نے اپنی ضخیم کتاب "انوار آفتاب صداقت" (مطبوعہ ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء کریمی پریس لاہور باہتمام میر امیر بخش) میں مکتوب و جواب مکتوب کو نقل کر دیا ہے۔ اس کتاب سے مکتوب و جواب مکتوب نقل کرتا ہوں۔ (از صفحہ ۶۱۷ تا ۶۲۰)

مولانا فضل رسول کا مکتوب

بعد گذارش آداب و تسلیمات عرض ہے کہ تقویۃ الایمان کے مشہور ہونے کے وقت سے لوگوں میں بڑی نزاع ہے۔ مخالفین کہتے ہیں کہ وہ کتاب مخالف ہے تمام سلف صالح اور سوادِ اعظم کے اور اس کتاب کی رُو سے اُن کے استادوں سے لے کر صحابہ تک کوئی کفر و شرک سے نہیں بچتا۔ اور ان کے موافق لوگ کہتے ہیں کہ وہ کتاب موافق سلف صالح اور ان کے خاندان کے ہے، چوں کہ اس بات کو جیسا آپ جانتے ہوں گے غالب کہ دوسرا نہ جانتا ہوگا، اهل البيت ادرى مافي البيت، اس خیال سے چند باتیں معروض ہیں۔ امید ہے کہ جواب باصواب مرحمت ہو۔

پہلا سوال: تقویۃ الایمان آپ کے خاندان کے موافق ہے یا مخالف؟

دوسرا سوال: لوگ کہتے ہیں اس میں انبیا اولیا کے ساتھ بے ادبی کی ہے، اس کا کیا حال ہے؟

تیسرا سوال: شرعاً اس کے مصنف کا کیا حکم ہے؟

چوتھا سوال: لوگ کہتے ہیں: عرب میں وہابی پیدا ہوا تھا۔ اس نے نیا مذہب بنایا تھا۔ علمائے عرب نے اس کی تکفیر کی، تقویۃ الایمان اس کے مطابق ہے؟

پانچواں سوال: وہ کتاب التوحید جب ہندوستان آئی آپ کے حضرت عم بزرگوار اور حضرت والد

نے اُسے دیکھ کر کیا فرمایا تھا؟

چھٹا سوال: مشہور ہے کہ جب اس مذہب کی نئی شہرت ہوئی تو آپ جامع مسجد (دہلی) میں تشریف لے گئے۔ مولوی رشید الدین خاں صاحب وغیرہ تمام اہل علم آپ کے ساتھ تھے اور مجمع خاص وعام میں مولوی اسمٰعیل صاحب اور مولوی عبدالحیٰ صاحب کو ساکت اور عاجز کیا، اس کا کیا حال ہے؟

ساتواں سوال: اس وقت آپ کے خاندان کے شاگرد اور مرید اُن کے طور پر تھے یا آپ کے موافق؟

امید ہے کہ جواب ان سب مراتب کا صاف صاف مرحمت ہو کہ سبب ہدایت ناواقفوں کا ہے۔''

مولانا مخصوص اللہ کا جواب

''پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ تقویۃ الایمان کہ میں نے اس کا نام 'تفویۃ الایمان' ساتھ فا کے رکھا ہے۔ اس کے رد میں رسالہ جو میں نے لکھا ہے اس کا نام ''معید الایمان'' رکھا ہے۔ اسمٰعیل کا رسالہ موافق ہمارے خاندان کے کیا کہ تمام انبیا اور رسولوں کی توحید کے خلاف ہے۔ کیوں کہ پیغمبر سب توحید کے سکھلانے کو، اپنی راہ پر چلانے کو بھیجے گئے تھے۔ اس کے رسالے میں اس توحید کا اور پیغمبروں کی سنت کا پتہ بھی نہیں ہے۔ اس میں شرک اور بدعت کے افراد گن کر جو لوگوں کو سکھلایا ہے، کسی رسول نے اور ان کے خلیفہ نے کسی کا نام لے کر شرک یا بدعت لکھا ہو، اگر کہیں ہو تو اس کے پیروؤں سے کہو کہ ہم کو بھی دکھاؤ؟

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ شرک کے معنی ایسے کہتے ہیں کہ اس کی رو سے فرشتے اور رسول، خدا کے شریک بنتے ہیں اور خدا شرک کا حکم دینے والا ٹھیرتا ہے اور وہ شریک کہ شرک سے راضی ہو وہ مبغوض خدا کا ہوتا ہے۔ محبوب کو مبغوض بنانا اور کہوانا، ادب ہے یا بے ادبی ہے؟ اور بدعت کے معنی وہ بتائے اور پھیلائے ہیں کہ اصفیا اولیا بدعتی ٹھیرتے ہیں اور یہ ادب ہے یا بے ادبی ہے؟

تیسرے مطلب کا جواب یہ ہے کہ پہلے دونوں جوابوں سے دیندار اور سمجھنے والے کو ابھی کھل جائے گا کہ جس رسالے سے اور اُس کے بنانے والے سے لوگوں میں برائی اور بگاڑ پھیلے اور خلاف سب انبیا واولیا کے ہو وہ گمراہ کرنے والا ہوگا یا ہدایت کرنے والا ہوگا؟ میرے نزدیک اس کا رسالہ

عمل نامہ برائی اور بگاڑ کا ہے اور بنانے والا فتنہ گر اور مفسد اور غاوی اور مُغوی ہے۔

حق اور سچ یہ ہے کہ ہمارے خاندان سے دو شخص ایسے پیدا ہوئے کہ دونوں کو امتیاز اور فرق نیتوں اور حیثیتوں اور اعتقادوں اور اقراروں کا اور نسبتوں اور اضافتوں کا نہ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی بے پروائی سے سب چھن گیا تھا۔ مانند قول مشہور کے ''چوں حفظ مراتب نہ کنی زندیقی'' ایسے ہی ہو گئے۔

چوتھی بات کا جواب یہ ہے کہ وہابی کا رسالہ متن تھا، یہ شخص گویا اسی کی شرح کرنے والا ہو گیا۔

پانچویں بات کا جواب یہ ہے کہ بڑے عم بزرگوار کہ وہ بینائی سے معذور ہو گئے تھے، اس کو سنا، یہ فرمایا: اگر بیماریوں سے معذور نہ ہوتا تو تحفہ اثنا عشریہ کا سا جواب اس کا رد بھی لکھتا۔ اس کی بخشش وَہابِ بے منت نے اس بے اعتبار کو کی، شرح کا رَد لکھا، متن کا مقصد بھی نابود ہو گیا۔ ہمارے والد ماجد نے اس کو دیکھا نہ تھا، بڑے حضرت کے فرمانے سے کھل گیا کہ جب اس کو گمراہ جان لیا تب اس کا رَد لکھنا فرمایا۔

چھٹی تحقیق کا جواب یہ ہے کہ یہ بات تحقیق اور سچ ہے کہ میں نے مشورت کی راہ سے کہا تھا کہ تم نے سب سے جدا ہو کر تحقیق دین میں کی ہے، وہ لکھو۔ کچھ ظاہر نہ کیا۔ ہماری طرف سے جو سوال ہوئے تھے اس کے جواب میں ہاں جی ہاں کر کے مسجد سے چلے گئے۔

ساتویں بات کا جواب یہ ہے کہ اس مجلس تک سب ہمارے طور پر تھے۔ پھر اُن کا جھوٹ سن کر کچے کچے آدمی آہستہ آہستہ پھرنے لگے اور ہمارے والد کے شاگردوں اور مریدوں میں سے بہت بچے رہے۔ شاید کوئی نادر پھرا ہو تو مجھے اس کی خبر نہیں۔'' (بلفظہٖ، صفحہ ۲۴۔ یہ نمبر تحقیق الحقیقۃ کا ہے۔)

اللہ تعالیٰ مولانا مخصوص اللہ فرزند شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہما و رضی اللہ عنہما و انزلهما منزل الرضا کو اجر ہائے کثیرہ عنایت کرے۔ آپ نے تیسرے سوال کے جواب میں کیا خوب تحریر فرمایا ہے:

''میرے نزدیک اس کا رسالہ عمل نامہ برائی اور بگاڑ کا ہے۔''

اگر اس رسالہ کا صحیح ترجمہ عربی میں کیا جائے اور عرب ممالک کو بھیجا جائے، بجز نجدیوں کے کوئی اس کی حمایت نہیں کرے گا۔ (ص ۱۰۰ تا ۱۰۳۔ مولانا اسمٰعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان مؤلفہ شاہ ابوالحسن زید فاروقی۔ مطبوعہ شاہ ابوالخیر مارگ۔ چتلی قبر، دہلی۔ ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء)

مسلمانوں کے درمیان شورش پیدا کرنے، انھیں لڑانے بھڑانے، اور شرک خفی کو شرکِ جلی لکھنے کے اقراری مجرم خود شاہ اسمٰعیل دہلوی ہیں۔ انھوں نے خود ہی یہ اقبال جرم کیا ہے کہ —

''میں نے یہ کتاب لکھی ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ آ گئے ہیں۔ اور بعض جگہ تشدد بھی ہو گیا ہے۔ مثلاً ان امور کو جو شرک خفی تھے شرکِ جلی لکھ دیا ہے۔ ان وجوہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی اشاعت سے شورش ضرور ہوگی۔ (چند جملوں کے بعد) گو اس سے شورش ہوگی مگر توقع ہے کہ لڑ بھڑ کر خود ٹھیک ہو جائیں گے۔ (ص ۹۸۔ حکایت ۵۹۔ حکایات اولیاء (ارواحِ ثلثہ) از مولانا اشرف علی تھانوی۔ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)

یہاں ایک تاریخی حقیقت ذہن نشین رہے کہ تقویۃ الایمان کی تالیف ہونے کے بعد بقلم منشی شہامت علی پہلا انگریزی ترجمہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن) کے رسالہ جلد ۱۲ میں ۱۸۵۲ء ہی میں چھپ گیا تھا اور تقویۃ الایمان کی پہلی طباعت رائل ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) سے ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں ہوئی تھی۔ اور ہزاروں کی تعداد میں مفت تقسیم کی گئی۔ دیکھیے مقالات سرسید جلد نہم۔ ص ۱۷۸۔ مطبوعہ لاہور۔

مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء) نے لکھا ہے کہ —

''شاہ عبدالعزیز کے بعد جب انھوں نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین لکھی تو تمام علماء میں ہلچل پڑ گئی۔ ان کے رد میں سب سے زیادہ سرگرمی بلکہ سربراہی مولانا منورالدین (تلمیذ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی) نے دکھائی۔ متعدد کتابیں لکھیں (چند جملوں کے بعد) ہر طرح سمجھایا لیکن جب ناکامی ہوئی تو بحث و رد میں سرگرم ہوئے اور جامع مسجد (دہلی) کا شہرۂ آفاق مناظرہ ترتیب دیا جس میں ایک طرف مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی (بڈھانوی) تھے اور دوسری طرف مولانا منورالدین اور تمام علمائے دہلی۔ (ص: ۴۵ آزاد کی کہانی۔ مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی۔ مکتبہ اشاعت القرآن دہلی۔ ۱۹۶۵ء)

مولانا خیرالدین دہلوی (متولد ۱۸۳۱ء۔ متوفی ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء) شاگردِ علامہ فضل حق خیرآبادی و مفتی صدرالدین آزردہ کے نانا مولانا منورالدین دہلوی (متوفی ۱۸۵۷ء) شاگردِ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) نے تحریک وہابیت کے خلاف جو مہم چھیڑی تھی

اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) لکھتے ہیں:

''اس معاملے میں مولانا فضل حق خیرآبادی اور دیگر علما ان (مولانا منورالدین) کے شریک و معاون تھے۔

چنانچہ ان (مولانا منورالدین) کی ایک تصنیف خاص مسئلہ امتناع نظیر خاتم النبیین پر ہے۔ جس میں بڑے شرح و بسط سے معقولات کی بنا پر بحث کی ہے۔

ایک کتاب مجموعی طور پر تقویۃ الایمان، جلاء العینین اور یک روزی کے رد میں ہے۔ اس میں تقویۃ الایمان کے تیس مسئلے مابہ النزاع منتخب کیے ہیں اور پھر تیس بابوں میں ان کا رد کیا ہے۔

ایک رسالہ اس باب میں ہے کہ مولانا اسمٰعیل شہید کے عقائد کا رد خود ان کے خاندان اور اساتذہ کی کتب سے کیا جائے۔ چنانچہ اس میں ہر مسئلے کے رد میں شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے اقوال سے اپنے نزدیک رد کیا ہے۔ (ص ۴۶۔ آزاد کی کہانی، آزاد کی زبانی، مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی)

حضرت مولانا محمد موسیٰ دہلوی (متوفی رجب ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء) بن شاہ رفیع الدین دہلوی بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری (متوفی ۱۹۸۳ء۔ کراچی) لکھتے ہیں:

''مولوی محمد موسیٰ کی تصنیف سے ایک قلمی فارسی کتاب ''حجۃ العمل فی ابطال الجہل'' ہماری نظر سے گذری ہے۔ یہ کتاب ہفت دہم ربیع الاول ۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۶ء میں اِتمام کو پہونچی۔ یہ کتاب ساٹھ اوراق (۱۲۰ صفحات) پر مشتمل ہے۔ کتاب کا مضمون رد وہابیت ہے۔ (ص ۵۹۲۔ تذکرۂ علمائے ہند از پروفیسر محمد ایوب قادری)

اس جدید اسمٰعیلی فکر و تحریک کے خلاف علمائے دہلی مثلاً مولانا شاہ مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین دہلوی، مولانا محمد موسیٰ بن شاہ رفیع الدین دہلوی، مولانا احمد سعید نقش بندی دہلوی، مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی، مولانا خیرالدین دہلوی، حکیم اجمل خاں کے حقیقی دادا حکیم صادق علی

خاں دہلوی، مولانا رشید الدین دہلوی وغیرہ نے اظہار برأت و بے زاری کیا۔ اس کے خلاف کتب ورسائل تحریر کیے۔ تقریریں کیں۔
رد اسمٰعیلیت و وہابیت میں سرگرم حصہ لینے والے چند علما اور ان کی کتب و رسائل درج ذیل ہیں:

(۱) مولانا سید جلال الدین برہان پوری (متوفی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء) شاگرد شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے "صاعقۂ رابیہ در رد وہابیہ" لکھا۔

(۲) مولانا محمد سعید اسلمی مدراسی (متوفی ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۵ء) نے "سفینۃ النجات" لکھا۔

(۳) مولانا کریم اللہ دہلوی (متوفی ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء) شاگرد شاہ عبد العزیز محدث دہلوی ((متوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) و شاگرد مولانا رشید الدین خاں دہلوی (متوفی ۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۳ء) نے حادی المضلین" لکھا۔

(۴) مولانا محمد حیدر علی لکھنوی ثم حیدر آبادی (متوفی ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۱ء) شاگرد شاہ عبد العزیز و شاہ رفیع الدین نے "رد تقویۃ الایمان" لکھا۔

(۵) مولانا قاضی ارتضا علی گوپامئوی (متوفی ۱۲۵۱ھ/ ۱۸۳۵ء) قاضی القضاۃ مدراس نے "خطبۂ الحاقیہ" لکھا۔

(۶) مولانا جمال الدین فرنگی محلی لکھنوی ثم مدراسی (متوفی ۱۲۷۶ھ/ ۱۸۵۹ء) نے "جمال الملۃ والدین" لکھا۔

(۷) مولانا سلامت اللہ کان پوری (متوفی ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء) شاگرد شاہ عبد العزیز و شاہ رفیع الدین نے "اشباع الکلام فی اثبات المولد والقیام" لکھا

(۸) مولانا فخر الدین الٰہ آبادی (متوفی ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۵ء) نے "اِزالۃ الشکوک و الاوھام" لکھا۔

(۹) مولانا سید معین الدین ناروی الٰہ آبادی (متوفی ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء) نے "ھدایۃ المومنین الٰی سلسلۃ الصالحین" لکھا۔

(۱۰) مولانا محمد عمر رام پوری (متوفی ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء) نے "فتح الاسلام فی رد اضغاث الاحلام" اور "عشرۂ مبشرہ" لکھا۔

(۱۱) مولانا محمد احسن پشاوری (متوفی ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۸ء) نے "تحقیق توحید و شرک" لکھا۔

(۱۲) مولانا عبد السبحان احمد آبادی (متوفی ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۵ء) نے "التحدید فی وجوب التقلید" اور "دلائل قاھرہ در تحقیق فرقۂ ناجیہ" لکھا۔

(۱۳) مولانا محی الدین بدایونی (متوفی ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء) نے "شمس الایمان" لکھا۔

(۱۴) مولانا خادم احمد فرنگی محلی لکھنوی (متوفی ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۵ء) نے "ھدایۃ الانام فی اثباتِ تقلید الائمۃ الکرام" لکھا۔

(۱۵) مولانا محمد حیات سندھی (متوفی ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۹ء) نے حیاۃ النبی لکھا۔

(۱۶) مفتی ولی اللہ فرخ آبادی (متوفی ۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۲ء) نے "حزب التوسل الٰی جناب سید الانبیاء والرسل" لکھا۔

(۱۷) مولانا عبد اللہ بلگرامی (متوفی ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ء) نے "السیوف البارقۃ علٰی رؤس الفسقۃ" لکھا۔

(۱۸) مولانا سید عبد الفتاح گلشن آبادی نے "تائید الحق" اور "تحفۂ محمدیہ" لکھا۔

(۱۹) مولانا صبغۃ اللہ مدراسی نے "گلزار ھدایت" لکھا۔

(۲۰) مولانا مخلص الرحمٰن چاٹگامی نے "شرح الصدور" لکھا۔

(۲۱) مولانا عبد الرحمٰن سلہٹی نے سیف الابرار لکھا۔ وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

منصبِ امامت از شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا سید محمد میاں دیوبندی لکھتے ہیں:

"بدترین قیادت کی دو علامتیں بیان کی ہیں جو اس زمانہ میں سلطنتِ مغلیہ کے ذمہ داروں میں پائی جاتی تھیں۔ پھر ان کے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے۔

پس دریں صورت برافراختن اعلام قتل وقتال و برانداختن آں مبتدع ضال درحق ملت و اھلِ ملت منفعتے خواہد بخشید۔ و اِلا بعوام و خواص بے شک مضرتے خواہد رسید (منصب امامت ص ۹۶ مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی)

پس ایسی صورت میں علم بغاوت بلند کرنا اور اس گمراہ کو جو مذہب کے نام پر من مانی کر رہا ہے معزول اور برخاست کر دینا ملت کے لئے بھی مفید ہوگا اور اہل ملت کے لئے بھی۔ ورنہ ملک کے تمام ہی عوام و خواص کو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

تقریباً ایک صفحہ کے بعد فرماتے ہیں۔

جہاد برایشاں از ارکانِ اسلام است و اہانت ایشاں اعانتِ اسلام۔ (منصب امامت ص۹۷) ان کے مقابلے میں جہاد کرنا اسلام کا رکن اور فرض ہے۔ اور ان کو ذلیل اور کمزور کرنا رسول اللہ ﷺ کی امداد واعانت ہے۔

اس کے بعد ص۹۸ پر اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔ (ص:۲۵۔۲۶، علمائے ہند کا شاندار ماضی حصہ دوم از مولانا سید محمد میاں۔ مطبوعہ کتابستان دہلی ۶)

یہ انکشاف کس درجہ حیرت انگیز ہوگا کہ حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب شہید سلطنتِ مغلیہ کے اولوالعزم فرماں رواؤں کی حکومت کو بھی "سلطنتِ ضالہ" اور "گمراہ قیادت" قرار دیتے ہیں۔ (حاشیہ ص۲۵۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی حصہ دوم)

یہی وہ گروہ اسمٰعیلیہ ہے جس کے بارے میں سر سید احمد خاں (متوفی مارچ ۱۸۹۸ء) نے اپنی "کتاب اسباب بغاوت ہند" مطبوعہ ۱۸۵۸ء میں لکھا ہے کہ—

"دہلی میں ایک بڑا گروہ مولویوں اور ان کے تابعین کا ایسا تھا کہ وہ مذہب کی رو سے معزول بادشاہ دلی کو بہت برا اور بدعتی سمجھتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ دلی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبض و دخل اور اہتمام ہے ان مسجدوں میں نماز درست نہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جامع مسجد (دہلی) میں بھی نماز نہیں پڑھتے تھے۔ اور غدر سے بہت قبل کے چھپے ہوئے فتاویٰ اس معاملے میں موجود ہیں۔

پھر کبھی عقل قبول کر سکتی ہے کہ ان لوگوں نے جہاد کے درست ہونے میں اور بادشاہ کو سردار بنانے میں فتویٰ دیا ہو؟ (ص:۸۱۲۔ حیات جاوید۔ از خواجہ الطاف حسین حالی۔ مطبوعہ قومی کونسل، نئی دہلی۔ طبع پنجم ۲۰۰۴ء)

"ترکوں کو بھی یہ لوگ بدعتی اور ائمۂ مسجد حرام و مسجد نبوی کو بھی بدعتی سمجھتے تھے اس لئے سید احمد رائے بریلوی صاحب نے مریدوں و عقیدت مندوں کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ

"جب دوسرے لوگ فارغ ہوجائیں تو اپنی جماعت کھڑی ہو۔"

(ص:۲۲۲۔ سید احمد شہید۔ از غلام رسول مہر، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی مشہور کتاب "انفاس العارفین" کے اردو مترجم سید محمد

فاروق القادری تحریر فرماتے ہیں کہ:

"برصغیر کی خاموش اور پُرسکون فضا میں سب سے پہلے جس چیز نے لوگوں کو چونکایا، سوءِ اتفاق سے وہ اسی خاندان (ولی اللّٰھی و عزیزی) کے ایک فرد شاہ محمد اسمٰعیل کی تقویۃ الایمان تھی۔ جس کی فکر نامانوس، دعوت میں اجنبیت، اور اندازِ بیان جارحانہ تھا۔

ڈھائی سو کتابوں کی ایک لسٹ میری نظر سے گذر چکی ہے جو تقویۃ الایمان کے چھپتے ہی مختلف زبانوں میں مختلف علاقوں سے اس کی تردید میں لکھی گئی ہیں۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت عام مسلمانوں، علما واہلِ خانقاہ نے اس کتاب کو کس حیثیت سے دیکھا؟

ہمارے پاس اس امر کا کوئی ثبوت اور جواز نہیں کہ ہم بیک جنبشِ قلم سارے برصغیر کے علما و صوفیہ و فقرا اور عوام کے متعلق یہ کہہ دیں کہ وہ نعوذ باللہ سارے کے سارے شرک و بدعت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اور پہلی بار شاہ محمد اسمٰعیل ان کو حقیقی توحید سے آشنا کرا رہے تھے۔

آخر شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، اور شاہ محمد اسمٰعیل میں کتنا فاصلہ ہے؟ کیا اس درمیانی عرصہ میں سارا برصغیر کفر و شرک کی لپیٹ میں آ گیا تھا؟ اور اگر پہلے سے تھا تو خود حکیم الامۃ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز نے یہ تشدد اور یہ زبان کیوں استعمال نہ فرمائی؟

حقیقت تو یہ ہے کہ سوادِ اعظم کے مسلک سے ہٹ کر وہ پہلی آواز تھی جو برصغیر میں گونجی۔ جسے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک کی صدائے بازگشت تو یقیناً کہا جا سکتا ہے مگر اسے ولی اللّٰھی فکر اور معمولات کا ترجمان ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ (ص۱۸ و ۱۹۔ انفاس العارفین۔ مکتبہ الفلاح دیوبند، سہارن پور)

مشہور اہل حدیث عالم مولانا وحید الزماں حیدرآبادی (متولد ۱۲۶۷ھ۔ متوفی شعبان ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء) تحریر کرتے ہیں:

"ہمارے متاخرین بھائیوں نے شرک کے بارے میں بہت شدت اختیار کی

ہے اور اسلام کا دائرہ تنگ کر دیا ہے اور مکروہ یا حرام امور کو شرک قرار دیا ہے۔''

(اپنے اس متن پر خود ہی حاشیہ لکھتے ہیں) ''وہ شیخ محمد بن عبدالوہاب ہیں جنھوں نے ان امور کو شرک قرار دیا۔ جیسا کہ مکہ کی طرف ارسال کردہ ان کے بیٹے محمد اور پوتے عبداللہ کے مکتوب سے معلوم ہوتا ہے۔ اور مولانا اسمٰعیل شہید نے تقویۃ الایمان میں اکثر امور میں ان کی پیروی کی ہے۔'' (ص ۲۶۔ جلد اول۔ ھدیۃ المھدی۔ مولفہ نواب وحیدالزماں حیدرآبادی۔ مطبوعہ میور پریس دہلی)

''ہمارے اہل حدیث بھائیوں نے ابن تیمیہ، ابن قیم اور شوکانی اور شاہ ولی اللہ اور مولوی اسمٰعیل نوراللہ مرقدھم کو دین کا ٹھیکہ دار بنا رکھا ہے۔ جہاں کسی مسلمان نے ان بزرگوں کے خلاف کسی قول کو اختیار کیا بس اس کے پیچھے پڑ گئے۔ برا بھلا کہنے لگے۔
بھائیو! ذرا غور تو کرو اور انصاف کرو۔ جب تم نے ابوحنیفہ اور شافعی کی تقلید چھوڑی تو ابن تیمیہ اور ابن قیم اور شوکانی جو ان سے بہت متأخر ہیں ان کی تقلید کی کیا ضرورت ہے؟ (ص ۱۰۲۔ حیات وحیدالزماں مؤلفہ عبدالحلیم چشتی۔ مطبوعہ کراچی)

نقشبندی مجددی عالم دین شاہ ابوالحسن زید فاروقی دہلوی (متوفی ۱۹۹۳ء) لکھتے ہیں:

''حضرت مجدد (الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی) کے زمانہ سے ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء) تک ہندوستان کے مسلمان دو فرقوں میں بٹے رہے۔ ایک اہل سنت و جماعت، دوسرے شیعہ۔

اب مولانا اسمٰعیل دہلوی کا ظہور ہوا۔ وہ شاہ ولی اللہ کے پوتے، اور شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، اور شاہ عبدالقادر کے بھتیجے تھے۔ ان کا میلان محمد بن عبدالوہاب نجدی کی طرف ہوا۔ اور نجدی کا رسالہ ''رد الاشراک'' ان کی نظر سے گذرا۔ اور اردو میں انھوں نے ''تقویۃ الایمان'' لکھی۔ اس کتاب سے مذہبی آزادی کا دور شروع ہوا۔ کوئی غیر مقلد ہوا، کوئی وہابی بنا، کوئی اہل حدیث کہلایا، کسی نے اپنے کو سلفی کہا۔

ائمۂ مجتہدین کی جو منزلت اور احترام دل میں تھا وہ ختم ہوا۔ معمولی نوشت و خواند کے افراد امام بننے لگے۔ اور افسوس اس بات کا ہے کہ توحید کی حفاظت کے نام پر بارگاہِ نبوت کی تعظیم و احترام میں تقصیرات (بے ادبی و

گستاخی) کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

یہ ساری قباحتیں ماہ ربیع الآخر ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء) کے بعد سے ظاہر ہونی شروع ہوئیں۔ اس وقت کے تمام جلیل القدر علما کا دہلی کی جامع مسجد میں اجتماع ہوا اور ان حضرات نے بہ اتفاق اس کتاب کو رد کر دیا۔ (ص ۹ و ۱۰۔ مولانا اسمٰعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان، مؤلفہ مولانا ابوالحسن زید دہلوی۔ شاہ ابوالخیر اکیڈمی، چتلی قبر، دہلی۔ ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء)

مشہور دیوبندی عالم مولانا سید احمد رضا بجنوری لکھتے ہیں:

''افسوس ہے کہ اس کتاب (تقویۃ الایمان) کی وجہ سے مسلمانانِ ہندو پاک جن کی تعداد بیس کروڑ سے زیادہ ہے اور تقریباً نوے فی صد حنفی المسلک ہیں، دو گروہ میں بٹ گئے۔ (ص ۱۰۷۔ انوار الباری۔ جلد ۱۱۔ مرتبہ مولانا سید احمد رضا بجنوری۔ مطبوعہ ناشر العلوم بجنور، یوپی)

☆☆☆☆☆☆

رائے بریلی سے بالاکوٹ تک

ایک پرجوش اور پُرپیچ سفر

سید احمد رائے بریلوی (متولد صفر ۱۲۰۱ھ/نومبر ۱۷۸۶ء۔ متوفی ۲۴رذوالقعدہ/ ۱۲۴۶ھ/ ۶رمئی ۱۸۳۱ء) حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کے شاگرد تھے۔ چھ سات سال (۱۸۱۱ء تا ۱۸۱۸ء) تک وہ امیر خاں والی ٹونک کی فوج میں ملازم رہے۔ وہاں ان کے بھائی سید ابراہیم پہلے سے ملازم تھے۔ وہاں سے واپسی کے بعد ایک قافلہ کے ساتھ سفر حج کیا پھر رائے بریلی سے بالاکوٹ تک کا اپنا سفر جہاد شروع کیا۔

شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی (متولد صفر ۱۱۹۳ھ/ مارچ ۱۷۷۹ء۔ متوفی ۱۲۴۶ھ/مئی ۱۸۳۱ء) اور مولانا عبدالحی بڈھانوی (متوفی ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء) سید احمد رائے بریلوی صاحب کے مرید اور ان کی تحریک جہاد کے دست و بازو بنے۔

خانوادۂ صادق پور پٹنہ کے ایک فرد پروفیسر قیام الدین احمد ۱۹۶۱ء میں اپنے پیش کردہ مقالۂ ڈاکٹریٹ پٹنہ یونیورسٹی بہار مطبوعہ ہندوپاک کے اندر لکھتے ہیں کہ ——

''شاہ اسمٰعیل مذہبی عقائد میں انتہاپسندی کا رجحان رکھتے تھے اور غیر مقلد تھے۔ شاہ عبدالحیٔ نسبۃً اعتدال پسند اور مقلد تھے۔ (ص ۶۲۔ ہندوستان میں وہابی تحریک۔ مؤلفہ ڈاکٹر قیام الدین احمد۔ مطبوعہ مکتبۃ الفہیم مئوناتھ بھنجن۔ یوپی۔ سال اشاعت اگست ۲۰۰۱ء)

سید احمد رائے بریلوی نے ایک قافلے کے ساتھ شوال ۱۲۳۶ھ/ جولائی ۱۸۲۱ء میں رائے بریلی، بنارس، غازی پور، بکسر، پٹنہ، کلکتہ ہوتے ہوئے سفر حج کیا۔ صفر ۱۲۳۹ھ/ اکتوبر ۱۸۲۳ء میں کلکتہ واپسی ہوئی۔ ۲۹رشعبان ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء کو رائے بریلی پہنچے اور اپنے وعظ و تبلیغ کا دو سال تک مختلف مقامات پر سلسلہ جاری رکھا۔

جمادی الآخرہ ۱۲۴۱ھ/ جنوری ۱۸۲۶ء میں رائے بریلی سے روانہ ہوکر فتح پور، گوالیار، ٹونک، سندھ، بلوچستان ہوتے ہوئے نومبر ۱۸۲۶ء میں پشاور پہنچ گئے۔ اور اس علاقہ میں اپنی ایک حکومت کے قیام کے لئے وعظ و تبلیغ، نام و پیام اور حرب و ضرب کی کارروائی شروع کی۔

پنجاب میں سکھ مظالم کا جائزہ لینے کے لئے شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی اپنے طور پر ایک خفیہ دورہ کر چکے تھے۔ وہاں مسلمان سکھوں کے جور و ستم سے عاجز تھے۔ اور حالات ایسے تھے کہ

''بڑی بات یہ تھی کہ سکھوں کے قابل رحم مظالم سے سب چیخ اٹھے تھے اور خدا سے چاہتے تھے کہ کوئی منتقم پیدا ہو تو ہم اس کی مدد کریں۔ (ص ۲۳۳۔ حیات طیبہ از مرزا حیرت دہلوی۔ مطبوعہ اسلامی اکیڈمی، اردو بازار لاہور۔ اگست ۱۹۷۶ء)

یہی وجہ ہے کہ سرحد و پنجاب کے مسلمانوں نے اس فوجی قافلہ کا استقبال کیا اور مذہبی جوش و جذبہ کے ساتھ ابتدائی مراحل میں بھرپور ساتھ دیا۔ پے در پے سکھوں سے مقابلہ میں داد شجاعت دی۔ چنانچہ چوتھی جنگ جب سکھوں سے ہوئی تو

''اس اتفاقیہ فتح کے بعد سید صاحب مع اپنے کل جاں نثاروں کے نوشہرہ آ گئے۔ یہاں سردارانِ پشاور بیس ہزار فوج لیے ہوئے سید صاحب کی مدد کے لئے تیار کھڑے ہوئے تھے۔ (ص ۲۴۵۔ حیات طیبہ از مرزا حیرت دہلوی)

پروفیسر قیام الدین احمد لکھتے ہیں —— ''سید احمد کی لڑائیاں زیادہ تر ان علاقوں میں جو اَب اضلاعِ ہزارہ، پشاور پر مشتمل تھے اور سوات و بنیر کے ملحقہ قبائلی علاقوں میں لڑی گئیں۔ یہ لڑائیاں دو قسموں پر تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ (۱) سکھوں کے خلاف (۲) ان مقامی سرداروں کے خلاف جو غدار ہو گئے تھے۔ (ص ۸۲۔ ہندوستان میں وہابی تحریک۔ مؤلفہ ڈاکٹر قیام الدین احمد)

سید احمد ۱۲رجمادی الآخری ۱۲۴۲ھ/فروری ۱۸۲۷ء کو امام منتخب کیے گئے۔ (ص ۸۴۔ حوالۂ مذکورہ)

بالاکوٹ میں مسلمانوں اور سکھوں سے جنگ کرتے ہوئے سید احمد رائے بریلوی و شاہ اسمٰعیل دہلوی ۱۲۴۶ھ/مئی ۱۸۳۱ء میں جاں بحق ہو گئے۔ جس کے بعد ان کے مجاہدین پندرہ سال تک انتشار و گم نامی کی زندگی گذارتے رہے۔ اور وہ کسی محاذ آرائی کی پوزیشن میں نہ ہو سکے۔ تاہم سید احمد رائے بریلوی کی ''غیوبت'' جس کا ذکر بعد میں آ رہا ہے اس کے سہارے یہ اپنی تنظیم نو کی کوشش کرتے رہے۔ ادھر مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے ۹رمارچ ۱۸۴۶ء کو انگریزوں اور

سکھوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے سکھوں کے وہ علاقے انگریزوں کے زیرنگیں آ گئے جن پر ۱۸۴۵ء ہی سے انگریز عملاً قابض و حاکم ہو گئے تھے۔

اس معاہدے سے کچھ پیشتر کا حال بیان کرتے ہوئے پروفیسر قیام الدین احمد لکھتے ہیں:

''سرحد کے فسادزدہ علاقوں پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے انگریز سرگرمی سے سکھ حکام اور گلاب سنگھ کی مدد کر رہے تھے۔ دربار لاہور کا انگریز ریزیڈنٹ ہنری لارنس اور اس کی ماتحتی میں ربوٹ، ایڈورڈز، ٹیلر وغیرہ جوشیلے جوان افسر درحقیقت ان علاقوں میں انگریزی حکومت کی بنیاد ڈال رہے تھے۔ (ص ۱۴۹۔ ہندوستان میں وہابی تحریک)

ان حالات میں انگریزوں اور تحریک بالاکوٹ کے مجاہدوں و بالفاظِ دیگر وہابیوں کے درمیان آویزش شروع ہوئی اور جھڑپ بھی ہوئی جن میں شریک ایک شخص عبداللہ ولد جان علی (حاجی پور، مظفر پور، بہار) مرید ولایت علی صادق پوری نے ۱۲؍اکتوبر ۱۸۶۹ء کو اسسٹنٹ کمشنر راول پنڈی، پنجاب کے سامنے بیان دیا اور بتایا کہ لاٹ صاحب (ایچ، ایم، لارنس ریزیڈنٹ لاہور) کے سامنے جب (مارچ ۱۸۴۷ء) ولایت علی، عنایت علی، مقصود علی، فیاض علی، یحییٰ علی پیش ہوئے تو ان سے لاٹ صاحب نے فرمایا!

''یہ ملک تو انگریزوں کا ہے۔ اب تم کیا کرو گے؟

انھوں نے کہا! ہم کابل چلے جائیں گے۔

مگر لاٹ صاحب نے کہا! وہ ملک کابل تک یاغستان (آزاد) ہے۔ وہاں چلے جاؤ گے تو پھر سازش کرو گے اور انگریزوں سے لڑنے لگو گے۔ اس لئے میں تم کو وہاں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

تب انھوں نے حکم صادر کیا کہ ہم اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں۔ اس پر ہم لوگ منتشر ہو گئے۔

مولوی ولایت علی، عنایت علی، مقصود علی اور یحییٰ علی اپنے اپنے گھر عظیم آباد لوٹ گئے۔ اور ایک مچلکہ سے وہ پابند کر دیے گئے کہ چار سال تک پٹنہ نہ چھوڑیں۔

میں بھی اپنے گھر حاجی پور (بہار) چلا گیا۔ وہاں ایک مکان بنایا اور دانا پور (پٹنہ) میں شادی کر لی۔ (ص ۱۵۵۔ ہندوستان میں وہابی تحریک)

دہلی و پٹنہ کلکتہ وغیرہ سے سرحد کے لئے جو رقم بھیجی جاتی تھی وہ ہندو ساہوکاروں کے ذریعہ بھجوائی جاتی تھی۔

''اور یہ امر قابل توجہ ہے کہ یہ ہندو مہاجنوں کے ذریعہ ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں پٹنہ کے رام کشن، فتح چند، منوہر داس، دہلی کے جگن ناتھ اور مکند لال، بنارس کے لالہ چند کرم سنگھ، سامنت رائے، شیو بخش، منورا، اور سرحد کے سنتو اور موتی کے نام موجود ہیں۔ (ص ۱۹۱۔ ہندوستان میں وہابی تحریک)

الحاق پنجاب و سرحد کے بعد جب سکھ طاقت منظر نامہ سے غائب ہو گئی اور انگریز بکمل طور پر برسر اقتدار آ گئے تو بعض چھوٹے موٹے واقعات سے قطعِ نظر باضابطہ جو کچھ ہوا وہ یہ ہے۔

''معرکوں کا دوسرا سلسلہ حکومت برطانیہ کے خلاف کچھ بعد میں شروع ہوا اور ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۳ء تک جاری رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ سرحد پر وہابیوں کا یہ ننھا سا منبع ایسی طاقت کا حامل تھا جو ایک سیاسی خطرہ بن گیا اور برطانوی حکومت کے لئے ۱۸۵۲ء سے بیس سال تک کے لئے سخت پریشانیوں کا باعث بنا رہا۔ (ص ۲۱۵۔ ہندوستان میں وہابی تحریک)

۱۸۶۳ء میں امبیلہ کی انگریز وہابی لڑائی نے وہابی عسکری قوت کی کمر توڑ دی۔ پھر مقدمۂ انبالہ ۱۸۶۴ء و مقدمہ پٹنہ ۱۸۶۵ء نے اس کے سرگرم امیروں (محمد جعفر تھانیسری و یحییٰ علی صادق پوری و مولوی احمد اللہ صادق پوری وغیرہ) کے دار و گیر اور کالا پانی کی سزا نیز ضبطیِ جائداد کے ساتھ اس سیاسی تحریک کو پٹنہ اور صوبہ سرحد ہر جگہ سرد اور بے جان کر دیا

ڈاکٹر قیام الدین کی تحقیق یہ ہے کہ وہابیوں کا ایک گروہ عنایت علی کے زیر کمان ۱۸۵۲۔۵۸ء میں سرحد پر مصروف جنگ تھا اور ہندوستان بالخصوص بہار کے وہابی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے دور رہے کیوں کہ اگر یہ اس میں الجھ جاتے تو ان کا سرحدی نظام اور سرمایہ کی وصولی تحصیلی معرض خطر میں پڑ جاتی اور وقت سے پہلے ان کا سرحدی جہاد اور سارا منصوبہ خاک میں مل جاتا۔

''واقعات کے پیش نظر ماننا پڑتا ہے کہ وہابی قائدین نے سیاسی صورت حال کا جو اندازہ لگایا تھا وہ صحیح تھا۔ اگر وہابی بہار میں علانیہ محاربہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تو وہ بھی کچل دیے جاتے۔ اور تحریک اس سے بہت پہلے ختم ہو چکی ہوتی جب کہ واقعی ختم ہوئی۔

دبے رہنے کے سبب وہابی ۱۸۵۷۔۵۹ء کے شدید طوفان سے بچے رہے۔ پٹنہ کا مرکز

کے غزوۂ امبیلہ میں جب کہ وہابیوں نے سب
پہلے کی طرح برقرار رہا اور کام کرتا رہا۔ اور ۱۸۶۳ء
سے شدید جنگ کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔
اگر وہابی بہار میں ۱۸۵۷ء میں وہ نہ کرتے جو کیا تو ۱۸۶۳ء کا معرکۂ امبیلہ وقوع پذیر نہ
ہوتا۔ مگر اس طرح پٹنہ مرکز کو زندگی کا جو نیا پٹہ ملا وہ بہت مختصر تھا۔
سچ یہ ہے کہ تمام مادی سہارے کے لئے وہابیوں کا ہندوستان کے مرکزوں پر کامل انحصار ہی
تحریک کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ (ص ۲۵۹ و ۲۶۰۔ ہندوستان میں وہابی تحریک)
ڈاکٹر قیام الدین نے وہابی تحریک کی فوجی کارروائی کو دو حصوں اور دو ادوار میں تقسیم کیا
ہے۔ (۱) پٹھانوں اور سکھوں کے ساتھ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۱ء تک جنگ جب کہ سید احمد و شاہ
اسمٰعیل بقید حیات تھے۔ (۲) تقریباً ۱۸۴۵ء سے ۱۸۶۳ء تک خلفائے سید احمد کی امارت میں
انگریزوں سے چھوٹی موٹی جھڑپیں اور جنگ امبیلہ (در ۱۸۶۳ء)۔
چنانچہ وہ لکھتے ہیں:— ''وہابی انگریزوں کے خلاف جو لڑائیاں لڑے ان میں سے بعض کا
بیان اوپر کیا گیا۔ یہ بھی دکھایا جا چکا ہے کہ جب سکھوں کا وجود ایک سیاسی وحدت کی حیثیت سے
ختم ہو چکا تھا اس کے بعد بھی مدت دراز تک ان کی حربی کشمکش جاری رہی۔
گویہ بھی صحیح ہے کہ سید احمد کے حین حیات میں سرحد شمالی مغربی کو بنیادِ عمل منتخب کر لیا گیا تھا اور
پہلا دور سکھوں ہی کے خلاف پیکار سے شروع ہوا تھا۔ (ص ۳۴۷۔ ہندوستان میں وہابی تحریک)
''۱۸۴۵ء سے لے کر غزوۂ امبیلہ کے اختتام تک انگریزوں کے خلاف لڑائیوں کے سلسلے
میں شاید ہی کوئی مذہبی مسئلہ سامنے آیا ہو۔ اس کے برخلاف اس زمانے میں اور اس کے بعد تک
بھی وہابی انگریزوں کے لئے خالصۃً سیاسی خطرہ بنے رہے۔ (ص ۳۵۷۔ حوالۂ مذکورہ)
''یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت نے جن تحریکوں کو جنم دیا ان میں
وہابی تحریک سب سے زیادہ بے دردی اور سختی سے انگریز مخالف تھی۔ اور ان کی تمام جدوجہد میں یہ
صورت قائم رہی۔

Civil Disturbences During the British Rule in
India-p50, (Calcatta,1955)

(ص ۳۵۹۔ ہندوستان میں وہابی تحریک)

سید احمد رائے بریلوی صاحب (متوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) اور شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی (متوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کی قیادت میں جو قافلہ ۱۸۲۶ء میں سکھوں سے جنگ کرنے کی نیت سے سرحد کے لئے روانہ ہوا اس میں بہت سے مسلمان جوشِ جہاد میں شریک ہو گئے تھے۔ وہاں سرحد و پنجاب میں جتنی چھوٹی بڑی جنگیں ۱۸۳۱ء تک ہوئیں وہ صرف پٹھانوں اور سکھوں سے لڑی گئیں۔ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۱ء تک کسی انگریز سے جنگ و تصادم تو کجا معمولی سے معمولی جھڑپ کا کوئی چھوٹے سے چھوٹے واقعہ بھی رونما نہیں ہوا۔ بالاکوٹ کی سرزمین پر ۲۴/ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ/ ۷/مئی ۱۸۳۱ء کو پٹھانوں اور سکھوں کی مشترکہ یلغار کے نتیجے میں مذکورہ دونوں حضرات اپنے بہت سے عقیدت مند فوجیوں کے ہمراہ جاں بحق ہوئے۔

سرحدی پٹھان یا سکھ یا قافلہ کے افراد مجروح ہوں کہ مقتول ہر صورت میں انگریزوں کا فائدہ تھا۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ اتنے بڑے قافلہ کی از رائے بریلی تا سرحد و پنجاب کسی نقل و حرکت پر انگریزی حکومت نے کوئی گرفت نہیں کی بلکہ حوصلہ افزائی کے واقعات تاریخ کی کتابوں میں جا بجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اور یہ واقعات و حالات سید احمد و شاہ اسمٰعیل صاحبان کے مخالفین و معاندین نہیں بلکہ ان کے معتقدین نے تحریر کیے ہیں جن کے بیان پر شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ ذیل میں چند تاریخی حقائق و بیانات درج کیے جا رہے ہیں جن کا مطالعہ کر کے اصل نتائج آپ خود اخذ کر سکتے ہیں۔

''سید صاحب کی برابر یہ روش رہی کہ ایک طرف لوگوں کو سکھوں کے مقابل آمادۂ جہاد کرتے اور دوسری جانب حکومت برطانیہ کی امن پسندی جتا کر لوگوں کو اس کے مقابلے سے روکتے۔ (ص: ۲۵۲۔ الدر المنثور۔ از مولوی عبدالرحیم صادق پوری، مطبوعہ ہادی المطابع کلکتہ)

''کلکتہ میں جب مولانا اسمٰعیل نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا اور سکھوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی ہے تو ایک شخص نے دریافت کیا! آپ انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے؟ آپ نے جواب دیا:

ان پر جہاد کسی طرح واجب نہیں ہے۔ ایک تو ان کی رعیت ہیں۔ دوسرے ہمارے مذہبی ارکان ادا کرنے میں وہ ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے۔ ہمیں ان کی حکومت میں ہر طرح آزادی ہے۔ بلکہ اگر ان پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی

گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں۔ (ص ۴۲۴۔ حیات طیبہ۔ مرتبہ مرزا حیرت دہلوی۔ مطبوعہ لاہور۔ ۱۹۷۶ء۔ (حیات طیبہ کی پہلی طباعت ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں دہلی سے ہوئی تھی) وص: ۳۰۷۔ تواریخ عجیبہ۔ مرتبہ محمد جعفر تھانیسری۔ مطبع فاروقی دہلی)

''اثنائے وعظ میں کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ تم انگریزوں پر جہاد کا وعظ کیوں نہیں کہتے؟ وہ بھی تو کافر ہیں؟

اس کے جواب میں مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے فرمایا کہ:

انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں کو کچھ اذیت نہیں ہوتی۔ اور چوں کہ ہم ان کی رعایا ہیں اس لئے ہم پر اپنے مذہب کی رُو سے یہ بات فرض ہے کہ انگریزوں پر جہاد کرنے میں ہم کبھی شریک نہ ہوں۔

پس اس زمانے میں ہزاروں مسلّح مسلمان اور بے شمار سامانِ جنگ کا ذخیرہ سکھوں پر جہاد کرنے کے واسطے ہندوستان میں جمع ہوگیا۔ (ص ۱۴۲۔ مقالات سرسید، حصہ نہم۔ مطبوعہ لاہور)

''سید صاحب کے پاس مجاہدین جمع ہونے لگے تو سید صاحب نے مولانا اسمٰعیل شہید کے مشورے سے شیخ غلام علی رئیس الہ آباد کی معرفت لفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی شمالی کی خدمت میں اطلاع دی کہ ہم لوگ سکھوں پر جہاد کرنے کی تیاری کرنے کو ہیں۔ سرکار کو تو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے؟ لفٹنٹ گورنر صاحب نے صاف لکھ دیا کہ ہماری عمل داری میں اور امن میں خلل نہ پڑے تو ہمیں کچھ سروکار نہیں نہ ہم ایسی تیاری کے مانع ہیں۔ یہ تمام بیّن ثبوت صاف صاف اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ جہاد صرف سکھوں ہی کے لئے مخصوص تھا۔ سرکار انگریزی سے مسلمانوں کو ہرگز مخالفت نہ تھی۔ (ص ۳۰۲۔ حیات طیبہ از مرزا حیرت دہلوی)

''آپ کی سوانح عمری اور مکاتیب میں بیس سے زیادہ ایسے مقامات ہیں جہاں کھلے کھلے اور اعلانیہ طور پر سید صاحب نے بدلائل شرعی اپنے پیرو لوگوں کو سرکار انگریزی کی مخالفت سے منع کیا ہے۔ (ص: ۲۲۶۔ سوانح احمدی۔ از محمد جعفر تھانیسری۔ مطبوعہ اسٹیم پریس۔ لاہور)

''اس سوانح اور مکتوباتِ منسلکہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کا سرکار انگریزی سے جہاد کرنے کا ارادہ ہرگز نہ تھا۔ وہ اس عمل داری کو اپنی ہی عمل داری سمجھتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اگر سرکار انگریزی اس وقت سید صاحب کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے

سید صاحب کو کچھ مدد نہ پہنچتی۔ مگر سرکار انگریزی اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔ (ص: ۱۸۲۔ تواریخ عجیبہ۔ از محمد جعفر تھانیسری)

''جب صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو اس امر کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے گورنمنٹ کو اطلاع دی۔ گورنمنٹ نے ان کو صاف لکھا کہ تم کو اس معاملے میں دست اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں کہ ان کا ارادہ کچھ انگریز گورنمنٹ کے مقاصد کے خلاف نہیں ہے۔ (ص: ۱۴۲۔ ج ۹۔ مقالات سرسید۔ مجلس ترقی ادب لاہور)

سرسید احمد خاں (متوفی مارچ ۱۸۹۸ء) اپنے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' مطبوعہ ۱۸۵۸ء میں لکھتے ہیں:

''بیس تیس برس پیشتر ایک بہت بڑے نامی مولوی محمد اسمٰعیل نے ہندوستان میں جہاد کا وعظ کیا۔ اور آدمیوں کو جہاد کی ترغیب دی۔ اس وقت انھوں نے صاف بیان کیا کہ ہندوستان کے رہنے والے جو سرکار انگریزی کی امن میں رہتے ہیں ہندوستان میں جہاد نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہزاروں آدمی جہادی ہر ضلع ہندوستان میں جمع ہوئے اور سرکاری عمل داری میں کسی طرح کا فساد نہیں کیا اور غربی سرحد پنجاب پر جا کر لڑائی کی۔

(ص: ۸۱۰۔ حیات جاوید از خواجہ الطاف حسین حالی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی۔ طبع پنجم ۲۰۰۴ء)

نواب صدیق حسن خاں بھوپالی (متوفی جمادی الآخرۃ ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) لکھتے ہیں:

''نہ انھوں نے سرکار انگریزی سے کبھی جہاد کیا اور نہ ہندوستان میں جہاد کا فتویٰ لکھا...... تقویۃ الایمان مؤلفہ مولوی اسمٰعیل دہلوی ہے۔ اس میں ذکر رد شرک و بدعت کا ہے۔ کہیں وہابیوں کا اور مسئلہ جہاد کا پتہ بھی نہیں۔

...... گورنمنٹ اگر ساری کتابوں کو جمع فرما کر ملاحظہ کرے گی تو کسی کتاب میں ان کتب سے مسئلہ جہاد کا یا بغاوت کا سرکار انگلشیہ سے یا فساد سکھانے والی کوئی بات نہیں پاوے گی۔ (ص ۵۲۔ ترجمان وہابیہ مؤلفہ نواب صدیق حسن بھوپالی مطبوعہ امرتسر، پنجاب)

مولانا فضل حسین بہاری (متوفی ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۶ء) شاگرد مولانا نذیر حسین دہلوی (متوفی

۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) لکھتے ہیں:

"آپ (شاہ اسمٰعیل) اپنے شیخ طریقت سید احمد صاحب کو امام تسلیم کر کے مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ جہاد کے لئے پنجاب پہنچے۔ گورنمنٹ انگلشیہ نے بھی آپ کے اس ارادے میں کسی طرح کی مزاحمت یا پیچیدگی پیدا نہیں کی۔ (ص ۱۳۴۔ الحیاۃ بعد المماۃ از فضل حسین بہاری، مطبوعہ الکتاب انٹرنیشنل بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی ۲۵)

مولانا محمد حسین بٹالوی (متوفی ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء) شاگرد مولانا نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/

۱۹۰۲ء) لکھتے ہیں:

"سید صاحب، مولوی اسمٰعیل صاحب نے انگریزوں سے جہاد کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ اور مولوی اسمٰعیل صاحب نے کلکتہ میں اپنی مجلسِ وعظ میں برملا کہہ دیا کہ — ہم کو انگریزوں سے جہاد کرنا جائز نہیں۔ (ص ۵۔ ضمیمہ ۶۔ جلد ۲۔ اشاعۃ السنۃ لاہور از محمد حسین بٹالوی)

سکھ مخالف مہم کو انگریز مخالف مہم کی شکل دینے کی کوشش کرتے ہوئے "جہاد کا مقصد" کے ذیلی عنوان کے تحت مولانا حسین احمد مدنی (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) بحوالہ ماہنامہ برہان دہلی جلد ۲۱۔ اگست ۱۹۴۸ء لکھتے ہیں:

"لیکن اس جہاد سے سید صاحب کا مقصد ملک گیری اور کوئی دنیوی منفعت بالکل نہیں تھا۔ چنانچہ اپنے خطوط اور خطبات و مواعظ میں آپ بار بار اس کا تذکرہ فرماتے تھے۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری جو حضرت سید صاحب کے نہایت مستند سوانح نگار ہیں، لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ ایک سوال کے جواب میں سید صاحب نے صاف صاف فرمایا کہ:

کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ مذہبی فرائض ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکات مستوجبِ جہاد سے باز آجائیں تو ہم کو ان لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ (سوانح احمدی۔ ص: ۷۰)

ہندوستان کی یہ بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ سید صاحب کو مسلمانانِ پنجاب کی حد درجہ پامالی و زبوں حالی کے باعث مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بالمقابل صف آرا ہونا اور آخر کار معرکۂ بالاکوٹ میں جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ ورنہ اصل یہ ہے کہ سید صاحب کا اصل مقصد ہندوستان کے ہندو اور

مسلمان کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط واقتدار سے نجات دلانا تھا۔

انگریز خود اسے محسوس کرتے تھے اور اس تحریک سے بڑے خوف زدہ تھے۔ اسی بنا پر جب سید صاحب کا ارادہ سکھوں سے جنگ کرنے کا ہوا تو انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا اور جنگی ضرورتوں کے مہیا کرنے میں سید صاحب کی مدد کی۔

سید صاحب کا اصل مقصد چوں کہ ہندوستان سے انگریزی تسلط واقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے اس بنا پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی اور اس میں صاف صاف انھیں بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے پردیسی لوگوں کا اقتدار ختم کردینا ہے۔ اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی اس سے آپ کو غرض نہیں۔ جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے۔

(ص: ۱۹۔ حصہ دوم نقش حیات از مولانا حسین احمد مدنی۔ مکتبہ دینیہ دیوبند ۱۹۹۹ء)

سکھوں کے خلاف سید احمد رائے بریلوی کی تحریک کو انگریز مخالف ثابت کرنے کے لئے دو خطوط عام طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ یہی دونوں خطوط مولانا حسین احمد مدنی نے بھی ص ۲۰۔ اور ص ۲۱ نقش حیات دوم میں پیش کیے ہیں۔

گوالیار کے ہندو راؤ کے نام خط میں ہے:

بیگانگانِ بعید الوطن ملوکِ زمین و زماں گردیدہ و تاجرانِ متاع فروش بپایۂ سلطنت رسیدہ امارت امرائے کبار و ریاست رؤسائے عالی مقدار برباد نمودہ اند و عزت و اعتبار ایشاں بالکل ربودہ۔ الخ (از کتاب "مسلمانوں کے زوال سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا؟ ص ۲۷۴۔ مصنفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

ریاست گوالیار کے ایک مسلم عہدہ دار غلام حیدر خاں کے نام ایک خط ہے (بحوالہ مجموعہ خطوطِ قلمی ص ۱۴)

اکثر بلادِ ہندوستان بدستِ بیگانگاں افتادہ وایشاں ہر جا بنیادِ ظلم و جور نہادہ۔ الخ

ان دونوں خطوط کو اگر بلا چون و چرا مکمل صحیح مان لیا جائے تو ان کا خلاصہ یہ ہے کہ بیگانگانِ بعید الوطن یعنی انگریز ہمارے ملک پر حاکم ہو گئے ہیں۔ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کے لئے کمر بستہ ہوئے ہیں۔ یہ انگریز جب یہاں سے واپس چلے جائیں گے تو ہمیں ریاست و امارت و حکومت

سے کوئی مطلب اور سروکار نہ ہوگا۔ ہندو مسلمان میں سے جوحکومت کے اہل ہوں گے وہ حاکم
بنیں گے۔ یہی نتائج خود مولانا حسین احمد مدنی نے بیان کیے ہیں۔

اب ایسی صورت میں اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسی پُر پیچ اسلامی تحریک اور کیسا بے
مقصد جہاد ہے؟ اور دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر سید احمد رائے بریلوی وشاہ اسمٰعیل دہلوی نے
مذہبی فرض کہہ کر انگریزوں کے تعلق سے جو مؤیدانہ اور وفادارانہ بیانات دیے ہیں ان کی مذہبی
حیثیت کیا ہے؟ اور تیسرا سوال یہ ہے کہ اولین سوانح نگاروں کے بیانات انگریز حامی اور وفاداری
حکومت انگلینڈ کے ترجمان ہیں۔ ایسی صورت میں مذہب وسیاست کی کوئی بنیاد سلامت نہیں
رہتی اور ان کے تضاد وتصادم کو ختم کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

پھر ایک اہم سوال ہر حال میں تشنۂ جواب ہے کہ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۱ء تک کی پرجوش
سرگرمیوں کے نتیجے میں نقصان صرف سکھوں، پٹھانوں اور عام مسلمانوں کا ہوا۔ انگریزوں کو نہ
صرف یہ کہ کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچا بلکہ ان کا زبردست فائدہ ہی ہوا کہ ایک طاقتور محاذ اور
انگریزوں کے خلاف عسکری جدوجہد کی صلاحیت جن لوگوں کے اندر نمایاں تھی وہ خود ہی آپس میں
لڑبھڑ کر بے جان ہوگئے۔ گھوم پھر کر بات جہاں تھی وہیں رہ جاتی ہے۔

اردو کے مشہور محقق ومؤرخ محمود شیرانی لکھتے ہیں:

''سید صاحب کے سرحد پہنچنے کے وقت پنجاب وسرحد میں انگریز کا نام ونشان تک نہ تھا۔
پھر سید صاحب نے انگریز سے کدھر بغاوت کی؟ سید صاحب کی تحریک ہندوستان میں شروع
ہوئی اور ہندوستان میں پروان چڑھی۔ اور یہ سب کچھ انگریز کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔
چوں کہ تحریک سکھوں کے خلاف تھی اس لئے کمپنی نے دانستہ نظر انداز کیا۔ اور اپنے علاقے
میں اس تحریک کو دبانے کی کوشش نہیں کی۔ (ص ۲۴۸۔ شیرانی نمبر مجلۂ تحقیق جلد ۳۔ شمارہ ۲۔ پنجاب
یونیورسٹی لاہور)

بہر حال ''ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک'' اور اس کے ''جہاد'' کا یہ عجیب وغریب نصب
العین قابل غور ہے۔

''ہندوؤں سے اختلافِ مذہب کی بنا پر آپ کو پرخاش تو کیا ہوتی آپ کمپنی کے ہاتھوں
مظلومیت وپامالی میں ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں شریک جانتے تھے اور جہاد سے آپ کی

غرض دونوں ہی کو اجنبی اقتدار کی مصیبت سے نجات دلانا تھا۔

کامیاب ہونے کے بعد ہندوستان میں ملکی حکومت کا نقشہ کیا ہوگا اس کا فیصلہ آپ طالبینِ
مناصب ریاست وحکومت پر چھوڑتے ہیں۔ مگر ہندوؤں کو یہ اطمینان ضرور دلاتے ہیں کہ وہ سید
صاحب کی کوششوں کو اپنی ریاست کی بنیاد کے مستحکم ہونے کا باعث سمجھیں اور پھر سید صاحب کا
ہندو ریاستوں کو مدد اور شرکتِ جنگ کی دعوت دینا اور اپنے توپ خانہ کا افسر راجہ رام راجپوت کو
مقرر کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ہندوؤں کو اپنا محکوم نہیں بلکہ شریک حکومت بنانا چاہتے
تھے۔ (ص: ۲۲۔ حصہ دوم نقش حیات از مولانا حسین احمد مدنی)

ڈاکٹر قیام الدین احمد اپنے مقالۂ ڈاکٹریٹ پٹنہ یونیورسٹی بہار (۱۹۶۱ء) میں لکھتے ہیں:

> ''یہ امر قابل غور ہے کہ سید احمد کے مکتوب کے طومار میں ہندوؤں کی طرف
> کوئی معاندانہ اشارہ یا کوئی ایسا حوالہ نہیں جس سے اس تحریک کا ہندوؤں
> کے من حیث ہندو ہونے کے خلاف ہونا ظاہر ہو۔
> اس کے برخلاف ان کا ایک معنی خیز مکتوب ایک با اثر ہندو سردار ہندو راؤ
> گوالیار کے نام ہے جس میں اسے یقین دلایا ہے کہ جب انگریزوں کو
> شکست ہو جائے گی تو کچھ شرائط کے ساتھ ہندو حکمراں سرداروں کے
> اختیارات بحال کر دیے جائیں گے۔
> سید احمد نے لکھا تھا— ''جوں ہی ارض ہندوستان غیر ملکی دشمنوں سے
> پاک ہو جائے اور اہل ہند کی جدوجہد سے ان کا مقصد حاصل ہو جائے،
> ریاست اور منتظمہ کے عہدے اور ملازمتیں مستحقین کو دے دی جائیں گی
> اور ان کی طاقت اور اختیارات کی بنیاد مستحکم ہو جائے گی۔''

سید احمد نے اس کو مزید فہمائش کی کہ ان رضا کاروں کے خاندان کی نگرانی کرے اور مدد
دے جو ان کے ساتھ سرحد کو ہجرت کر کے آ گئے ہیں۔ سید احمد کا ہندو راؤ کو متذکرہ یقین دہانی ہی
نہیں بلکہ ٹھوس امداد کا مطالبہ نہایت معنی خیز اور غور طلب ہے۔

متعدد ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ وہابیوں نے جو چندے جاری کیے تھے ان میں ہندوؤں
نے بھی شرکت کی۔ ریہا تیک نے بمبئی کے ایک جلسے کے واقعہ پر تعجب کا اظہار کیا ہے ''جس میں

ایک وہابی مقرر کے سامعین میں زیادہ تر ہندو تھے۔ اور مقرر نے عیسائی مذہب کے متعلق اپنے
خیالات کا اظہار کیا تھا۔ (جنرل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی، جلد ۱۴۔ ص ۳۶۳)
یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سرحد کو روپے بھیجنے کا نہایت راز دارانہ اور خطرناک کام ان
ساہوکاروں کی معرفت ہوتا تھا جن میں بہت سے ہندو تھے۔" (ص ۳۵۰ و ۳۵۱۔ ہندوستان میں
وہابی تحریک۔ از قیام الدین احمد۔ مکتبہ الفہیم، مئوناتھ بھنجن، یوپی ۲۰۰۱ء)

مولانا حسین احمد مدنی (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) لکھتے ہیں:

"شاندار ماضی جلد ۳ ص ۶۸ میں ہے۔
"براہِ دور اندیشی شیخ غلام علی صاحب رئیس اعظم الٰہ آباد کی معرفت گورنر
اضلاع شمالی و مغربی کو اس تیاری جہاد کی اطلاع دے دی گئی تھی جس کے
جواب میں گورنر نے کہا تھا۔ جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ و فساد
کا اندیشہ نہ ہو ہم ایسی تیاری سے مانع نہیں۔"

ممکن ہے کہ مذکورہ بالا امور کے علاوہ دوسری سیاسی مصلحتیں بھی ہوں مگر......؟

"بہر حال! انگریزوں نے اس وقت سید صاحب کے اس علانیہ جہاد اور اس کی تیاری پر کوئی
رکاوٹ نہیں کی۔ البتہ ۱۸۳۱ء کے بعد سب کچھ کیا گیا۔ (ص: ۳۹۔ حصہ دوم نقش حیات مؤلفہ
مولانا حسین احمد مدنی)

مولانا محمد میاں لکھتے ہیں:

"انگریزی ڈپلومیسی کا یہ عجیب و غریب کرشمہ تھا کہ حضرت شہید کے لئے سکھوں پر حملہ
کرنے کی سہولتیں پیدا کیں اور پھر سکھ حکومت انگریزوں سے معاہدہ کے باعث مجبور تھی کہ حضرت
شہید کو راستہ نہ دیتی۔ اور جب حضرت شہید کی جمعیت ایک لاکھ سے متجاوز ہونے لگی تو آپ کی
جمعیت میں عقاید کے متعلق اختلاف پیدا ہوا یا کرادیا گیا۔ (ص ۱۹۴۔ مضمون "اسلامی حریت کا
علمبردار از محمد میاں۔ کتاب "شاہ اسمٰعیل" شہید مرتبہ عبداللہ بٹ)

"جب تک اس تحریک کا تعلق انگریزی مقبوضات سے صرف اتنا رہا کہ رینگروٹ بھرتی
کیے جائیں اور سرمایہ فراہم کیا جائے تو انگریزی حکومت کے ذمہ داروں نے اس کی طرف کوئی
التفات نہ کیا بلکہ بعض انگریزوں نے اس کی حمایت کی۔ (ص ۲۱۲۔ جلد دوم۔ علماء ہند کا شاندار

ماضی از سید محمد میاں مطبوعہ دہلی)

سید احمد صاحب رائے بریلوی امیر خاں (نواب ریاست ٹونک) کی فوج میں ملازم تھے۔
اس سلسلے میں تضاد بیانی اور تاریخ گری ملاحظہ فرمائیں۔

چوں کہ اِخفائے حال اور سَترِ احوال منظور تھا، خیال میں یہ آیا کہ اگر اہل دنیا کے لباس سے
ملبس ہو کر علم باطنی کی تحصیل اور تکمیل کی جاوے تو یہ ہجوم عوام کا جمعیت اوقات میں خلل انداز نہ
ہوگا۔ اس خیال سے ٹونک کی طرف تشریف لے گئے اور نواب امیر خاں کی رفاقت میں بسر کی۔
الخ (ص ۴۹۲۔ آثار الصنادید از سر سید۔ مطبوعہ اردو اکاڈمی دہلی ۲۰۰۰ء)

آپ بماہ جمادی الثانی ۱۲۲۴ھ اپنے متعلقین سے رخصت ہو کے جب شہر سے باہر نکلے
ہیں تو یہ خیال آیا کہ کہاں جانا چاہیے اور کس جگہ نوکری کرنا نازیبا ہے؟

...... جب سید صاحب نے سواروں میں نام لکھوایا ہے تو آپ امیر خاں کے آگے پیش کیے
گئے وہ دیکھ کے بہت خوش ہوا۔

...... جب پے در پے سید احمد صاحب سے ظہور پذیر ہوئیں تو پھر امیر خاں نے اپنا مشیر
مقرر کرلیا اور کوئی کام بغیر آپ کے مشورہ کے نہ کرتا تھا۔ (ص ۴۱۶ تا ۴۱۸۔ حیات طیبہ از مرزا
حیرت دہلوی)

"۱۸۱۰ء میں ضروریاتِ معاشیہ کی بنا پر نواب امیر خاں والی ٹونک کی فوج میں ملازم
ہوگئے۔ (ص: ۲۶۔ نقش حیات دوم از مولانا حسین احمد مدنی)

"سید صاحب با قاعدہ مولوی تو نہیں بن سکے لیکن آپ نے روحانی کمالات پوری طرح
حاصل کیے۔ اور جب سیاسی حالات کا تقاضہ ہوا کہ ہر باشندۂ ملک انگریزوں کے خلاف جنگ جو
سپاہی بن جائے تو آپ کی سپاہیانہ طبیعت کی مناسبت سے شاہ عبدالعزیز صاحب نے آپ کو
نواب امیر علی خاں اور جسونت راؤ ہلکر کی فوج میں کام کرنے کے لئے بھیج دیا۔ (ص ۸۶، ۸۷۔
علمائے ہند کا شاندار ماضی حصہ دوم از مولانا سید محمد میاں)

۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء میں لکھی گئی اپنی کتاب میں سید احمد صاحب رائے بریلوی کے خاندانی
وارث مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (متوفی دسمبر ۱۹۹۹ء) لکھتے ہیں:

"اس کا کوئی تحریری ثبوت ابھی تک نہیں ملا ہے کہ حضرت سید صاحب،

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی صریح ہدایت اور حکم سے نواب امیر خاں کے لشکر میں تشریف لے گئے۔ لیکن اس کا قرینہ ضرور پایا جاتا ہے کہ یہ اقدام حضرت شاہ صاحب کے ایما یا کم از کم تائید و پسندیدگی پر ہوا۔ (ص ۱۷۱-۳۔ تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ۔ طبع پنجم ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء)

ایک حیرت انگیز کارگزاری کا انکشاف کرتے ہوئے مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں:

''۱۲۳۱ھ تک سید احمد صاحب امیر خاں کی ملازمت میں رہے مگر ایک نا موری کا کام آپ نے یہ کیا کہ انگریزوں اور امیر خاں کی صلح کرادی اور آپ ہی کے ذریعہ سے جو شہر بعد ازاں دیے گئے اور ان پر آج تک امیر خاں کی اولاد حکمرانی کرتی ہے، دینے طے پائے تھے۔

''لارڈ ہیسٹنگ، سید احمد صاحب کی بے نظیر کارگذاری سے بہت خوش تھا۔ دونوں لشکروں کے بیچ ایک خیمہ کھڑا کیا گیا اور اس میں تینوں آدمیوں کا باہم معاہدہ ہوا۔ امیر خاں، لارڈ ہسٹنگ اور سید احمد صاحب۔

سید احمد صاحب نے امیر خاں کو بڑی مشکل سے شیشے میں اتارا تھا۔ آپ نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ انگریزوں سے مقابلہ کرنا اور لڑنا بھڑنا اگر تمہارے لئے برا نہیں تو تمہاری اولاد کے لئے سم قاتل کا اثر رکھتا ہے۔ انگریزوں کی قوت دن بہ دن ترقی پذیر ہے اور تمام قومیں دن بہ دن تنزل کرتی جاتی ہیں۔ تمہارے بعد فوج کو کون سنبھالے گا؟ اور عظیم الشان لشکر انگلشیہ کے مقابل میں کون میدانِ جنگ میں لاکے جمائے گا؟

یہ باتیں امیر خاں کی سمجھ میں آ گئی تھیں اور وہ اب اس بات پر رضا مند تھا کہ گزارہ کے لئے کچھ ملک مجھے دے دیا جائے تو میں بآرام بیٹھوں۔ امیر خاں نے ریاستوں اور ان کے ساتھ انگریزوں کا بھی ناک میں دم کر رکھا تھا۔

آخر ایک بڑے مشورہ کے بعد سید احمد صاحب کی کارگذاری سے ہر ریاست میں سے کچھ کچھ حصہ دے کر امیر خاں سے معاہدہ کرلیا۔ جیسے جے پور سے ٹونک دلوایا اور بھوپال سے سرونج۔

اس طرح متفرق پرگنے ریاستوں سے بڑی قیل وقال کے بعد انگریزوں نے دلوا کر بپھرے ہوئے اس شیر کو حکمت سے پنجرے میں بند کر دیا۔ (ص ۴۲۱۔ حیات طیبہ از مرزا حیرت دہلوی)

قافلۂ بالاکوٹ کو ہر طرح کی سہولتیں دینے کے لئے حکومت انگلشیہ بے چین تھی جس کا ذکر کرتے ہوئے ایک ہندو مؤرخ پی سی جوشی نے اس طرح لکھا ہے:

''۱۸۲۰ء میں جب سید احمد بریلوی سکھوں کے ساتھ جنگ کے واضح مقصد کی تکمیل کے لئے کلکتہ گئے (کیوں کہ رنجیت سنگھ کی قلمرو میں اسلام پر پابندی عاید کی گئی تھیں) تو انگریز ان کی حوصلہ افزائی اور مدد کرنے کو بے تاب تھے۔ الخ...... (ص:۹۵۔ انقلاب ۱۸۵۷ء از پی سی جوشی۔ قومی کونسل نئی دہلی۔ طبع سوم ۱۹۹۸ء)

مولانا سید محمد میاں دیوبندی بھی یہ لکھنے پر مجبور ہیں کہ:

''(۱) شمال مغربی سرحد میں ایک آزاد حکومت قائم کرنے کے بعد جو اعلامیہ شایع کیا گیا اس کا ایک فقرہ یہ ہے۔

نہ با کسے از امراء مسلمین تنازعت داریم و نہ با یکے از رؤساء مومنین مخالفت۔ با کفار مقابلہ داریم نہ با مدعیانِ اسلام۔ صرف با دراز مویاں مقاتلہ۔ نہ با کلمہ گویاں و اسلام جویاں۔ و نہ با سرکار انگریزی مخاصمت داریم۔ و نہ راہِ تنازعت کہ از رعایائے او ہستیم بہ حمایتش از مظالم برایا۔ (سوانح احمدی۔ ص:۲۳۶)

ترجمہ: نہ کسی مسلمان حاکم سے ہمارا جھگڑا ہے نہ کسی مسلمان رئیس سے مخالفت۔ نہ غیر مسلموں سے مقابلہ ہے اور نہ مدعیانِ اسلام سے۔ ہماری جنگ صرف لابنے بال والوں سے ہے۔ نہ کہ کلمہ گو اور طالبانِ اسلام سے۔ اور سرکار انگریزی سے بھی ہماری مخالفت نہیں کیوں کہ ہم اس کی رعایا ہیں اور اس کی پناہ وحفاظت میں مظالم سے محفوظ ہیں۔

(۲) منشی محمد جعفر تھانیسری سوانح احمدی (ص:۹۱) میں تحریر فرماتے ہیں:

یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ جب آپ سکھوں سے جہاد کرنے کو تشریف لے جاتے تھے،

سکھوں سے جہاد کرنے کو جاتے ہیں، انگریز جو اس
کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ اتنی دور سکھوں سے جہاد کرنے کو جاتے ہیں، انگریز جو اس ملک
ملک کے حاکم ہیں وہ دین اسلام سے کیا منکر نہیں؟ گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک
ہندوستان لے لو۔ یہاں لاکھوں آدمی آپ کا شریک اور مددگار ہو جائے گا۔
سید صاحب نے جواب دیا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے۔ سکھوں
سے جہاد صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے ہیں۔ اور اذان وغیرہ فرائض
مذہبی ادا کرنے سے مزاحم ہوتے ہیں.......... اور سرکار انگریزی گو منکر اسلام ہے مگر مسلمان پر
کچھ ظلم و تعدی نہیں کرتی نہ ان کو اداء عبادت سے روکتی ہے۔ (ص: ۲۳۶ و ۲۳۷ حصہ دوم۔
علمائے ہند کا شاندار ماضی۔ از مولانا سید محمد میاں۔ کتابستان دہلی)

اپنے مخالف علما وامرائے سرحد و پنجاب کے بارے میں سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسمٰعیل
دہلوی کا سلوک یہ تھا کہ:

> ”منافقین کے ساتھ جہاد کا بحکم ”مقدمۃ الواجب“ ایک واجب معاملہ
> ہے اس لئے خاکسار سچے مسلمانوں کے ساتھ شہر پشاور اور قرب و جوار
> سے بدکردار منافقوں کی گندگی کو پاک کرنے کا مصمم ارادہ کر کے موضع
> پنجتار تک پہنچ گیا ہے۔ (ص ۱۳۵۔ مکتوبات سید احمد شہید۔ مکتوب سید احمد
> بنام سردار میر عالم خاں باجوڑی)

> ”یہاں دو معاملے در پیش ہیں۔ ایک تو مفسدوں اور مخالفوں کے ارتداد کا
> ثابت کرنا اور ان کے اموال کو جائز قرار دینا، اس بات سے قطع نظر کہ وہ
> ان کے ارتداد پر یا ان کی بغاوت پر مبنی ہے۔
> دوسرے یہ کہ آیا اس کا کوئی سبب ہے یا کچھ اور ہے۔
> اگرچہ پہلا طریقہ ہمارے پاس وہی تحقیق اور تفتیش کرنا ہے۔ کیوں کہ ہم
> ان فتنہ پردازوں کو فی الحقیقت مرتدوں بلکہ اصل کافروں میں شمار کرتے
> ہیں اور ان کو اہل کتاب کافروں کے مثل جانتے ہیں۔ (ص ۲۴۱۔ مکتوبات
> احمد شہید۔ مکتوبات شاہ اسمٰعیل بنام سید احمد رائے بریلوی)

تواریخ عجیبہ از محمد جعفر تھانیسری کے مطابق ۶ ربیع الاول ۱۲۴۵ھ/ ۵ ستمبر ۱۸۲۹ء بہ اتفاق

رائے جملہ علما و رؤسائے مذکورہ ”اعلام نامۂ شرعی“ (نہ با کسے از امرائے مسلمین منازعت داریم۔ الیٰ
آخرہ) بہ نام سلطان محمد خاں حاکم پشاور اور اس کی نقول بہ نام ساکنانِ شہر پشاور و اطراف پشاور روانہ
کی گئیں۔ سردار محمد خاں نے اس کے جواب میں لکھا کہ:

> ”ہم نے آپ کے مضمون نامہ پر اطلاع پائی۔ آپ نے جو یہ لکھا ہے کہ ہم
> خدا کے واسطے اس ملک میں کفار سے جہاد کرنے آئے ہیں اور کلمہ گویان
> سے لڑنے نہیں آئے ہیں یہ سب آپ کی ابلہ فریبی ہے۔
> آپ کا عقیدہ فاسد اور نیت کاسد ہے۔ آپ فقیر ہو کر ارادہ امامت اور
> حکومت کا رکھتے ہیں۔ پس ہم نے بھی خدا کے واسطے کمر باندھ رکھی ہے کہ
> تم کو قتل کر کے اس سرزمین کو تم سے پاک کریں گے۔“ (تواریخ عجیبہ از محمد
> جعفر تھانیسری)

انگریزوں کو معرکۂ بالاکوٹ کا جو نقد فائدہ حاصل ہوا وہ یہ ہے۔ منشی محمد جعفر تھانیسری (متوفی
۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۵ء) لکھتے ہیں:

> ”اور آخر ۱۸۴۵ء میں معرکۂ بالاکوٹ کے پندرہ سال بعد کل سلطنتِ پنجاب سکھوں کے
> ہاتھ سے نکل کر ہماری عادل سرکار کے قبضے میں آگئی۔ (ص: ۱۳۸۔ سوانح احمدی مؤلفہ محمد جعفر
> تھانیسری۔ مطبوعہ لاہور)

اختتام معرکۂ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء کے بارے میں صوبہ سرحد کے سنی حنفی پٹھانوں کی مذہبی و ملی
غیرت و حمیت کا ذکر کرتے ہوئے سر سید احمد خاں لکھتے ہیں:

> ”چوں کہ یہ قوم مذہبی مخالفت میں نہایت سخت ہے اس سبب سے اس
> قوم نے اخیر میں وہابیوں سے دغا کر کے سکھوں سے تعاون کر لیا اور
> مولوی محمد اسمٰعیل صاحب اور سید احمد صاحب کو شہید کر دیا۔ (ص: ۴۔
> ج ۹۔ مقالات سر سید، مطبوعہ لاہور)

مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں:

> ”کچھ مجاہدین کی ناتجربہ کاری، کچھ علماءِ سو کی تفریق انگیز حرکات، اور سب
> پر مستزاد افغان سرداروں کی جاہلانہ عصبیت، ان سب چیزوں نے مل ملا کر

کایا پلٹ دی۔ حنفیت و وہابیت کے جھگڑے الگ کھڑے ہو گئے۔ علماءِ سو اور قبر پرستوں نے مجاہدینِ امت پر کفر کے فتوے لگائے۔ سرحد کے خوانین نے اپنے مرشد سے غداری کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سید احمد شہید نے بالاکوٹ میں جام شہادت نوش فرمایا۔ (ص ۲۸۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، از مسعود عالم ندوی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔ مارچ ۱۹۹۹ء)

سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسمٰعیل دہلوی کے مجاہدین صوبہ سرحد کے عام مسلمانوں کی نظر میں عام طور پر مذہبی و سیاسی شکوک و شبہات کے دائرے میں رہتے تھے۔

''جب حضرت شہید بعزم جہاد صوبہ سندھ اور سرحد کے علاقے میں داخل ہوئے تو ان کے متعلق عام طور سے یہ شبہ کیا گیا کہ یہ انگریزوں کے جاسوس ہیں۔ اور یہ شبہ اس بنا پر کیا گیا کہ حضرت شہید کے تعلقات انگریزوں سے نہایت درجہ خوش گوار تھے۔ (حاشیہ ص ۲۵۔ مقالات سرسید۔ حصہ شانزدہم، مطبوعہ لاہور)

''وہ ہمارے اور تمہارے مذہب کے مخالف ہیں۔ ایک نیا دین انھوں نے نکالا ہے۔ کسی ولی اور بزرگ کو نہیں جانتے۔ سب کو برا کہتے ہیں۔ انگریزوں نے انھیں تمہارے ملک کا حال معلوم کرنے کی غرض سے جاسوس بنا کر بھیجا ہے۔ ان کی باتوں میں نہ آنا۔ عجب نہیں کہ تمہارا ملک چھنوا دیں۔ (ص ۲۸۰۔ سید احمد شہید، دوم۔ از غلام رسول مہر)

اس ضمن میں مختلف ہندوستانی اقوام کو ایک دوسرے سے لڑا بھڑا کر انھیں کمزور کرنے اور پھر ان پر قابض ہونے کی برطانوی حکمت عملی سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ سید طفیل احمد منگلوری لکھتے ہیں:

''ایک زمانہ وہ تھا جب کہ بقول میجر باسو:
انگریزوں نے سکھوں کو بڑھایا تھا تا کہ وہ سندھیا کا مقابلہ کریں۔ اس لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ ہمیشہ انگریزوں سے ملے رہے اور شکر گذار رہے۔''
(تاریخ میجر باسو۔ جلد ۲۔ ص ۱۵۳)

مگر اب حکومت کی ضروریات بدلیں تو بقول میجر موصوف کے:
کپتان ایبٹ نے جو ریزیڈنٹ لاہور کا اسسٹنٹ تھا، سردار چتر سنگھ کو بہت تنگ کر کے

اسے مقابلہ پر مجبور کیا۔ اور صوبہ ہزارہ کے مسلمانوں میں جن کی آبادی بہت تھی اور جو جنگ جو تھے روپیہ تقسیم کر کے ان سے کہا کہ سکھوں نے مسلمانوں پر جو مظالم کیے تھے اس کا بدلہ تمہیں لینا چاہیے۔ اس طرح سے مسلمانوں کو سکھوں کے مقابلے میں کھڑا کیا۔'' تاریخ میجر باسو۔ جلد ۳۔ ص ۲۴۵ (ص ۱۴۲، ۱۴۳۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل، مؤلفہ سید طفیل احمد منگلوری۔ طبع اول ۱۹۳۷ء۔ طبع جدید مکتبہ الحق جوگیشوری ممبئی ۲۰۰۱ء۔ عکس طبع دسمبر ۱۹۴۵ء)

مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں:

''حکومت نے مولانا ولایت علی کو اطلاع دی کہ اب گلاب سنگھ پر حملہ کرنا خود انگریزی حکومت سے لڑائی مول لینا ہے۔ حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ جب تک ان پر براہ راست زد نہ پڑے، مجاہدین سے ٹکر نہ لی جائے اور انھیں سکھوں سے لڑنے دیا جائے۔ مجاہدین اور سکھوں میں سے جس کی بھی شکست ہوگی سرکار انگریزی کا بہر حال فائدہ تھا۔ اس لئے شروع شروع میں مجاہدین سے روک ٹوک نہیں کی گئی۔ لیکن جب پنجاب کا بڑا حصہ انگریزوں کے قبضے میں آ گیا تو مجاہدین حکومت کی نگاہ میں کھٹکنے لگے۔ مجاہدین بھی حکومت سے خواہ مخواہ نبرد ہونا خلاف مصلحت خیال کرتے تھے۔ (ص ۴۷۔ ہندوستان میں پہلی اسلامی تحریک۔ از مسعو عالم صاحب ندوی)

''کہنا یہ ہے اور صاف صاف کہ جب تک مجاہدین سکھوں سے الجھے رہے۔ کمپنی کی حکومت خاموش اور غیر جانب دار رہی .... مقصود یہ تھا کہ مجاہدین اور سکھوں کی آویزش میں سرکار عالی کا کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہو رہے گا۔ لیکن جوں ہی پنجاب کا الحاق عمل میں آیا کمپنی اور سرکار کی نظر میں مجاہدین سے برا کوئی نہ تھا۔ پھر کوئی کسر نہیں تھی جو ان کے کچلنے کے لئے اٹھا رکھی گئی ہو۔ (ص: ۹۹۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔ از مسعود عالم ندوی)

آزادی ہندی (۱۹۴۷ء) تک سارے علما و محققین و مؤرخین یہی سمجھتے اور لکھتے رہے کہ تحریک بالاکوٹ سکھ مظالم کے خلاف تھی اور انگریز یہی چاہتے تھے کہ سکھوں کا زور کسی طرح کم کیا جائے۔ جس کی حقیقت ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

''چنانچہ پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں پر زیادتیوں کی خبریں مسلسل ہندوستان میں آتی

تھیں اور مشہور تھا کہ سکھ مسلمانوں کی مسجدوں کی بے حرمتی کرتے ہیں اور مسلمانوں کو فرائض مذہبی ادا کرنے سے روکتے ہیں۔ ریاست رام پور میں ولایتی افغانوں نے سکھوں کے مظالم بیان کیے تھے اور کہا تھا کہ سکھ، مسلمان عورتوں کو زبردستی سکھ بنا کر اپنی بیویاں بنا لیتے ہیں۔

(سوانح احمدی، مؤلفہ مولوی محمد جعفر تھانیسری۔ ص۹۶)

سید طفیل احمد منگلوری اپنی مشہور کتاب ''ہندوستانی مسلمانوں کا روشن مستقبل'' میں لکھتے ہیں:

''یہ حالات سن کر سید احمد صاحب کے خلیفہ مولوی اسمٰعیل صاحب تحقیق حالات کے لئے خود پنجاب تشریف لے گئے اور امرتسر، لاہور اور دوسرے مقامات کا دورہ کیا وہاں آپ نے بچشم خود دیکھا کہ تمام بڑی بڑی مساجد میں گھوڑے بندھے ہوئے تھے، اذان بند تھی، قرآن مجید کی علانیہ بے حرمتی اور شعائر مذہبی کی توہین کی جاتی تھی اور مذہبی فرائض کی بجا آوری بعض صورتوں میں بالکل ناممکن ہوگئی تھی۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ پنجاب میں مسلمانوں کے مذہبی اور بنیادی حق میں صریح دست اندازی ہوتی تھی۔ جس کی مدافعت کے لئے حضرت سید احمد نے سکھوں پر جہاد کا ارادہ کیا۔

سید صاحب کے سوانح میں تحریر ہے:

''جب آپ سکھوں پر جہاد کرنے کو تشریف لیے جاتے تھے کسی شخص نے پوچھا کہ آپ اتنی دور سکھوں پر جہاد کرنے کیوں جاتے ہیں؟ انگریز جو اس ملک پر حاکم ہیں اور دین اسلام سے منکر ہیں گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لیں یہاں لاکھوں آدمی آپ کے شریک اور مددگار ہو جائیں گے۔

جواب دیا کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے نہ انگریزوں کا اور نہ سکھوں کا ملک لینا ہمارا مقصود ہے بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ فرائض مذہبی ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکات مستوجب جہاد سے باز آجائیں گے تو ہم کو اُن سے لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

اور سرکار انگریزی گو منکر اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم و تعدی نہیں کرتی

اور نہ ان کو فرض مذہبی اور عبادت لازمی سے روکتی ہے۔ پھر ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں؟ اور خلاف اصولِ مذہب طرفین کا خون بلاسبب گراویں۔'' (سوانح احمدی۔ مؤلفہ مولوی محمد جعفر تھانیسری۔ ص۷۰)

جہاد پر جانے سے قبل سید صاحب نے شیخ غلام علی رئیس الٰہ آباد کی معرفت لفٹنٹ گورنر کو ارادہ جہاد کی اطلاع دی۔

جواب ملا کہ جب تک انگریزی عمل داری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو۔ ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں ہیں۔ (ایضاً)

''اس زمانہ میں علی العموم مسلمان لوگ عوام کو سکھوں پر جہاد کرنے کی ہدایت کرتے تھے۔ ہزاروں مسلح مسلمان اور بے شمار سامان جنگ کا ذخیرہ سکھوں پر جہاد کرنے کے واسطے جمع ہوگیا مگر جب صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے گورنمنٹ کو اطلاع دی۔

گورنمنٹ نے صاف لکھا کہ تم کو دست اندازی نہ کرنی چاہیے۔

دہلی کے ایک مہاجن نے جہادیوں کا روپیہ غبن کیا تو ولیم فریزر کمشنر دہلی نے ڈگری دی جو وصول ہو کر سرحد کو بھیجی گئی۔'' (مضمون سرسید بجواب ڈاکٹر ہنٹر۔ مندرجہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔ ۸/دسمبر ۱۸۷۱ء)

سوانح احمدی میں اس روپیہ کے بارے میں تحریر ہے کہ:

سید صاحب، یاغستان میں مصروف بہ جہاد تھے تو سات ہزار روپیہ کی ایک ہنڈوی پنجاب میں موصول نہ ہونے پر دیوانی میں دعویٰ کیا گیا جس کی ڈگری دیوانی اور ہائی کورٹ سے ملی۔ (سوانح احمدی۔ مؤلفہ محمد جعفر تھانیسری۔ ص۷۰)

اب سوال یہ ہے کہ گورنمنٹ انگریزی نے اس وقت یہ کیوں گوارا کیا کہ تمام ہندوستان میں جہاد کے لئے سامان جنگ اور روپیہ فراہم ہوتا رہے اور گورنمنٹ کی طرف سے نہ صرف اس کی اجازت ہو بلکہ مجاہدین کو ہر قسم کی امداد دی جائے؟ اور ان کا روپیہ وصول کر کے انھیں دیا جائے؟ اس کا جواب حسب ذیل اقتباس میں ملے گا:

''اس میں شک نہیں کہ اگر سرکار اُس وقت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے

خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ بھی مدد نہ پہنچتی مگر سرکار
انگریزی اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔'' سوانح احمد،
از جعفر تھانیسری۔ ص ۱۳۹ (ص ۱۳۲۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ مؤلفہ
سید طفیل احمد منگلوری۔ طبع اول ۱۹۳۷ء۔ طبع جدید ممبئی)

سکھوں کے خلاف جہاد کے وعظ و تحریک کے موقعہ پر مختلف مقامی حکام کو تشویش ہوئی کہ
حکومت انگلشیہ بھی اس سے متاثر نہ ہو مگر ایسا کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں:

''جب مہیب تحریک چلی تو ضلع کے حکام اس سے چوکنے ہوئے اور انھیں
خوف معلوم ہوا کہ کہیں اس سے ہماری سلطنت میں تو رخنہ نہ پڑے گا اور
موجودہ اس میں تو کسی قسم کا خلل واقع نہ ہوگا؟ اس نظر سے ضلع کے حکام
نے حکام اعلیٰ کو لکھا۔ وہاں سے صاف جواب آگیا کہ
ان سے ہرگز مزاحمت نہ کرو۔ ان مسلمانوں کو ہم سے کوئی لڑائی نہیں ہے۔
یہ سکھوں سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اور حقیقت میں بات بھی یہی تھی۔
(ص ۴۳۰۔ حیات طیبہ)

تحریک بالاکوٹ کا آغاز و انجام بھی کچھ عجیب و غریب اور ناقابل فہم ہے کہ دوست محمد خاں
والی کابل کے بھائی یار محمد خاں حاکم پشاور و کوہاٹ سے پہلا ''جہاد'' کیا گیا۔

''سید صاحب نے ''پہلا جہاد'' یار محمد خاں حاکم یاغستان سے کیا'' (تذکرۃ الرشید حصہ دوم
مولفہ عاشق الٰہی میرٹھی مطبوعہ میرٹھ۔ طبع اول ۱۹۰۸ء)

اور ''آخری جہاد'' بھی مسلمانوں ہی سے ہوا۔ جیسا کہ سر سید احمد خاں لکھتے ہیں:

''چنانچہ ۱۸۲۴ء میں وہابیوں نے پہاڑیوں پر جا کر قیام کیا اور انھوں نے اس
بات کا قصد کیا کہ سکھوں پر ہم لوگ جہاد کریں اور شہید ہوں۔ لیکن چوں کہ
پہاڑی قومیں ان کے عقائد کی مخالف تھیں اس لئے وہ وہابی ان پہاڑیوں
کو ہرگز اس بات پر راضی نہ کر سکے کہ وہ ان کے مسائل کو بھی اچھا سمجھتے مگر
چوں کہ وہ سکھوں کے جور و ستم سے نہایت تنگ تھے اس سبب سے وہابیوں
کے اس منصوبے میں بھی شریک ہو گئے کہ سکھوں پر حملہ کیا جاوے اور آخر

کار وہابیوں اور پہاڑیوں نے متفق ہو کر سکھوں پر حملہ بھی کیا لیکن
یہ قوم چوں کہ مذہبی مخالفت میں نہایت سخت ہے اس سبب سے اس قوم نے
آخر میں وہابیوں سے دغا کر کے سکھوں سے اتفاق کر لیا اور مولوی
محمد اسمٰعیل صاحب اور سید احمد صاحب کو شہید کر دیا۔'' (ص ۱۳۹ و ۱۴۰۔
حصہ نہم مقالات سر سید۔ مطبوعہ لاہور)

ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر نے لکھا ہے کہ:

''سید احمد صاحب کو اتمان زئی قبیلہ نے قتل کر ڈالا تھا۔'' (حاشیہ ص ۳۴۔
ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ الکتاب انٹرنیشنل، جامعہ نگر نئی دہلی۔ ۲۰۰۲ء)

تحریک نجد کی طرح تحریک بالاکوٹ میں بھی حد درجہ انتہا پسندانہ عناصر کا غلبہ ہو گیا تھا جس
کے ایک ایک نمونے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور آل سعود کے مختصر حالات اور ان کی ہدایات و احکام بیان
کرتے ہوئے مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں:

''حقہ پینے کی ممانعت بہت سخت تھی۔ ایک دن اتفاق سے محتسب نے ایک خاتون کو جو حقہ کی
حد سے زیادہ عادی تھی، حقہ پیتے دیکھ لیا۔ وہ ہر چند چاہتی تھی کہ بچ کے نکل جاؤں۔ پر ممکن نہ ہوا۔ آخر
وہ پکڑی گئی۔ الٹے گدھے پر اس کو سوار کیا گیا۔ اور اس کی گردن پر اس کا حقہ رکھا گیا اور گلی در گلی اسے
پھیرا گیا تاکہ عورتوں کو سخت عبرت ہو۔ اور پھر وہ شہر بدر کر دی گئی۔ (ص ۳۰۴۔ حیات طیبہ)

ادھر مجاہدین سرحد کا حال یہ تھا کہ وطن سے دوری نے انھیں مغلوب الحال کر رکھا تھا اور

''اور بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر دو تین دوشیزہ لڑکیاں جا رہی ہیں۔ مجاہدین میں
سے کسی شخص نے انھیں پکڑا اور زبردستی مسجد میں لے جا کر نکاح پڑھا لیا۔ (ص ۲۸۰۔ حیات طیبہ)

''یہ ناممکن تھا کہ نوجوان عورت رانڈ ہو کے عدت کی مدت گذر جانے پر بے خاوند بیٹھی
رہے۔ اس کا جبراً نکاح کر دیا جاتا تھا خواہ اس کی مرضی ہو یا نہ ہو۔ (ص ۲۸۱۔ حیات طیبہ)

''ایک نوجوان خاتون نہیں چاہتی تھی کہ میرا نکاح ثانی ہو مگر مجاہد صاحب زور دے رہے
ہیں نہیں ہونا چاہیے۔ آخر ماں باپ اپنی نوجوان لڑکی کو حوالۂ مجاہد کرتے تھے اور ان کو کچھ چارہ نہ
تھا۔ (ص ۲۸۱۔ حیات طیبہ)

سید احمد صاحب کی مہر کے ساتھ قاضی شہر پشاور سید مظہر علی صاحب نے ایک فتویٰ غازیوں کے پاس بھیج دیا۔

''انھوں نے اس فتویٰ کی اشاعت ہی پر قناعت نہ کی۔ بلکہ یہ اعلان دے دیا کہ تین دن کے عرصے میں ملک پشاور میں جتنی رانڈیں ہیں سب کے نکاح ہو جانے ضروری ہیں ورنہ کسی گھر میں اگر بے نکاح رانڈ رہ گئی تو اس گھر کو آگ لگادی جائے گی۔ (ص ۲۸۲۔ حیات طیبہ)

''ایک ایک چھوٹے چھوٹے ضلع قصبہ گاؤں میں ایک عامل سید صاحب کی طرف سے مقرر ہوا تھا۔ وہ بے چارہ جہاں داری کیا خاک کرسکتا الٹے سیدھے شریعت کی آڑ میں نئے نئے احکام بے چارے غریب کسانوں پر جاری کرتا تھا اور وہ اُف نہ کر سکتے تھے۔ کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا، شادی بیاہ کرنا سب ان پر حرام ہو گیا تھا۔ نہ کوئی منتظم تھا نہ دادرس تھا۔ معمولی باتوں پر کفر کا فتویٰ ہو جانا کچھ بات ہی نہ تھی۔ (ص ۲۸۱۔ حیات طیبہ)

نجدی ذہنیت اور انتہا پسندی کا ایک نمونہ یہ بھی ہے:

''اب تو حالت یہ ہے کہ تقویۃ الایمان اور صراطِ مستقیم نامی کتابوں کا ذکر کرتے ہی خانقاہی حلقے وہابیت کے خطرے سے چونک پڑتے ہیں اور ان کے سامنے وہ روایت آجاتی ہے کہ:

شاہ اسمٰعیل جب سکھوں سے لڑنے کے لئے جانے لگے تو دلی میں انھوں درگاہ حضرت نظام الدین اولیا کی بابت کہا کہ:

سکھوں کی مہم سے فارغ ہو جاؤں گا تو اس بت خانے کو بھی ڈھاؤں گا۔

(ص ۹۔ افتتاح سخن بقلم خواجہ حسن ثانی نظامی۔ در سید احمد شہید کی صحیح تصویر مؤلفہ وحید احمد مسعود بدایونی۔ مکتبہ مسعود، رام گڈھ، لاہور۔ بار سوم ۱۹۶۶ء)

تحریک بالاکوٹ کی ''جماعتِ مجاہدین'' کے بارے میں مولانا عبیداللہ سندھی (متوفی ۱۹۴۴ء) کہتے ہیں:

''ایک بار میں سرحد پار بنیر کے مقام پر گیا...... میں اس امید میں کہ شاید سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی جماعتِ مجاہدین میں زندگی کی کوئی کرن دکھائی دے ادھر چل دیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے جو کچھ دیکھا وہ حد

درجہ افسوسناک اور قابلِ رحم تھا۔

وہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ جماعت جو ''مجاہدین'' کے نام سے یاد کی جاتی ہے، کس بری حالت میں ہے اور اس کی گذران اور اس کی زندگی کس طرح صاحبزادہ عبدالقیوم خاں کی وساطت سے انگریزی حکومت کی رہینِ منت ہے۔ (ص ۳۶۲۔ افادات و ملفوظات مولانا سندھی۔ مطبوعہ لاہور مرتبہ محمد سرور جامعی)

درگاہِ شاہ غلام علی و شاہ ابوالخیر دہلوی سے وابستہ ہزاروں مریدین افغانستان میں آج بھی موجود ہیں جن کا براہ راست رابطہ شاہ ابوالحسن زید نقشبندی مجددی (متوفی ۱۹۹۳ء) سے تھا۔ وہ اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں لکھتے ہیں:

''پٹھانوں کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے ہیں قطعاً بے بنیاد ہے۔ البتہ صدہا سال سے ان میں یہ برا طریقہ رائج ہے کہ لڑکی کا مہر لڑکی کا باپ، بھائی وغیرہ اپنے استعمال میں لاتے ہیں۔ آج تک اس رسم کا ازالہ کوئی نہیں کرسکا ہے۔ میرے بڑے بھائی حضرت ابوالفیض بلال رحمۃ اللہ و رضی عنہ نے اس سلسلے میں سالہا کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

زواج کے معاملے میں مولانا عبیداللہ سندھی نے کابل میں باخبر افراد سے تحقیق کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''شرفاء افاغنہ دوسری قوموں کے شرفا سے رشتے ناطے کرنا معیوب نہیں سمجھتے۔ مہاجرین اپنے ساتھ اہل و عیال تو لے نہیں گئے تھے۔ جب افغان علاقے میں مستقل طور پر رہنے والے ہندوستانی اپنی حاکمانہ قوت دکھا کر بہ جبر افغان لڑکیوں سے نکاح کرنے لگے۔ اس بارے میں بھی زیادہ مجرم وہی لوگ ہیں جو حزب ولی اللہ کے تربیت یافتہ سپاہی نہیں تھے اور اپنے مذہبی جوش میں اپنے فکر کے مقابلے میں امیر کی اطاعت بھی نہیں کرتے تھے۔ یہ لوگ لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق، کا اصول غلط استعمال کرتے تھے۔ اُن کی مثال یورپ کے انارکسٹوں کی سی تھی، جو اس انقلابی جماعت کے ساتھ شریک ہو گئے تھے اور ان انقلابیوں کو سخت

نقصان پہنچا کر رہے۔'' (ملاحظہ کریں۔حزب امام ولی اللہ کی اجمالی تاریخ کا مقدمہ ص ۱۶۳و۱۶۴)

جناب سید احمد نے جو مکتوبات پشاور کے علما کو لکھا ہے اس میں قبائلیوں کا یہ قول نقل کیا ہے:

''ان مسافروں کی جماعت کا کوئی مذہب نہیں ہے اور یہ کسی مسلک کے پابند نہیں ہیں۔''

اب خیال کیا جائے کہ جناب سید کی امامت کو تسلیم نہ کرنے والے کو منافق اور کافر قرار دے کر قتل کرنا اور اس کے مال واسباب کو مالِ غنیمت سمجھنا کس کا مسلک ہے؟ اور دوسروں کی لڑکیوں کو جبراً لینا اور اُن سے نکاح کرنا کس کا مذہب ہے؟ ایسے افعال کا ارتکاب وہی شخص کر سکتا ہے جو کسی مذہب کا پابند اور ائمۂ مجتہدین میں سے کسی کا مقلد نہ ہوگا۔

اور قبائلیوں نے یہ بھی دیکھا کہ کوئی آمین بلند آواز سے کہہ رہا ہے، کوئی رفعِ یدین کر رہا ہے اور یہی علاماتِ غیر مقلدی ہیں۔

محمد بن عبدالوہاب کے حال میں ابن مرزوق کی کتاب سے سلیمان بن عبدالوہاب کا یہ واقعہ لکھا جا چکا ہے کہ انھوں نے اپنے بھائی محمد بن عبدالوہاب سے دریافت کیا کہ اسلام کے کتنے ارکان ہیں؟ محمد بن عبدالوہاب نے کہا: پانچ۔ سلیمان نے کہا: تم نے ان کو چھ کر دیا اور چھٹا یہ ہے کہ جو تمہاری پیروی نہ کرے وہ کافر۔ یہی صورت چارسدہ، ہشت نگر پہنچ کر مولانا اسمٰعیل نے اختیار کی کہ جو شخص جناب سید کی امامت تسلیم نہ کرے وہ منافق اور کافر۔ اس کا خون بہانا جائز اور اس کا مال، مالِ غنیمت۔

یہ مسلک اہلِ اہواء کا ہے اور نجدی نے ان کا مسلک اختیار کیا ہے۔ اہلِ سنت و جماعت نے شیرِ خدا حضرت علی مرتضیٰ رضی الله عنه و کرم وجه کے ارشاد پر عمل کیا ہے۔ ۳۷ھ میں جب آپ کی جماعت میں سے ایک گروہ آپ کا مخالف ہوا اور آپ سے لڑا، اس گروہ کے چار سو افراد مارے گئے۔ حضرت علی نے مقتولین اور مجروحین کو ان کے رشتہ داروں کے حوالے کیا اور اپنی جماعت سے فرمایا: جو سامانِ جنگ تمہارے ہاتھ لگا ہے وہ تم لے لو۔

اما المتاع و العبید و الاماء فردّوہ علیٰ اهله۔ ''اور آپ نے ان کا مال و متاع اور غلام باندی کو ان کے گھر والوں کے سپرد کرایا۔'' (ملاحظہ کریں تاریخ الامم والملوک از امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری۔ ج ۳۔ ص ۲۶)

مجاہدین کا عمل کیا تھا، اس کے متعلق میر محبوب علی دہلوی (متوفی ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء) لکھتے ہیں:

بل الحق ان السید احمد اراد الجهاد فی سبیل اللّٰه و تبعه بعض الصالحین فی هذه الارادة الصحیحة و غزوا علی الکفار و قاتلوا و قتلوا فی سبیل اللّٰه۔

فلما اظهر السید انی امیر المومنین الخلیفة علی المسلمین کافة تنغص بعض من معه من المجاهدین و بقی البعض الأخر منهم علی هذا الاظهار ایضاً۔ فقاتله المسلمون بعد اظهار هذه الدعوىٰ خوفاً منه علی ملکهم و تسلطهم۔ فلما قاتلهم و قال ان مقاتلینا منافقون یحل دمهم و اموالهم و تصرفوا فی اموال المقتولین کتصرفهم فی الغنائم، علم الناس انه لایلیق بالخلافة فنکث الجمع عن مبایعتهٖ و قالوا لانتبعك فی شیءٍ من الامور۔ (ص ۸۹۱۔ تاریخ الائمه (قلمی) انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامك اسٹڈیز تغلق آباد، نئی دهلی)

''یہ حق ہے کہ سید احمد نے اللہ کے راستے میں جہاد کا ارادہ کیا اور کچھ نیک بختوں نے اس اچھے ارادے میں ان کی پیروی کی، اور وہ کافروں سے لڑے۔ کافروں کو قتل کیا اور خود بھی اللہ کی راہ میں مارے گئے۔

اور جب جناب سید نے اس بات کا اظہار کیا کہ میں امیر المومنین اور تمام مسلمانوں کا خلیفہ ہوں تو آپ کے ساتھ کے بعض مجاہد مکدّر خاطر ہوئے اور دوسرے بعض اظہار کے بعد بھی آپ کے ساتھ رہے لیکن اس علاقے کے باشندے جو کہ مسلمان ہیں، جناب سید کے اس اعلان کے بعد آپ سے لڑے۔

ان کو کھٹکا ہوا کہ ان کا ملک اُن کے ہاتھ سے نہ نکل جائے اور جناب سید کا کہیں ان پر تسلّط نہ ہو جائے، لہٰذا انھوں نے جناب سید سے قتال کیا، اور جناب سید نے اعلان کیا کہ ہم سے لڑنے والے منافق ہیں، ان کا خون اور ان کا مال ہمارے واسطے حلال ہے۔ لہٰذا جناب سید کے لوگوں

تصرف کیا۔ نے مقتولین کے اموال میں مال غنیمت کی طرح
یہ کیفیت دیکھ کر لوگوں کو یقین ہوگیا کہ جناب سید خلافت کے لائق نہیں۔ لہذا سب نے
بیعت توڑ دی اور کہا کہ ہم تمہارا اتباع کسی امر میں نہیں کریں گے۔" الخ
یعنی امامت کے اعلان کے بعد مجاہدوں میں بھی بے چینی پیدا ہوئی اور قبائلی مخالف ہو گئے۔
ان کو اپنے ملک کا ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ ہوا اور اُن کا خیال ہوا کہ ہم پر جناب سید کا تسلط اور
اقتدار قائم ہوجائے گا۔ اور جب مقتول قبائلیوں کے مال و متاع پر مجاہدوں نے قبضہ کیا تو ان کا
خیال یقین کی صورت اختیار کر گیا۔ اور وہ سب جناب سید کے مخالف ہو گئے۔

مولانا عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں:

"جس دن سے امیر شہید افغانوں کے امیر بنے اُسی وقت سے بغاوت کی
چنگاری اس اجتماع میں چمکتی رہی ہے۔
اگر معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا ہم افغانوں کا امیر بناتے اور اسے امیر
شہید کے بورڈ کا ایک ممبر بنا دیتے اس طرح دونوں قومیں مل کر جہاد کرتی
رہتیں۔" (ص ۱۷۰۔ حزب ولی اللہ کی تاریخ کا مقدمہ از مولانا سندھی)

مولانا عبید اللہ سندھی کو اللہ تعالیٰ اجر دے، انھوں نے اُس فتنہ شنعاء کو بے نقاب کیا ہے جو
تحریک جہاد کی ناکامی اور مجاہدین کی ہلاکت کا سبب بنا۔ وہ لکھتے ہیں:

"کابل میں قیام کے زمانے میں ہم نے اس فتنے کے متعلق کافی معلومات
حاصل کر لی ہیں۔ اس کی ابتدا خویشگی کے اُس خاندان سے ہوئی جس کی
لڑکی کا جبراً نکاح ہوا تھا۔ اُس میں زیادہ رہنمائی کرنے والا خٹک کا خان تھا
جس نے خویشگی کے خان سے صلح کر لی تھی۔ ان ہر دو خوانین میں باہمی
پشتینی عداوت تھی۔

جب خویشگی خان کی ایک لڑکی کا ایک ہندوستانی سے جبراً نکاح کیا گیا تو
اُس نے خانِ خٹک سے کہا کہ میں نے اب اپنا دعویٰ چھوڑ دیا ہے، اب
سوال ننگِ افغانی کا ہے۔ ہماری باہمی صلح ہے تم میری امداد کرو۔ خان
خٹک کی نوجوان لڑکی تھی، خان خٹک نے پیغام پہنچتے ہی اُسی مجلس میں اپنی

دوشیزہ لڑکی کو بُلایا اور سرِ دربار اس کے سر سے کپڑا اتار دیا اور کہا: آج سے
تیری کوئی عزت باقی نہیں رہی جب تک اُس افغانی لڑکی کا انتقام نہیں لیا
جاتا، تیری عزت ہیچ محض ہے۔
اس کے بعد خان خٹک کی یہ لڑکی اس فتنے کے خاتمے تک ہموار ننگے سر
رہی۔ رات کو ایک جماعت اس کے ساتھ جاتی اور گاؤں میں عورتوں
مردوں کو جمع کر کے پشتو میں ننگِ افغان کے متعلق لوگوں کو بھڑکاتی، دوسری
رات دوسرے گاؤں میں جاتی۔ اس طرح اُس نے تمام افغانی علاقے
میں شورش منظم کر دی۔ اس پر ایک معین رات میں سب سرداروں کو قتل کر دیا
گیا اور حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔" (ص ۱۷۱۔ حزب ولی اللہ کی تاریخ کا
مقدمہ از مولانا سندھی)

یعنی جناب سید کے مقرر کردہ افسران اور کارندوں کو قتل کر دیا گیا۔ انا للہ
و انا الیہ راجعون۔ (ص ۹۲ تا ۹۵۔ مولانا اسمٰعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان
مؤلفہ شاہ ابوالحسن زید۔ مطبوعہ شاہ ابوالخیر اکیڈمی۔ چتلی قبر دہلی ۶۔ ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء)

شاہ اسمٰعیل دہلوی کے ہم سبق اور ان کے ہم خیال میر محبوب علی دہلوی (متوفی ذوالحجہ
۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء) لکھتے ہیں:

"جناب سید کی شہادت میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ ان کے بعض معتقدین
کہتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں اور اُن پہاڑوں میں جہاں قوم گوجر آباد ہے رُوپوش
ہو گئے ہیں۔ وہ روتے ہیں اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ غیبی امداد کرے۔
اور بعض کہتے ہیں کہ مولانا اسمٰعیل کی شہادت کے بعد وہ بھی شہید ہو گئے۔
ایک ہی دن میں اور ذی القعدہ کے مہینے میں دونوں کی شہادت ہوئی ہے۔
اور سید کرم علی حافظ قرآن کا بیان ہے کہ مولانا اسمٰعیل کے بائیس دن بعد
جناب سید جب کہ نماز پڑھ رہے تھے شہید کر دیے گئے اور اُن کا سر کاٹ کر
لاہور بھیج دیا گیا۔ یہ لڑائی سکھوں سے ۱۲۴۶ھ میں ہوئی۔
اور القاسم الکذاب پانی پتی اور اس کے ہم خیال کہتے ہیں کہ جو شخص یہ خیال
کرے کہ جناب سید کی وفات ہو گئی ہے اور دوسرے کے واسطے جائز ہے

کہ امیر المومنین ہوئے وہ کھلم کھلا گمراہ ہے۔''

اور صفحہ (۸۹۵) میں لکھا ہے:

''میں نے جب جناب سید کی مجلس کا یہ حال دیکھا، سمجھ گیا کہ یہ کام ان
کے بس کا نہیں اور مجھ کو یقین ہوگیا کہ اختلافات کے جھگڑوں میں علما
مارے جائیں گے اور جاہلوں کا مذہب سید صاحب کے کشوفات اور
معارف ہوں گے جو کہ باب الجہاد الشرعی میں جمہور علما کے بیان کردہ
طریقے کے خلاف ہوں گے۔

میں نے خلوت میں جناب سید سے کہا: اے میرے سید! جہاد کا مدار
مشورے پر ہے اور جہاد امورِ شرعیہ میں ایک بڑا رکن ہے۔لڑائی کا مدار
دھوکے میں ڈالنے پر ہے۔ یہاں آپ خود دھوکہ کھارہے ہیں، کسی
دوسرے کو دھوکے میں نہیں ڈال رہے ہیں۔میرے نزدیک پہلا حیلہ یہ
ہے کہ آپ اس مقام میں اقامت فرمائیں، یہاں کے باشندوں میں سے
کسی ایک کی بھی مخالفت نہ کریں، جب تک کہ آپ کے پاس ہندوستان
سے بارہ ہزار مجاہد نہ آجائیں۔جب غریب الوطن صبر کرنے والے بارہ ہزار
مجاہد آجائیں تو آپ ان مقامات پر حکومت کریں اور اعلان کردیں کہ اپنی
جان و مال سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے کافروں سے جہاد کرو۔

آپ یہ نہ کہیں کہ میں امیر المومنین اور زمین پر اللہ کا خلیفہ ہوں اور میری
اطاعت تمام لوگوں پر واجب ہے کیوں کہ یہ نرالی بات رئیسوں اور سمجھ
داروں کو وحشت میں ڈالتی ہے۔

میری اس بات کو سن کر جناب سید نے کہا: جس کام کو میں نے سنوارا ہے تم
اس کو بگاڑ رہے ہو،تمہاری اطاعت خاموشی کے ساتھ سننے کی ہونی چاہیے،
ایسی خاموشی جیسی اس پہاڑ کی ہے جو میرے سامنے کھڑا ہے۔

میں نے کہا: یہ بات مجھ جیسے شخص سے نہیں ہوسکتی کیوں کہ ان امور میں
مسلمانوں کو صحیح مشورہ نہ دینا میرے نزدیک حرام ہے۔اب جب کہ مجھ کو
آپ خاموش رکھنا چاہتے ہیں اور میں خاموش نہیں رہ سکتا تو اصلاح فی

مابین المسلمین کی وجہ سے مجھ پر لازم ہے کہ آپ سے الگ ہوجاؤں اور
لوگوں کو اس اختلاف کی خبر نہ ہو۔یہ سن کر آپ نے مجھ کو ہندوستان جانے
کی اجازت دی۔''

اور صفحہ (۸۹۶) میں لکھا ہے:

''میری یہ بات جناب سید سے تنہائی میں ہوئی، اور جناب سید نے علانیہ
یہ بات کہی کہ:

من ذهب من عندی الیٰ وطنهٖ مراجعا فقد ذهب ایمانه.

جو بھی میرے پاس سے اپنے وطن کو لوٹ کر جائے گا اس کا ایمان گیا۔

اور میں نے جناب سید سے یہ بات بھی کہی کہ آپ مجھ کو اپنا وکیل بنا کر
پشاور کے رئیسوں کے پاس بھیج دیں اور آپ ان کو لکھ دیں کہ آپ کے
پاس آنے والے مجاہدوں کا راستہ وہ لوگ نہ روکیں۔

سید صاحب نے کہا: میرے نزدیک یہ صورت مناسب نہں ہے کیوں کہ
یار محمد کے دل میں ذرہ بھر ایمان نہیں ہے وہ تم کو قتل کردے گا۔

میں نے سید صاحب سے کہا: اگر اس نے مجھ کو قتل کردیا آپ کی حجت اس
پر غالب آجائے گی۔اور بلاسوال و جواب آپ کا ان سے قتال کرنا جائز
نہیں کیوں کہ وہ لوگ آپ کی آمد سے پہلے کے یہاں کے حکام ہیں۔یہ
سن کر سید صاحب خاموش رہے۔''

جناب سید احمد نے افغانستان کے بادشاہ امیر دوست محمد خاں کو ایک مکتوب ارسال
کیا ہے۔اس میں لکھا ہے:

''بارہ جمادی الثانیہ ۱۲۴۲ ہجری مقدس کو مشاہیرِ کرام، مشائخِ عظام، قابلِ
احترام شہزادوں، صاحبِ حشمت خوانین اور تمام خاص و عام مسلمانوں
کے اتفاق رائے سے سب نے امامت کی بیعت اس عاجز کے ہاتھ پر کی
اور جُمعہ کے روز عاجز کا نام خطبے میں لیا گیا۔

اس خاکسار ذرۂ بے مقدار کو اس بلند مرتبے کے حاصل ہونے کی بشارت
غیبی اشارے اور الہام کے ذریعے جس میں شک اور شبہہ کی کوئی گنجائش

نہیں دی گئی تھی۔" (ملاحظہ کریں مکتوبات سید احمد میں مکتوب ۲۶ کو ص ۱۴۸ میں اور ترجمہ ص ۱۵۲ میں)

اس تحریر سے ظاہر ہے کہ امامت کا قصہ بھی مرہون کشف والہام رہا ہے اور مولانا اسمٰعیل نے فوراً صدقت و بررت "تم نے سچ کہا اور بھلائی کی" کہہ کر منکرِ امامت کو منافق واجب القتل قرار دے دیا۔ وہ خان نصیر خاں والی بلوچستان کو لکھ رہے ہیں:

"زیادہ بہتر اور مناسب یہ ہے کہ پہلے بد مآل منافقوں کے استیصال اور اُن کی بیخ کنی میں پوری کوشش کی جائے۔
جب جناب والا کا قرب و جوار بدکردار منافقوں سے پاک و صاف ہو جائے تو پھر اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ اَصل مقصد کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔" (مکتوب ۶)

حسبی الله و نعم الوکیل. گئے کس مقصد سے تھے اور مشغول کس کام میں ہو گئے۔

مولانا اسمٰعیل نواب وزیر الدولہ رئیس ٹونک کو تحریر فرما رہے ہیں:

"معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کے رہنے والے اکثر اسلام کے مدعی، جن میں عقل مند فُضلاء، مشائخِ طریقت، مغرور اُمرا اور ان کے فاجر و فاسق پیرو بلکہ تمام شریر النفس منافق اور بد خصلت فاسقوں نے دینِ محمدی کو خیر باد کہہ کے کفر و اِرتداد کا راستہ اختیار کر لیا ہے اور جہاد کی کوشش کرنے والوں پر طعن و تشنیع کی زبان کھول رکھی ہے۔" (مکتوب ۳۰)

مولانا اسمٰعیل نے سارے ہندوستان کے اہل علم، اصحابِ طریقت کو کفر و اِرتداد کی راہ پر چلنے والا قرار دیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سب نے جناب سید احمد کی امامت کی تائید کیوں نہیں کی؟

مولانا میر محبوب علی دہلوی نے اپنی کتاب میں اس مسئلے کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کتاب کے سرِ ورق پر لکھا ہے:

شرطُه ان یکون مجتهداً فی العلوم الضروریة.

اس کی شرط یہ ہے کہ علوم ضروریہ میں مجتہد ہو۔

چوں کہ یہ شرط جناب سید میں نہیں پائی جاتی لہٰذا منکرِ خلافت و امامت کا قتل ناجائز ہوا۔ یہ

ہے میر محبوب علی کے قول کا خلاصہ۔ (ص ۸۶ تا ۸۹۔ مولانا اسمٰعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان۔ مؤلفہ شاہ ابوالحسن زید دہلوی)

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی (متولد ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۱ء۔ متوفی ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۶ء) شاگرد مولانا نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء) شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی کے مختصر حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

پنجاب میں سکھوں کے ساتھ آپ نے متعدد جہاد کیے۔ مگر بعض لوگوں کی بے وفائی کی وجہ سے آپ اپنے پیر سید احمد شہید کے ہمراہ لڑتے ہوئے ۱۲۴۶ھ میں بمقام بالاکوٹ (علاقہ سرحد) زخم تفنگ سے شہید ہوئے۔ (ص ۴۲۲۔ تاریخ اہل حدیث مؤلفہ محمد ابراہیم میر سیالکوٹی۔ مطبوعہ الکتاب انٹرنیشنل بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔ ستمبر ۱۹۹۵ء)

مولانا ثناء اللہ امرتسری (متوفی ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء) کے معتمد اور قریبی دوست ابویحیٰ امام خاں نوشہروی (متوفی رمضان ۱۳۸۵ھ/ جنوری ۱۹۶۶ء) اپنی مشہور سوانحی کتاب میں بحوالہ تاریخ عجیبہ ص ۲۵ لکھتے ہیں کہ:

ایک ولایتی طالب علم نے سید احمد صاحب سے رام پور میں شکایت کی کہ پنجاب میں افغانی اور مسلم لڑکیوں کو سکھ زبردستی اپنی بیوی بنا لیتے ہیں اور انھیں تبدیلیِ مذہب پر بھی مجبور کرتے ہیں۔ آپ کچھ ایسی فکر کیجیے کہ اس کفر سے مسلمانوں کو نجات ملے۔" تب سید صاحب نے فرمایا کہ ان شاء اللہ میں عنقریب سکھوں پر جہاد کروں گا۔ (ص ۱۱۵۔ تراجم علمائے حدیث۔ مؤلفہ ابویحیٰ امام خاں شہروی۔ الکتاب انٹرنیشنل بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵)

جب ہندوستان کا یہ دورۂ تحریض و تحریص علی الجہاد ختم ہو چکا تو جہاد کے لئے نفیر عام ہوا۔ غازیان اسلام سید صاحب کی قیادت میں راہِ خدا میں سر بکف ہو کر نکلے...... ہزاروں غازی سوار و پیدل مسلمان بھائیوں کو سکھوں کے دستِ ظلم سے رہا کرانے کے لئے سروں سے کفن باندھ کر جا رہے تھے۔ (ص ۱۱۶۔ تراجم علمائے حدیث مؤلفہ ابویحیٰ امام خاں نوشہروی)

قدیم علمائے اہل حدیث و علمائے دیوبند و جملہ مؤرخین اس بات پر متفق تھے کہ سید احمد رائے بریلوی و شاہ اسمٰعیل دہلوی صرف سکھوں سے جہاد کا وعظ و اعلان کر کے پنجاب و سرحد گئے تھے۔ اور اسی راہ میں وہ اپنے بہت سے ساتھیوں کے ہمراہ جاں بحق بھی ہوئے۔ اور یہی تاریخی حقیقت بھی ہے جس کی مستند شہادتیں آپ گذشتہ صفحات میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

فتح ونصرت کے اِلہامات اور بشارتوں کا انجام

عہد محمد شاہ بادشاہِ دہلی میں محمد طالع خاں افغانستان سے ہندوستان آیا۔ یہ سالارزئی پٹھان تھا۔ روہیل کھنڈ کی کئی لڑائیوں میں اس نے شرکت کی۔ آخر میں سنبھل، مرادآباد میں اس نے سکونت اختیار کرلی۔ اسی محمد طالع خاں کے بیٹے محمد حیات خاں کا نامور فرزند امیر خاں ہے۔ اس امیر خاں نے شجاعت و بہادری اور سپہ گری میں بڑا کمال حاصل کیا اور اپنا ایک گروہ بنا کر مختلف مراحل ومنازل سے گذر کر اس نے اپنی ایک زبردست فوجی قوت وطاقت بنالی اور کئی بار مرہٹوں اور انگریزوں سے اس نے خوں ریز جنگیں کیں۔ جناب سید احمد رائے بریلوی صاحب ۱۸۱۰ء میں اسی امیر خاں سے وابستہ ہوئے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر قیام الدین احمد لکھتے ہیں:

> ''سید احمد کے والد کا انتقال ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ ہوا۔ اس کے فوراً بعد وہ تلاشِ روزگار میں لکھنؤ گئے۔ وہاں سے دہلی چلے گئے۔ جہاں شاہ ولی اللہ کے فرزند اور جانشین شاہ عبدالعزیز سے ملے اور ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۶ء کے قریب ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی......
>
> ......وہ ۱۲۲۶ھ/ ۱۸۰۸ء کے شروع میں دہلی سے بریلی لوٹے اور وہاں دو برس مقیم رہے۔

......ایک نظام کے قیام کی (جو فوجی ہو تو مرجح ہے) کی ضرورت محسوس کی (مکتوبات سید احمد۔ از مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی صفحہ ۱۰۲۔۱۰۳)۔ یہی احساس ان کو ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء میں دوبارہ دہلی لے گیا۔ اور اسی نے پھر کچھ ہی بعد ٹونک میں نواب امیر خاں کی فوج میں شامل ہونے پر آمادہ کیا۔ سید احمد کے بڑے بھائی سید ابراہیم پہلے سے نواب کی فوج میں تھے۔ سید احمد کی پرہیزگاری اور علم و فضل کی بنا پر ان کو فوج میں پیش امام کے عہدے پر تعینات کیا گیا۔ (ص ٦٠۔ ہندوستان میں وہابی تحریک)

امیر خاں کے بارے میں مولانا غلام رسول مہر (متوفی ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء) لکھتے ہیں:

> ''غرض امیر خاں آخری دور کے آزاد ہندوستانی امیروں میں سب سے بڑھ کر طاقتور تھا۔ ایک موقعہ پر اس کے پاس چالیس ہزار جاں باز جمع ہوگئے تھے اور ایک سو پندرہ توپیں تھیں۔

اتنی عظیم الشان قوت کو انگریز قلب ہند میں آزاد چھوڑنے کے روادار نہ ہوسکتے تھے لیکن انھیں یہ حوصلہ بھی نہ تھا کہ امیر خاں سے کھلے میدان میں ٹکرائیں۔ اس لئے کہ جانتے تھے کہ مَن چلا آدمی ہے۔ مقابلے پر ڈٹ جائے گا تو ممکن ہے کہ دوسری ملکی قوتیں بھی جو بظاہر دب گئی تھیں، ابھر آئیں اور ہمیں بوریہ بستر سمیٹ کر ہندوستان سے نکل جانا پڑے۔

وہ امیر خاں سے ٹکرائے نہیں لیکن جو عناصر اس کے لئے کمک ویاوری کا سرچشمہ بن سکتے تھے انھیں ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ توڑتے رہے۔ یہاں تک کہ اس کی فوج میں بھی انگریزی ریشہ دوانیاں خاصی پھیل گئیں۔ (ص ۹۱ و ۹۲۔ سید احمد شہید مؤلفہ غلام رسول مہر۔ طبع سوم مطبوعہ لاہور ۱۹٦۸ء)

سید احمد رائے بریلوی بطور خود رائے بریلی سے ٹونک گئے۔ اس سفر کا کوئی تعلق حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) سے نہیں تھا نہ ہی اس سلسلے میں کوئی معمولی سے معمولی روایت کسی بھی معاصر تاریخ میں ملتی ہے۔ خود غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

> ''جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اس سے صاف آشکارا ہے کہ سید صاحب نے بطور خود یہ فیصلہ صادر فرمایا۔ شاہ (عبدالعزیز) صاحب کے امر وحکم کو اس اقدام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انھیں رائے بریلی ہی میں غیبی اشارہ ہوا کہ نواب کے پاس جاؤ۔ چنانچہ وہ نکل پڑے اور دہلی ہوتے ہوئے راجپوتانہ پہنچ گئے۔ (ص ۹۳۔ سید احمد شہید مؤلفہ غلام رسول مہر)
>
> ''خود سید صاحب کا بیان ہے کہ غیبی اشاروں کی بنا پر وہ نواب صاحب کے لشکر میں گئے تھے۔ وقائع میں ہے کہ جب وہ لشکر میں تھے تو ایک روز فرمایا! قصبہ رائے بریلی میں مجھ کو جناب الٰہی سے الہام ہوا کہ یہاں سے نواب نامدار امیر الدولہ بہادر کے لشکر میں جا۔ وہاں کی خدمت ہم نے تجھ کو دی۔

وہاں ہم کو تجھ سے کچھ اور بھی کام لینے ہیں۔
یہ مژدۂ غیبی سن کر میں وہاں سے روانہ ہوا۔ چند روز میں آ کر ملازمت
نواب ممدوح کی حاصل کی۔ (ص ۸۷۔ سید احمد شہید از غلام رسول مہر)

''جب سید احمد نے سواروں میں نام لکھوایا ہے تو آپ امیر خاں کے آگے پیش کیے گئے۔
وہ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے کہا:
اگر اپنی جان کھپا کر محنت کی اور اپنی جواں مردی کے جوہر دکھائے تو میں آپ کو ایک ہزار
فوج کا افسر بنادوں گا۔ (ص ۴۱۷۔ حیات طیبہ مؤلفہ مرزا حیرت دہلوی۔ مطبوعہ اسلامی اکیڈمی
لاہور۔ ۱۹۷۶ء)

''جب پے درپے یہ باتیں سید احمد صاحب سے ظہور پذیر ہوئیں پھر تو امیر خاں نے اپنا
مشیر مقرر کرلیا۔ اور کوئی کام آپ کے مشوروں کے بغیر نہ کرتا تھا۔
ساتھ ہی ان کامیابیوں کے جو سید صاحب کو حاصل ہوئیں، یہ خوشی سے دیکھا جاتا ہے کہ
آپ نے اس ترقی پر بھی اپنے فرائض کے انجام دینے میں پہلو تہی نہ کی۔ (ص ۴۱۸۔ حیات
طیبہ مرزا حیرت دہلوی)

''امیر خاں کے لشکر کی کوئی قاعدہ تنخواہ نہ تھی۔ کسی ریاست پر چھاپہ مارا۔ اگر وہاں سے کچھ
ہاتھ لگ گیا تو باہم تقسیم ہو گیا نہ ہاتھ لگا تو لشکر میں فاقہ کشی ہو رہی ہے۔ لٹیروں کی سی کیفیت تھی۔
کبھی جے پور پر حملہ کر کے یہاں زلزلہ ڈال دیا اور کبھی جودھپور جادوڑا اور وہاں ایک ہلکم مچادی۔
(ص ۴۱۷۔ حیات طیبہ)

منشی محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۵ء) امیر خاں اور انگریزوں کی ایک جنگ کی
حیرت انگیز منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک روز کا ذکر ہے کہ لشکر نواب امیر خاں مرحوم انگریزوں کے لشکر سے لڑ
رہا تھا۔ دونوں طرف سے توپ اور بندوقیں چل رہی تھیں۔ اس وقت سید
صاحب اپنے خیمے میں تشریف رکھتے تھے۔ آپ نے اپنا گھوڑا تیار کرایا اور
اس پر سوار ہو کر مثل ہوا کے دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ
گئے جہاں انگریزی فوج کا سپہ سالار مع اپنے مصاحبوں کے کھڑا تھا۔

پس وہاں سے اس سپہ سالار کو لے کر پھر دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے
اپنے خیمے تک چلے آئے۔ یہاں آ کر تھوڑی سی بات چیت کے بعد سپہ
سالارِ مذکور نے عہد کرلیا کہ میں اسی دم اپنے لشکر کو مقابلۂ نواب امیر خاں
سے واپس لے جاؤں گا۔ اور پھر مقابلہ کو نہ آؤں گا۔
بلکہ جہاں تک ممکن ہوگا اپنی سرکار کو اس بات پر مجبور کروں گا کہ نواب
امیر خاں سے صلح کرلے۔

اس واقعہ کے بعد پھر سرکار انگریزی اور نواب امیر خاں میں جنگ نہیں ہوئی۔ بلکہ صلح کی
بات چیت اور رسل ورسائل شروع ہو گئے۔ اور

لارڈ ہسٹنگ صاحب بہادر وائسرائے ہند کے عہد میں ٹونک کا ملک نواب صاحب کو دے
کر صلح کرلی گئی۔ (ص ۷۱۔ حیات سید احمد شہید۔ مؤلفہ محمد جعفر تھانیسری۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء)
ابھی صلح کی بات چیت طے نہیں ہوئی تھی کہ سید صاحب سات برس کے قیام کے بعد لشکر
نواب امیر خاں سے جدا ہو کر دوبارہ ۱۸۱۶ء میں دہلی تشریف لے گئے۔

......اپنے چلنے کے وقت آپ نے یہ پیش گوئی کی تھی جس کو نواب وزیر الدولہ مرحوم (بن
نواب امیر خاں) اپنے وصایائے وزیری میں اس طرح لکھتے ہیں:
سید صاحب نے مولوی نذیر محمد صاحب سے کہ وہ بھی اس لشکر میں موجود تھے اپنے رخصت
ہونے کے وقت فرمایا تھا کہ:

''اب جلد صلح ہو جائے گی اور فلاں فلاں شہر، فلاں فلاں علاقہ، سرکار
انگریزی نواب صاحب کو دے دے گی۔ اور ایک زمانہ گذرنے کے بعد
ان شاء اللہ تعالیٰ میں بھی ایک لشکرِ مجاہدین کو ساتھ لے کر نشانوں کے پھر
یرے اڑاتا ہوا نواب امیر خاں صاحب کے ملک سے گذروں گا۔''

اس پیشن گوئی کے ذکر کرنے کے بعد نواب وزیر الدولہ مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ:
موافق اس پیشین گوئی کے جو جو شہر اور ممالک آپ نے بتائے تھے ٹھیک وہی سرکار انگریزی
نے ہم کو دیے اور صلح ہو گئی۔ (ص ۷۱ و ۷۲۔ حیات سید احمد شہید۔ مؤلفہ محمد جعفر تھانیسری)
اس صلح و کارگذاری کا ذکر کرتے ہوئے مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں:

مگر ایک ناموری کا کام آپ "۱۲۳۱ھ تک سید احمد صاحب امیر خاں کی ملازمت میں رہے
نے یہ کیا کہ انگریزوں اور امیر خاں کی صلح کرادی۔ اور آپ ہی کے ذریعہ جو شہر بعد ازاں دیے
گئے اور جن پر آج تک امیر خاں کی اولاد حکمرانی کرتی ہے، دینے طے پائے تھے۔
لارڈ ہسٹنگ سید احمد صاحب کی بے نظیر کارگذاری سے بہت خوش تھا۔ دونوں لشکروں کے
بیچ میں ایک خیمہ کھڑا کیا گیا۔ اور اس میں تین آدمیوں کا باہم معاہدہ ہوا۔ امیر خاں،
لارڈ ہسٹنگ، اور سید احمد۔
سید احمد صاحب نے امیر خاں کو بڑی مشکل سے شیشہ میں اتارا تھا۔ آپ نے اسے یقین
دلایا تھا کہ انگریزوں سے مقابلہ کرنا اور لڑنا بھڑنا اگر تمہارے لئے برا نہیں ہے تو تمہاری اولاد کے
لئے سم قاتل کا اثر رکھتا ہے۔
انگریزوں کی قوت دن بہ دن ترقی پذیر ہے اور تمام قومیں پے در پے تنزل کرتی جارہی
ہیں۔ تمہارے بعد فوج کو کون سنبھالے گا؟ اور عظیم الشان لشکر انگلشیہ کے مقابلے میں کون میدانِ
جنگ میں لا کے جمائے گا؟
یہ باتیں امیر خاں کی سمجھ میں آگئی تھیں اور اب وہ اس بات پر رضامند تھا کہ گذارہ کے لئے
کچھ ملک مجھے دے دیا جائے تو میں بہ آرام بیٹھوں۔
امیر خاں نے ریاستوں اور ان کے ساتھ انگریزوں کا بھی ناک میں دم کر رکھا تھا۔
آخر ایک بڑے مشورہ کے بعد سید احمد صاحب کی کارگذاری سے ہر ریاست میں سے کچھ
کچھ حصہ دے کر امیر خاں سے معاہدہ کرلیا۔ جیسے جے پور سے ٹونک دلوایا اور بھوپال سے سرونج۔
اسی طرح سے متفرق پرگنے مختلف ریاستوں سے بڑی قیل و قال کے بعد انگریزوں نے دلوا کے
بھرے ہوئے شیر کو اس حکمت سے پنجرہ میں بند کردیا۔ (ص ۴۲۱۔ حیات طیبہ۔ مؤلفہ مرزا
حیرت دہلوی، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء۔ طبع اول ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء دہلی)

نومبر ۱۸۱۷ء کے معاہدہ کے تحت جب امیر خاں کا معاملہ نمٹ گیا تو ۱۲۳۱ھ/ ۱۸۱۶ء میں
سید احمد رائے بریلوی صاحب نے ٹونک کو خیر باد کہا اور کچھ عرصہ بعد ۱۲۳۶ھ/ ۱۹۲۱ء میں سید احمد
رائے بریلوی صاحب ایک قافلہ کے ساتھ حج کے لئے روانہ ہوگئے۔
مؤرخین و سوانح نگار لکھتے ہیں کہ جگہ جگہ اس قافلے کا استقبال ہوا۔ دوران سفر بہت سے

لوگوں نے دعوتیں اور ضیافتیں بھی کیں جن میں انگریز بھی شامل ہیں۔ انگریزی حکومت کے
مقربین نے بھی بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ چنانچہ اس سلسلے کے تین اہم واقعات یہاں نقل
کیے جارہے ہیں۔

محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۵ء) لکھتے ہیں:

"جب وہ مشعلیں کنارے کے نزدیک پہنچیں تو دیکھا کہ ایک انگریز
گھوڑے پر سوار مختلف قسم کا بہت سا کھانا ساتھ لیے چلا آتا ہے۔ اُس نے
کشتی کے نزدیک آکر پُوچھا: پادری صاحب کہاں ہیں؟ جب حضرت نے
کشتی میں سے جواب دیا تو وہ گھوڑے سے اُتر کر اور اپنی ٹوپی سر سے اتار
کر بہت ادب سے حضرت کے سامنے کشتی میں آیا۔
بعد سلام و مزاج پُرسی کے عرض کیا کہ تین روز سے میں نے حضور کی تشریف
آوری کی خبر لانے کے لیے نوکر اس طرف متعین کر رکھے تھے، سو آج انھوں
نے مجھ کو خبر دی، لہذا یہ ماحضر، حضور اور کل قافلے کے لئے تیار کر کے لایا
ہوں، براہِ بندہ نوازی اس کو قبول فرمائیں۔ حضرت نے اپنے آدمیوں کو حکم
دیا کہ فوراً وہ کھانا اپنے برتنوں میں لے کر قافلے میں تقسیم کردو۔
تقریباً دو گھڑی تک وہ انگریز حضور میں حاضر رہا، پھر رخصت لے کر مع
اپنے آدمیوں کے واپس چلا گیا۔" (ص ۱۴۱۔ حیات سید احمد شہید۔ مطبوعہ
کراچی ۱۸۶۸ء)

خانوادۂ سید احمد رائے بریلوی کے ایک مشہور عالم و مصنف مولانا ابوالحسن علی ندوی (متوفی
۱۹۹۹ء) یہی واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ انگریز گھوڑے پر سوار چند پالکیوں میں کھانا
رکھے کشتی کے قریب آیا اور پوچھا کہ پادری صاحب کہاں ہیں؟ حضرت
نے کشتی پر سے جواب دیا کہ میں یہاں موجود ہوں۔ انگریز گھوڑے پر
سے اُترا اور ٹوپی ہاتھ میں لیے کشتی پر پہنچا اور مزاج پُرسی کے بعد کہا کہ تین
روز سے میں نے اپنے ملازم یہاں کھڑے کردیئے تھے کہ آپ کی اطلاع

کریں۔آج انھوں نے اطلاع کی کہ اطلب یہ ہے کہ حضرت قافلہ کے
ساتھ تمہارے مکان کے سامنے پہنچیں۔یہ اطلاع پاکر غروب آفتاب تک
میں کھانے کی تیاری میں مشغول رہا۔ تیار کرانے کے بعد لایا ہوں۔
سید صاحب نے حکم دیا کہ کھانا اپنے برتنوں میں منتقل کرلیا جائے۔ کھانا
لے کر قافلے میں تقسیم کردیا گیا اور انگریز دو تین گھنٹہ ٹھہر کر چلا گیا۔"
(ص ۱۹۰۔سیرت سید احمد شہید۔جلد اول۔مؤلفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی)

انگریز حامی راجہ بنارس کے ایک معتمد مختار شیخ غلام علی کی الٰہ آباد میں شاہانہ مہمان نوازی کا ذکر مولانا غلام رسول مہر (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) اس طرح کرتے ہیں:

"شیخ غلام علی نے ہر ایک سے کہہ دیا تھا کہ دورانِ قیامِ الٰہ آباد میں کوئی
صاحب سید صاحب کو کھانے کی تکلیف نہ دیں۔یہ احسان صرف میرے
ذمے رہنے دیا جائے۔ہاں اپنے مکان پر لے جاکر پان کھلائیں، عطر
لگائیں، نذریں پیش کریں، کھانا نہ کھلائیں۔چنانچہ سید صاحب جب تک
الٰہ آباد میں ٹھہرے رہے پورے قافلے کی مہمان داری شیخ غلام علی نے
فرمائی اور کس شان واہتمام کے ساتھ؟ آج اس کی تفصیلات سن کر شاید
اکثر لوگ سمجھیں گے کہ خیالی افسانہ بیان ہو رہا ہے۔ حالاں کہ شیخ
صاحب نے تواضع اور مدارات کا جو نمونہ پیش کیا اُس کی محض سرسری
کیفیت ہم تک پہنچ سکی ہے۔

شیخ صاحب مہاراجہ اودت نرائن والی بنارس کے مختار تھے۔انھوں نے سید
صاحب کو ایک کوٹھی میں ٹھہرایا۔باقی قافلے کے لئے مہاراجہ کی بارہ دری
خالی کرائی۔پورے قافلے کے لئے دونوں وقت کا کھانا قیام گاہوں پر پہنچ
جاتا تھا۔اور کیسا کھانا؟ ایک ایک وقت میں کئی کئی چیزیں تیار ہوکر آتیں
مثلاً قورمہ، پلاؤ، زردہ، شیرمال، تازہ مٹھائی، خمیری روٹیاں۔

اس وقت تک ساتھیوں کی تعداد ساڑھے سات سو ہوچکی تھی لیکن شیخ
صاحب کے تکلف میں کوئی کمی نہ آئی۔اندازہ کیا گیا کہ کم از کم ایک ہزار
روپے روزانہ کھانے پر صرف ہوتے تھے اور یہ اس زمانے کا خرچ ہے

جب جنسیں بے حد ارزاں تھیں۔

شیخ صاحب دن میں دو مرتبہ سید صاحب سے ملنے کے لئے آتے۔ایک
مرتبہ بعد نماز ظہر، دوسری مرتبہ بعد نماز مغرب۔ دونوں مرتبہ بیش بہا
نذریں ساتھ لاتے، مثلاً نہایت قیمتی پارچے، عمدہ بندوقیں، پستول اور
تلواریں، بعض اوقات نقد روپیہ لے آتے۔واقف کار اصحاب کا اندازہ
ہے کہ بارہ پندرہ روز کے قیام میں شیخ صاحب نے اس طریق پر جو نذریں
پیش کیں، وہ بہ حیثیت مجموعی بیس ہزار سے کم نہ ہوں گی......

اِسی دوران میں شیخ صاحب نے ایک بڑا خیمہ اور بارہ چھوٹے خیمے نئے
تیار کرا کے پیش کیے کہ سفر میں کام آئیں گے۔قافلے کے ہر فرد کو ایک ایک
جوڑی نئے جوتے، مردوں کو دو دو پاجامے، دو انگرکھے، دو دو ٹوپیاں اور
ایک ایک چادر۔مستوارت کو دو دو پاجامے، دو دو کرتے اور دو دو دوپٹے
دیئے۔سب کو سرِ عام ایک ایک روپیہ دیا۔سید صاحب کے اقرباء کی
خدمت میں دس دس روپے فی کس پیش کیے۔علما کی خدمت میں اُن کی
حیثیت و مرتبہ کے مطابق نذریں گزرانیں۔

سید صاحب کے لئے روزانہ پانچ سو روپے یا کسی وقت کم یا زیادہ لے کر
آتے۔دونوں وقت کھانے کے ساتھ ایک سو چالیس روپے بھجواتے۔ایک
روز سید صاحب کی دونوں بیویوں کو اسّی اسّی روپے دیئے گئے۔لُطف یہ کہ
جب نذریں پیش کرتے تو بڑے ہی انکسار سے تہی دستی کا اظہار فرماتے۔

رخصت کے وقت سید صاحب کی خدمت میں جو سامان لائے وہ بیس
پچیس کشتیوں میں لدا ہوا تھا۔اُس میں مشروع، کمخواب، پشمینے، نینو،
ڈھاکے کی ململ، محمودی، بناری اطلس وغیرہ کے تھان بھی تھے اور کشمیری
شال بھی۔ان کے علاوہ ساڑھے چار ہزار روپے نقد تھے۔دو نہایت
خوبصورت مُطلّا اور مُذہّب قرآن مجید نذر کیے۔ (ص ۱۹۰ تا ۱۹۲۔سید
احمد شہید، مؤلفہ غلام رسول مہر۔مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء)

کلکتہ کے ایک متمول سرکاری وکیل منشی امین الدین نے اس طرح دریادلی کا ثبوت دیا:

''اس وقت منشی امین الدین صاحب وکیل سرکار جو کلکتہ کے مسلم رؤسا میں تھے مع بہت سے عمائد ساکنانِ کلکتہ کے خدمت شریف میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کلکتہ میں قیام تک اس خاکسار کے غریب خانہ میں مقیم رہیں اور جو نان و نمک میسر ہوں قبول فرمائیں۔ حضرت نے ان کی درخواست کو قبول کرلیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد اور بہت سے شریف و نجیب کلکتہ کے وہاں پہنچے اور حضرت کو اپنے اپنے مکانات کو لے جانا چاہا۔ مگر چوں کہ حضرت نے منشی امین الدین سے وعدہ کرلیا تھا، اس واسطے اُن کی درخواست کو منظور نہ فرمایا۔ نماز مغرب کے بعد اول حضرت بہ سواری پالکی منشی امین الدین کے مکان کو تشریف لے گئے اور پھر منشی صاحب نے ہر قسم کی سواریاں بھیج کر آدھی رات تک سارے قافلے کو اپنے مکان میں پہنچا دیا۔ ایک عمدہ باغ میں قافلے کا ڈیرہ کرایا گیا۔ رات کو نہایت عمدہ اور پُر تکلف کھانا منشی صاحب کے یہاں سے آیا اور بافراغت سارے قافلے نے سیر ہو کر کھایا۔ صبح منشی صاحب نے سارے قافلے کے واسطے جوتے خرید کر ہر ایک کو تقسیم کر دیئے۔ جس کے پاس کپڑا نہ رہا تھا اس کو کپڑا بنوا دیا۔
(ص ۱۳۶۔ حیات سید احمد شہید، مؤلفہ محمد جعفر تھانیسری، مطبوعہ کراچی)

غلام رسول مہر صاحب رقم طراز ہیں:

''منشی صاحب نے دریا کے کنارے بہت بڑی دری بچھوادی تھی اور ہر قسم کی سواریاں بکثرت منگالی تھیں مثلاً پینیس، ڈولیاں، بگھیاں، کرانچیاں، ہوادار وغیرہ۔ بار برداری کے لئے چھکڑے موجود تھے۔ مزدور بھی خاصی تعداد میں جمع تھے۔ پہلے مستورات کو پردہ کرا کے اتارا گیا اور قیام گاہ پر بھیج دیا۔ پھر مرد سوار ہوئے۔ سواریاں اتنی زیادہ تھیں کہ بہت سی خالی واپس کرنی پڑیں۔
منشی صاحب سید صاحب کو پنیس میں سوار کرا کے پہلے اپنے مکان پر لے گئے، پھر قیامگاہ پر پہنچایا، جہاں تمام کمرے فرش سے آراستہ تھے اور ہر کمرے میں ضرورت کے مطابق پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ متعدد اکابر نے

بھی اپنے اپنے ہاں ٹھہرانے کی درخواست کی، لیکن سید صاحب نے فرمایا کہ منشی امین الدین احمد کے ساتھ اقرار ہو چکا ہے اس لئے معذور ہوں، البتہ دعوت قبول کرلوں گا۔
تین روز تک منشی صاحب کے ہاں سے نہایت پُر تکلف کھانے آتے رہے، مثلاً قورمہ، شیرمال، باقرخانیاں، ماہی پلاؤ، بکرے کا پلاؤ، کئی قسم کے مربے اور اچار، کئی قسم کے میٹھے۔ سید صاحب کے لئے جو کھانا آتا اس میں اور بھی کئی قسمیں ہوتیں۔ تیسرے روز آپ نے فرمایا کہ ہمارے لئے صرف ایک قسم کا کھانا آئے۔ انواع و اقسام کے کھانے کو اہلِ قافلہ میں تقسیم کرنا بھی مشکل ہے اور ہم لوگ تکلفات کو اچھا بھی نہیں سمجھتے۔
منشی صاحب نے سمجھا کہ شاید کھانا اچھا نہیں ہوتا اس لئے تکلفات میں مزید اہتمام و اضافہ کر دیا۔'' (ص ۲۰۷۔ سید احمد شہید۔ مؤلفہ غلام رسول مہر)
''منشی صاحب نے پورا باغ سید صاحب کی نذر کر دیا تھا۔ اس میں نارنگی، چکوترے، سنگترے، کیلے، انجیر، انار، امرود، ناریل، آم وغیرہ کے درخت تھے۔ انگور کی بیلیں بھی تھیں، اناس بھی تھے۔'' (ص ۲۰۸۔ سید احمد شہید ۔ مؤلفہ غلام رسول مہر)

منشی امین الدین سرکاری وکیل کلکتہ کا تعارف کراتے ہوئے غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

''اس مقام پر کلکتہ سے ایک تیز رفتار کشتی میں جسے پنیس کہتے تھے ایک صاحب آئے اور سید صاحب سے ملے۔ نام پوچھا تو بتایا! امین الدین۔ یہ منشی امین الدین احمد تھے جو بنگال کے اونچے گھرانے کے فرد تھے اور کلکتہ کے ممتاز امیروں میں گنے جاتے تھے۔ انگریزی کمپنی میں انھیں وکالت کا عہدہ حاصل تھا اور کمپنی کے پورے ہندوستانی علاقوں میں سے جتنے مقدمات کلکتہ کی مرکزی حکومت کے پاس پیش ہوتے تھے، سب منشی صاحب ہی کی وساطت سے پیش ہوتے تھے۔ ان کی ماہانہ تنخواہ مقرر نہ تھی، لیکن حقِ وکالت کی رقم اتنی بن جاتی تھی کہ صاحبِ ''مخزن احمدی'' کے بیان کے مطابق ہر مہینے کے اختتام پر تیس چالیس ہزار روپے کی تھیلیاں

ہاتھی پر لد کر ان کے گھر پہنچی تھیں۔" (ص ۲۰۵۔ سید احمد شہید۔ مؤلفہ غلام رسول مہر۔ مطبوعہ لاہور)

کلکتہ میں حاصل شدہ نذور وفتوح میں سے کچھ مختصراً وملخصاً اس طرح بیان کی جاتی ہیں:

" کلکتے والوں کے تحائف وہدایا کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو سکا اُس کی سرسری کیفیت یہ ہے:

۱۔ منشی امین الدین احمد: پانچ ہزار نقد، تین سو جوڑے جوتے، چار گٹھری کپڑے، ایک میں سفید تھان یعنی لٹھا، ململ وغیرہ، دوسری میں سوسی اور چھینٹ کے تھان، باقی گٹھریوں میں موٹا کپڑا۔ دو نہایت خوبصورت گھڑیاں۔ پانچ ہزار روپے اس غرض سے (مزید) پیش کیے کہ ممکن ہے بعض اوقات سید صاحب کے رفقا کو مزاج کے مطابق کھانا نہ ملا ہو اور انھوں نے پیسے خرچ کر کے بازار سے کھایا ہو۔

۲۔ امام بخش سوداگر: تین سو روپے، بیس اشرفیاں، پندرہ تھان سفید اور چھینٹ کے۔ دو شیشیاں عطر کی، جن میں پانچ پانچ تولے عطر تھا۔

۳۔ غلام حسین تاجر: چار جہاز پورے نذر کیے اور اُن کے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی مہیا کر دیا۔ چوں کہ انتظام ہو چکا تھا، اس لئے سید صاحب نے یہ نذر بشکریہ واپس کر دی۔ غلام حسین نے اپنے لڑکے کو ساتھ کر دیا۔ یقین ہے کہ بڑی رقم بھی دی ہوگی، اُس کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ (ص ۲۱۵۔ سید احمد شہید، مؤلفہ غلام رسول مہر، مطبوعہ لاہور)

جنوری ۱۸۲۶ء سے رائے بریلی تا پنجاب وسرحد کا سفر بھی سفر وملازمتِ ٹونک کی طرح الہامات اور بشارتوں کے سایے میں ہوا جس کا بیان سید احمد رائے بریلوی صاحب نے متعدد امرا وحکام اور والیانِ ریاست کے نام اپنے خطوط میں خود ہی کیا ہے۔ ایسے ہی چند خطوط یہاں نذرِ قارئین کیے جا رہے ہیں۔

خانِ خانان خلجائی رئیس قلات کے نام سید احمد رائے بریلوی تحریر فرماتے ہیں:

......اس کے علاوہ عرض یہ ہے کہ اس فقیر کو بارہا پردۂ غیب سے وارد ہونے والی روحانی باتوں اور ربانی الہام کے ذریعہ جہاد کے نافذ کرنے اور کفر وفساد کے دفعیہ کے لئے صاف اور صریح اشاروں کے ساتھ مامور کیا گیا ہے اور فتح وکامیابی کی سچی بشارتوں کی خبر دی گئی ہے۔ اور

چوں کہ الہامی وعدے اس بادشاہِ حقیقی کے کلام کے مطابق ہوا کرتے ہیں اس لئے ان کو ضرور مان لینا چاہیے۔ اور ان پر عمل کرنا چاہیے۔ (ص ۵۰۔ ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید۔ مؤلفہ محمد جعفر تھانیسری، مترجمہ سخاوت مرزا۔ مطبوعہ ۱۹۶۹ء۔ نفیس اکیڈمی کراچی)

فولاد جنگ بہادر کے نام رقم طراز ہیں:

......نیز غیبی اشاروں اور بشارتوں کے بموجب جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں جس کی اس فقیر کو بشارت دی گئی ہے، عنقریب فتح ونصرت ظہور پذیر ہوگی۔ اور بے شمار خزانے ذلیل وخوار کافروں کے شہروں سے لے کر دریائے ستلج تک نیک لوگوں کے قبضے میں آ جائیں گے۔ (ص ۲۱۳۔ ترجمۂ مکتوبات)

شاہ بخارا کے نام اس طرح لکھتے ہیں:

"قیامِ جہاد کے معاملے اور کفر وفساد کے رفع دفع کرنے کے لئے الہام اور روحانی مکالمہ کے ذریعہ غیبی امامت سے اس فقیر کو مشرف فرمایا اور ہم کو فتح و نصرت کے متعلق ایسی بشارتوں کا مُخبر اور اس پروردگار عالم کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے مؤثر کارروائی کے لئے اور سید المرسلین کی سنت کی اِحیا اور سرکش کافروں کی بیخ کنی اور بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے مامور فرمایا ہے اور اپنے سچے وعدوں کے بموجب مظفر ومنصور کے لقب سے ملقب فرمایا ہے۔ (ص ۸۸۔ ترجمۂ مکتوبات)

فیض اللہ خاں مہمند مشیرِ سلطان محمد خاں والیِ پشاور کے نام لکھتے ہیں:

"آپ کے ذہن ودماغ پر اس خاکسار کا معاملہ آفتاب نصف النہار کی طرح ظاہر وباہر ہے کہ میں قوم سکھ جیسے دشمنوں سے جہاد کے لئے مامور ہوں۔ اور فتح ونصرت کا مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس بادشاہِ منان کے وعدوں کے خلاف یہ سب وہم وگمان، کافروں اور گمراہوں کے وسوسے ہیں نہ کہ دین داروں اور ایمان والوں کی سمجھ بوجھ ہے۔ (ص ۳۷۳۔ ترجمۂ مکتوبات)

یار محمد خاں حاکم یاغستان کے نام سید احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

فقیر اس خصوص میں غیبی اشارہ کی بنا پر مامور ہے اور اس مبشر کی بشارت میں شک وشبہ کی

خواہش کا شائبہ اس رحمانی الہام میں
گنجائش نہیں۔ ہرگز ہرگز کسی شیطانی وسوسہ اور نفسانی
شامل نہیں ہے۔
حاصل کلام یہ کہ فقیر کو حکمِ الٰہی کی تعمیل بتہِ دل سے منظور ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر
کامل اعتماد ہے لیکن
سوال یہ ہے کہ اللہ کا یہ وعدہ کس طرح ظہور پذیر ہوگا؟ اس بندے کو جس کا شعار بندگی ہے کیا طاقت ہے کہ وہ اپنے مالک سے یہ پوچھے کہ تو اپنا
وعدہ کس طرح پورا کرے گا؟
ایسا سوال آداب وقانونِ عبودیت کے خلاف ہے۔ غرض میں ایسی چناں وچنیں کی باتوں
سے بیزار ہوں۔ اور محض اس کی بندگی کے دسترخوان کا ریزہ چین ہوں۔ (ص ۴۰۔ مکتوبات سید
احمد شہید مؤلفہ محمد جعفر تھانیسری مع ترجمہ اردو از فارسی۔ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۶۹ء)

امارت وامامت کا ۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۷ء میں اس طرح اشتہار واعلان خود سید احمد رائے بریلوی
صاحب نے جاری کیا۔

اللہ کا شکر واحسان ہے کہ اس مالک حقیقی اور بادشاہِ تحقیقی نے اس گوشہ نشیں فقیر عاجز اور
خاکسار کو پہلے تو غیبی اشاروں اور اپنے الہامات کے ذریعہ جن میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں
خلافت کا اہل ہونے کی بشارت دی۔

دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی بڑی جماعت اور خاص وعام کی تالیف قلوب کے لئے مرتبۂ
امامت سے مجھ کو مشرف فرمایا۔

چنانچہ بتاریخ ۱۲ر جمادی الثانی روز پنج شنبہ ۱۲۴۲ھ سادات کرام، علماء مشاہیر اور بڑے
بڑے مشائخ اور باحشمت صاحبزادوں اور بلند مرتبت خوانین نے مع تمام خاص وعام
مسلمانوں کے میرے ہاتھ پر بیعت کر کے مجھ کو اپنا امام قرار دیا۔ اور میری امامت اور حکومت کو
تسلیم کر کے میری اطاعت پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔

اور اس روز سے اب تک یہ بیعت اس فقیر کے ہاتھ پر جاری ہے اور تمام مسلمانوں میں اس
کا چرچا ہے۔ (ص ۱۱۹۔ ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید۔ مؤلفہ جعفر تھانیسری، مترجمہ سخاوت مرزا۔
مطبوعہ کراچی)

رائے بریلی سے روانگیِ سرحد کے وقت (۱۸۲۶ء) کا الہام یہ ہے۔

سید محمد یعقوب آپ کے بھانجے سے روایت ہے کہ بروقتِ روانگیِ خراسان آپ اپنی ہمشیر
یعنی والدۂ سید محمد یعقوب سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے ان سے فرمایا کہ اے میری بہن!
میں نے تم کو خدا کے سپرد کیا۔ اور یہ بات یاد رکھنا کہ جب تک ہند کا شرک، اور ایران کا
رفض، اور چین کا کفر، اور افغانستان کا نفاق میرے ہاتھ سے محو ہو کر ہر مردہ سنت زندہ نہ ہو جائے
گی، اللہ رب العزت مجھ کو نہیں اٹھائے گا۔

اگر قبل از ظہوران واقعات کے کوئی شخص میری موت کی خبر تم کو دے اور تصدیق پر حلف بھی
کرے کہ سید احمد میرے روبرو مر گیا یا مارا گیا تو تم اس کے قول پر ہرگز اعتبار نہ کرنا۔ کیوں کہ
میرے رب نے مجھ سے وعدۂ واثق کیا ہے کہ ان چیزوں کو میرے ہاتھ پر پورا کر کے مارے گا۔

آپ کے سفرِ جہاد سے پہلے آپ کو یہ الہام ربانی ہوا تھا کہ ملکِ پنجاب آپ کے ہاتھوں پر
فتح ہو کر پشاور سے دریائے ستلج تک مثل ملک ہندوستان کے رشک افزائے چمن ہو جائے گا۔
چنانچہ ان متواتر وعدہ ہائے فتح سے آپ کا ہر مرید واقف تھا۔ (ص ۱۷۱ و ۱۷۲۔ حیات سید احمد شہید
محمد جعفر تھانیسری مطبوعہ کراچی)

نواب امیر خاں والی ٹونک نے انگریزوں سے صلح کر لی۔ سرحد و پنجاب پٹھانوں اور سکھوں
کے ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ سید احمد بریلوی صاحب کے الہامات اور
بشارتوں کا یہ ایسا نتیجہ اور انجام ہے کہ اسے مسلمانانِ ہند کی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ
ایسے الہامات اور بشارتوں سے دوچار ہوئے کہ ہزاروں کی تعداد میں اپنی جان سے ہاتھ دھو
بیٹھے، آپس میں ایک دوسرے کا گلا کاٹا اور انگریزوں کے ساتھ امیر خاں کی صلح سے شروع ہونے
والا سلسلہ سرحد و پنجاب پر انگریزوں کی مکمل بالادستی کے اعلان کے ساتھ اختتام پذیر ہو گیا۔

فاعتبروا یا اولی الابصار۔

مذکورہ الہامات اور بشارتوں کا انجام نگاہِ بصیرت اور چشم عبرت سے پڑھنے کے لائق ہے۔

"بملاحظۂ مکتوبات احمدی جن میں سید صاحب کا اصل مافی الضمیر بڑی صراحت کے ساتھ
بیسیوں مختلف واقعات پر ظاہر کیا گیا ہے اور اکثر مؤلفوں کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ وعدۂ فتح
پنجاب کے الہام کا آپ کو ایسا وثوق تھا کہ آپ اس کو سراسر صادق اور ہونے والی بات سمجھ کر بار ہا

فرمایا کرتے تھے اور اکثر مکتوبات میں لکھا کرتے تھے کہ اس الہام میں وسوسۂ شیطانی اور شائبۂ نفسانی کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ ملک پنجاب ضرور میرے ہاتھ پر فتح ہوگا اور اس فتح سے پہلے مجھ کو موت نہ آئے گی۔
لیکن واقعۂ بالاکوٹ خواہ شہادت ہو خواہ غیبوبت بظاہر اس یقینی الہام کے سراسر خلاف ہوا۔ اب اس کا جواب یہی ہے کہ از روئے اصولِ شریعت محمدیہ کے الہام ایک ظنی چیز ہے اور اس کی تاویلوں وغیرہ میں سو طرح کی غلطیوں کا گمان ہوتا ہے۔
یہ تو ضرور ہوا کہ اس وقوعہ کے پندرہ برس بعد سلطنتِ پنجاب متعصب اور ظالم سکھوں کے ہاتھ سے نکل کر ایک ایسی عادل اور آزاد اور لامذہب قوم کے ہاتھ میں آگئی کہ جس کو ہم مسلمان اپنے ہاتھ پر فتح ہونا تصور کر سکتے ہیں۔ اور غالباً سید صاحب کے الہام کی صحیح تاویل یہی ہوگی جو ظہور میں آئی۔ (ص ۲۹۱۔ حیات سید احمد شہید، مؤلفہ محمد جعفر تھانیسری مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء)

سید احمد رائے بریلوی صاحب کے مذکورہ الہامات اور بشارتیں اتنی قطعی اور یقینی تھیں کہ ان کے معتقدین ومجاہدین نے حادثۂ بالاکوٹ میں ہونے والی ان کی موت سے صاف انکار کر دیا اور اکثریت نے عقیدہ کے طور پر ''نظریۂ غیبوبت ورجعت'' کو تسلیم کر لیا کہ وہ ہماری نظروں سے غائب اور اوجھل ہو گئے ہیں۔ ایک عرصہ بعد وہ تشریف لائیں گے اور پھر دشمنوں پر غالب وفاتح ہو کر اپنی حکومت وریاست قائم کریں گے۔

اس عقیدہ کی بنیاد عقیدۂ مہدویت بھی ہے کہ سید احمد رائے بریلوی صاحب امام مہدی ہیں۔ پروفیسر قیام الدین احمد اس سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

''ہندوستانی وہابیت کا دوسرا طرۂ امتیاز ایک مرحلے پر مہدوی تحریک سے اس کا اتفاق تھا۔ مہدیِ موعود کے ظہور کے عقیدے پر ہندوستانی وہابیوں نے کثیر لٹریچر فراہم کر لیا تھا۔ اسی کے بعد سید احمد نے رحلت کی۔ (ص ۵۸۔ ہندوستان میں وہابی تحریک)

عقیدۂ غیبوبت کے بارے میں محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء) لکھتے ہیں:

''مولوی جعفر علی نقوی جو آپ کا باڈی گارڈ تھا اور کندھے سے کندھا ملائے کھڑا تھا، لکھتا ہے کہ:

''جناب حضرت امیر المؤمنین درہم جماعت از نظرِ من غائب شدند۔'' یہ واقعۂ جگر سوز ۲۴ر

ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کو واقع ہوا۔ اس وقت آپ کے غائب ہو جانے کی وجہ سے سارے لشکر اسلام میں ہلچل مچ گئی۔ (ص ۲۸۸۔ حیات سید احمد شہید مطبوعہ کراچی)

مولوی جعفر علی نقوی یہ بھی لکھتے ہیں کہ بعد میں لوگوں کی زبانی اس امر کی تصدیق ہوئی ہے کہ سید احمد صاحب کی ٹانگ پر ایک گولی کا زخم بھی لگا تھا۔ اس زخم کے لگنے کے بعد آپ ایک پتھر پر بیٹھے ہوئے رو بقبلہ دعا مانگ رہے تھے کہ اسی وقت پتھر سے غائب ہو گئے۔ (ص ۲۸۹۔ حیات سید احمد شہید مؤلفہ محمد جعفر تھانیسری)

''سید احمد صاحب کی چھوٹی بیوی صاحبہ جن سے معرکۂ بالاکوٹ سے پہلے سید صاحب نے اپنی غیبوبیت کی پیش گوئی کی تھی اور سید صاحب کے اکثر اقربا اور اہل قافلہ آپ کی غیبوبت کے قائل تھے۔ (ص ۲۹۰۔ حیات سید احمد شہید مطبوعہ کراچی)

غلام رسول مہر (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) صاحب لکھتے ہیں کہ:

''سرحد کے بعض اکابر کہہ رہے تھے کہ انھوں نے واقعۂ بالاکوٹ کے بعد سید صاحب کو زندہ دیکھا ہے۔ مثلاً بھٹکول کے اخوند محمد ارم جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مولوی خیر الدین شیرکوٹی اور مولوی محمد قاسم پانی پتی چند افراد کے ہمراہ اسی بنا پر بھٹکول میں ٹھہر گئے کہ انھیں سید صاحب کے زندہ ہونے کا یقین تھا۔ (ص ۸۱۱۔ سید احمد شہید مؤلفہ غلام رسول مہر)

''سید صاحب کی شہادت کے بعد نیاز مندوں کے ایک گروہ نے ان کی غیبوبت کا مسئلہ کھڑا کر دیا اور مدت تک اس عقیدے کی اشاعت پورے اہتمام سے جاری رکھی۔...... لیکن حیرت ہے کہ سید صاحب کے بعض اکابر خلفا نے بھی اسے قبول کیا۔ نہ محض قبول کیا بلکہ اسے مدت تک دعوتِ اتحاد کا مرکز بنائے رکھا۔ (ص ۸۱۰۔ حوالۂ مذکورہ)

''حد درجہ تعجب اس پر ہے کہ ارادت مندوں کے حلقۂ خاص میں سے اہل صادق پور نے عقیدۂ غیبوبیت کو پورے کاروبارِ جہاد کا مدار ومحور بنایا۔ مولانا ولایت علی صادق پوری مرحوم نے ''دعوت' کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا تھا اس میں لکھتے ہیں کہ:

بالاکوٹ میں شکست اس لئے ہوئی کہ ایمان والوں کے دل میں غرور کا مَیل جمنے نہ پائے۔ شکست کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت (سید احمد) کو چلہ گذاری اور دعاوزاری کے لئے پہاڑوں پر بلایا۔ سچ ہے خلوت بھی انبیا علیہم السلام کی سنت ہے۔...... سید صاحب کی شہادت کی خبر شیطان

نے جھوٹی مشہور کی۔ کیوں نہ ہو؟ یہ (سید صاحب) بھی تو ان (انبیاء) کے پیرو ہیں۔ان کی سنتوں سے کیوں محروم رہیں؟

......اور ہمارے حضرت (سید احمد) کی خلوت کوئی عیسی علیہ السلام کی سی نہ سمجھے کہ کسی سے ملاقات نہیں ہوتی یا ظہور میں ان کے عرصۂ بعید گذرے گا۔ یہاں تو اکثر لوگ جب چاہتے ہیں تھوری سی کوشش سے حضرت کی زیارت سے مشرف ہو جاتے ہیں۔اور ان شاء اللہ عرصۂ قریب میں مثلِ خورشیدِ جہاں کے ظاہر ہو کر عالم کو اپنے انوارِ ھدایت سے منور فرمائیں گے۔(ص ۸۱۳۔سید احمد شہید از غلام رسول مہر)

سید صاحب کی جماعت کو امداد دینے والوں کے خلاف ایک مقدمہ ۱۸۶۴ء میں انبالہ (پنجاب) میں چلا تھا۔جسے انگریزوں کی اصطلاح میں وہابیوں کا بڑا مقدمہ کہا جاتا ہے۔اس میں مولانا یحییٰ علی صادق پوری، مولانا عبدالرحیم صادق پوری، مولوی جعفر تھانیسری اور بعض دوسرے اصحاب ماخوذ تھے۔ اس مقدمے میں کئی اصحاب نے گواہیاں دی تھیں کہ صادق پور (پٹنہ) کے مرکز میں جتنے لوگ پہنچتے تھے انھیں باقاعدہ تلقین کی جاتی تھی کہ سید صاحب کا ظہور قریب ہے۔وہ امامِ وقت ہیں۔ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان کے ظہور سے پہلے مقام ظہور (صوبہ سرحد) پر پہنچ جائے۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری صاحبِ تواریخِ عجیبہ بھی سید صاحب کو زندہ مانتے تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ دو مرتبہ زیارتِ جسمانی کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔اور حضرت (سید احمد) کے زندہ ہونے کا مجھے ایسا یقین ہے جیسا کہ اپنی موت کا۔

مولانا مظفر حسین کاندھلوی فرمایا کرتے تھے کہ سید صاحب سے دس باتیں سنی تھیں۔نو پوری ہو چکی ہیں۔ایک باقی ہے یعنی غیبوبت کے بعد ظہور۔(ص ۸۱۴۔سید احمد شہید از غلام رسول مہر)

مولانا عنایت اللہ اثری وزیرآبادی ایک متاخر سرگروہِ بالاکوٹ مولانا فضل الٰہی (وزیرآبادی متوفی ۱۹۵۱ء) اور نظریہ غیبوبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

اوائل میں ایک دفعہ میں نے سید احمد صاحب کو شہید بتایا تو آپ سخت ناراض ہوئے اور مجھے دھکا دے کر چارپائی سے نیچے گرا دیا۔اور فرمایا کہ وہ زندہ اور غائب ہیں۔عنقریب ظاہر ہوں گے۔ نیز آپ نے اس جماعت کا شایع کردہ ایک رسالہ بنام ''خلاصہ'' مجھے دکھایا جس میں یہ حدیث تھی،

اذا مضت الف و مائتان و اربعون سنة بعث اللّٰہ المھدی۔ فیبایع علیٰ یدہٖ خلق کثیر۔ ثم یُغیبہٗ اللّٰہ تعالیٰ فیرتدون الیٰ دینِ اٰباء ھم اِلا من اتبع کتاب اللّٰہ و سنة نبیہٖ۔

۱۲۴۰ھ کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ مہدی کو بھیجے گا جس کے ہاتھ پر بہت سے لوگ بیعت کریں گے۔پھر انھیں (مہدی کو) اللہ غائب فرما دے گا تو لوگ منحرف ہو کر اپنے آبائی دین کو پھر اختیار کر لیں گے سوائے ان کے جو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی اتباع کرنے والے ہیں۔

مگر یہ روایت حدیث کی کسی بھی کتاب میں نہیں ملی بلکہ جو ذخیرہ موضوعات کے نام سے علمائے کرام نے جمع فرمایا ہے اس میں بھی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد اسے وضع کیا گیا ہے۔

اور ایک روایت یوں بھی بیان کی جاتی ہے: فیقاتل کفرة لاھور۔(اور کفار لاہور سے جنگ کریں گے)۔الخ (ص ۸۶۔مکاتیب العجابہ مرتبہ عنایت اللہ اثری وزیرآبادی۔مطبوعہ لاہور ۱۹۶۹ء)

مولانا عبیداللہ سندھی (متوفی ۱۹۴۴ء) اسی عقیدۂ مہدویت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سید صاحب جیسی خوبیوں کا آدمی ملنا مشکل ہے۔لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے امام ومہدی بننے سے اتنی اچھی تحریک کس طرح تباہ ہوئی۔(ص ۳۴۹۔افادات وملفوظاتِ سندھی۔مرتبہ پروفیسر محمد سرور جامعی۔طبع اول ۱۹۷۲ء لاہور)

پروفیسر محمد سرور جامعی لکھتے ہیں:

بدقسمتی یہ ہوئی کہ سید صاحب نے امامت اور مہدویت کے دعوے کر دیے۔اس سے خواہ مخواہ سرحد کے امرا و خوانین میں بدمزگی پیدا ہوئی۔دوسری طرف امامت اور مہدیت کے بعد جماعتی فیصلوں کی اہمیت نہ رہی۔اس سے عوام پٹھان بگڑ گئے۔نتیجہ یہ نکلا کہ سید صاحب شہید ہو گئے۔(ص ۳۴۹۔افادات وملفوظات)

''مولانا سندھی نے ایک دفعہ بڑے دکھ کے ساتھ فرمایا:

حضرت سید احمد شہید کتنے بڑے بزرگ تھے لیکن دیکھو! وہ بھی اسی رَو میں بہ گئے۔بجائے اس کے کہ وہ افغان نمائندوں پر مشتمل ایک جمہوری نمائندہ حکومت بناتے۔وہ خود امام اور مہدی بن گئے اور اس طرح سارا معاملہ غتربود ہو گیا۔(ص ۱۶۶۔افادات وملفوظات مولانا سندھی۔مرتبہ پروفیسر محمد سرور مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء)

علماے صادق پور (پٹنہ) اورمیاں جی نذیر حسین دہلوی

سید احمد رائے بریلوی وشاہ اسمٰعیل دہلوی کے تیار کردہ ''مجاہدین'' انقلاب ۱۸۵۷ء سے
بالکل الگ تھلگ رہے۔جس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں:

''یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور سارا کام حسن وخوبی کے ساتھ چلتا رہا کہ اسی دوران میں
۱۸۵۷ء کا پرآشوب حادثہ پیش آیا اور گو مجاہدین اور ان کے معاونین ایک دینی نظام سے وابستہ
ہونے کی وجہ سے اس قومی لڑائی میں غیر جانب دار رہے۔الخ (ص ۵۷و۵۸۔ہندوستان کی پہلی
اسلامی تحریک۔مرکزی مکتبہ اسلامی نئی دہلی۔۱۹۹۹ء)

''عاجز یہ عرض کرتا ہے کہ مجاہدین جماعتی حیثیت سے ۱۸۵۷ء کی قومی لڑائی سے الگ
رہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کو ایک قومی جنگ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی اس لئے
سید صاحب کے ماننے والے ایک دینی نظام سے وابستہ ہونے کے بعد اس سے الگ رہے۔
(حاشیہ ص ۵۷و۵۸۔ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک)

''سید صاحب کے متبعین اس قومی جنگ سے بالکل الگ رہے۔ان کا اپنا الگ نظام تھا۔
اور وہ اس نظام کے تابع تھے۔۱۸۵۷ء کی قومی جنگ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاست کی پیداوار تھی۔
(حاشیہ ص ۵۸۔ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک)

محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء) کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مسعود عالم ندوی
لکھتے ہیں:

''سید صاحب کے ماننے والوں کی جماعت میں یہی ایک ذمہ دار آدمی
ایسے ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں

شرکت کی تھی۔'' (ص ۱۰۲۔پہلی اسلامی تحریک)

محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء) کی یہ شرکت بھی ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی بے حوالہ و
سند روایت کے مطابق محض دس آدمیوں کے ساتھ تھی۔جس کی نشان دہی کرتے ہوئے خود ہی
مسعود عالم ندوی اس پر حاشیہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ بھی ہنٹر کا بیان ہے اور دوسرے ذرائع سے اس کی تصدیق نہیں
ہوسکی۔'' (حاشیہ ص ۱۰۲۔پہلی اسلامی تحریک)

واضح رہے کہ ''ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک'' مولانا مسعود عالم ندوی نے تقریباً ۱۹۳۷ء
میں لکھی اور اسی دور کی ان کی کتاب ''محمد بن عبدالوہاب! ایک مظلوم مصلح'' بھی ہے۔ان کے ساتھی
اور معروف ندوی عالم مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بھی ''سیرت سید احمد شہید'' اسی زمانے میں لکھی تھی۔

۱۹۵۷ء میں تحریر کردہ اپنی کتاب میں میاں محمد شفیع (کالم نگار روزنامہ نوائے وقت لاہور)
ایک جگہ انگریز کے مخبروں اور وطن کے غداروں کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''سرفراز خاں کھرل نے انگریزوں پر بری طرح جان چھڑکی۔ پنجاب
میں قدم رکھتے ہی ان پر قربان ہوگیا۔۱۸۴۱ء میں لفٹننٹ برنس کو لاہور
کے سفر میں پرخلوص امداد دی۔سکھوں کی دوسری لڑائی جو ۹۔۱۸۴۸ء میں
ہوئی انگریزوں کی طرف سے لڑا اور ریذیڈینٹ کے اشارے پر سکھوں
سے قلعہ چھین لیا۔ (ص ۳۰۴۔ ۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی۔ از میاں
محمد شفیع۔مطبوعہ پاک وہند)

عبدالرحیم صادق پوری عظیم آبادی (متوفی ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء) لکھتے ہیں کہ ۱۸۴۹ء میں گلاب سنگھ
سے سرکار انگریزی کے معاہدے کے بعد:

''گورنمنٹ انگریزی نے ایک خط بنام مولوی ولایت علی وعنایت علی علیہما الرحمۃ لکھا کہ
گلاب سنگھ نے سرکار انگریزی سے معاہدہ کیا ہے اور بموجب اس معاہدہ کے اب وہ گورنمنٹ کی
حمایت میں ہے۔اب اس سے لڑنا عین گورنمنٹ سے لڑنا ہے۔لہٰذا تم کو چاہیے کہ اب اس سے
نہ لڑو۔ (ص ۱۰۰۔تذکرۂ صادقہ از عبدالرحیم عظیم آبادی۔باراول ھادی المطابع کلکتہ)

''یہ دونوں حضرات مع فوج وتوپ خانہ سامانِ جنگ زیر نگرانی افواج انگریزی لاہور پہنچے۔

صاحب بہادر استقبال کر کے ان ایام میں جان لارنس صاحب بہادر چیف کمشنر پنجاب کے تھے۔ صاحب بہادر استقبال کر کے
ان ایام میں جان لارنس صاحب بہادر چیف کمشنر پنجاب کے تھے۔
مولوی صاحب کو لاہور لائے۔ اور بہت گفتگو کے بعد یہ بات قرار پائی کہ یہ دونوں حضرات مع
ہندوستانی مجاہدین کے اپنے وطن واپس جائیں اور کل اسلحہ مع توپ خانہ گورنمنٹ کے ہاتھ
فروخت کر کے اس کی قیمت سے فوج کی بقایا تنخواہ دے کر برخاست کردیں۔ اس وقت صرف
پانچ سو مجاہدین آپ کے ساتھ رہ گئے تھے۔ (ص:۱۰۱۔ تذکرۂ صادقہ از عبدالرحیم عظیم آبادی)

لاہور سے پٹنہ آ کر مولوی ولایت علی و مولوی عنایت علی چند سال مقیم رہے۔ پھر ستھانہ
(سرحد) جا کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ انگریزوں نے ان کی نگرانی رکھی کہ یہ منظم ہو کر
کچھ کرنے نہ پائیں۔ جب انگریزوں نے سرحد کی طرف پیش قدمی کی تو انھوں نے ہندوستان
سے ان کا سلسلہ بالکل منقطع کرنے کا حکم دیا۔ مگر تعلق باقی رکھنے کے جرم میں ان کی گرفتاری و
مقدمہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۰ء تک ان کے اور متعلقین کے خلاف بغاوت
کے متعدد مقدمات چلائے گئے۔ وغیرہ وغیرہ (دیکھیے ص:۱۲۳۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل از طفیل
احمد منگلوری، مطبوعہ دہلی۔ ۱۹۴۵ء)

علمائے صادق پور (پٹنہ) کی جمعیت کے بارے میں مولانا سید محمد میاں دیوبندی لکھتے ہیں:

''یہ تنظیم بحیثیت تنظیم تحریک سے الگ رہی۔ بلکہ اگر مولانا عبدالرحیم صاحب مصنف ''الدر المنثور'' کا قول صحیح تسلیم کرلیا جائے تو یہ تنظیم ۱۸۵۷ء کی تحریک کی مخالف رہی۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اس کے کچھ افراد نے انفرادی طور پر اس تحریک میں حصہ لیا۔ (ص:۱۹۱۔ جلد چہارم، علمائے ہند کا شاندار ماضی از مولانا سید محمد میاں دیوبندی)

ڈاکٹر قیام الدین احمد لکھتے ہیں:

الغرض ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش کے موقعہ پر اور اس دوران میں برابر وہابی مستعدی سے سرحد پر انگریزوں کے خلاف مصروف کار رہے۔ انھوں نے علیحدہ کیوں کام کیا؟ اور ۱۸۵۷ء و ۱۸۵۹ء کی تحریک میں شامل کیوں نہ ہوئے؟ اس کے اسباب ایک علیحدہ موضوع ہے۔ (ص ۲۱۴۔ ہندوستان میں وہابی تحریک۔ مؤلفہ ڈاکٹر قیام الدین احمد۔ مکتبہ الفہیم، مئوناتھ بھنجن، یوپی۔ ۲۰۰۱ء)

سلسلۂ سیرت سید احمد رائے بریلوی و تحریک بالاکوٹ کی چوتھی کتاب ''سرگذشتِ مجاہدین''

میں مولانا غلام رسول مہر (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) نے دسویں اور گیارہویں باب میں ۱۸۵۷ء کا ذکر کیا ہے مگر دہلی سے لکھنؤ و پٹنہ تک اپنے مجاہدین کی کوئی انقلابی کارروائی انگریزوں کے خلاف نہ لکھ سکے اور صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کیا کہ

''۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے اس ہنگامے کا آغاز ہوا جسے انگریزوں نے غدر قرار دیا اور اہل ملک آزادی کی جنگ قرار دیتے ہیں۔ اس ہنگامے نے جابجا انگریزوں کے لئے سخت نازک حالات پیدا کردیے تھے۔

''مجاہدین'' کے لئے اقدامات کا یہ بڑا ہی اچھا موقع تھا لیکن اتفاق کی بات ہے کہ حالات نظر بہ ظاہر جتنے سازگار تھے بعض ناگہانی حوادث و وقائع کے باعث اتنے ہی ناسازگار ہوگئے۔
(ص ۲۹۲۔ سرگذشت مجاہدین از غلام رسول مہر)

مولانا غلام رسول مہر کی تحریر کے مطابق صوبہ سرحد میں مجاہدین کی سرگرمی بھی انقلاب ۱۸۵۷ء کی وجہ سے متاثر ہو کر ختم ہوگئی کیوں پٹنہ وغیرہ سے امدادی رقوم بھیجنے کا سلسلہ بند ہوگیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''تاہم ان سے واضح ہے کہ مئی ۱۸۵۷ء سے کسی رقم کا مولانا کے پاس پہنچنا بے حد مشکل ہوگیا۔ اغلب ہے کہ ہنگامے کے دوران میں رقمیں بھیجنے کی کوئی صورت ہی نہ رہی ہو...... تذکرۂ صادقہ میں مرقوم ہے کہ غدر کی وجہ سے راستے پُر خطر تھے۔ شہر سے باہر نکلنا دشوار تھا۔ املاک تہلکے میں تھے۔ جانوں کو امن نہ تھا، پھر کیوں کر ممکن ہے کہ سرحد کے فاقہ کشوں کے لئے کوئی سامان بھیجتا۔ (ص ۳۰۰۔ سرگذشت مجاہدین)

''ایقاظ'' کے عنوان سے "الدر المنثور" از عبدالرحیم صادق پوری (متوفی ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۳ء) میں مطبوعہ تاریخی ریکارڈ کچھ اور ہے۔ جسے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

''میں اس جگہ ایک فہرست ان حضرات کی لکھتا ہوں کہ جن کے نام نامی اس تذکرہ میں درج ہوئے ہیں اور ان کو ہماری گورنمنٹ عالیہ عادلہ کی طرف سے خطاب عطا ہوا ہے اور وہ کل سات ہیں۔ پانچ ان میں سے وہ ہیں کہ جن کو شمس العلما کا خطاب مرحمت ہوا اور دو وہ ہیں جن کو خان بہادر کا خطاب بخشا گیا۔ وھو ھذہٖ

(۱) شمس العلما جناب حضرت مولانا محمد سعید قدس سرہ ساکن محلہ مغل پورہ شہر پٹنہ۔
(۲) شمس العلما جناب مولانا محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ ساکن محلہ صادق پور شہر پٹنہ

(۳) شمس العلما برادر عزیز مولوی عبدالرؤف مرحوم و مغفور ساکن محلہ صادق پور شہر پٹنہ

(۴) شمس العلما مولوی امجد علی صاحب سلمہ ایم۔اے۔ پروفیسر میور سینٹرل کالج الٰہ آباد ساکن صادق پور پٹنہ۔

(۵) شمس العلما جناب حضرت مولانا نذیر حسین مدظلہ محدث دہلوی ساکن سورج گڈھ ضلع مونگیر۔

(۶) خان بہادر قاضی سید محمد اجمل مرحوم ساکن قصبہ باڑہ ضلع پٹنہ

(۷) خان بہادر جناب قاضی مولوی فرزند احمد صاحب سلمہ ساکن گیا

چوں کہ یہ خطابات بلاعوض کسی خدمت کے محض براہ شفقت و مہربانی خسروانہ و عنایت شاہانہ ہم مسلمان لوگوں کی عزت افزائی و قدر شناسی کے لئے گورنمنٹ عالیہ نے مرحمت فرمائے ہیں۔ پس ہم سب مسلمانوں کو عموماً اور فرقۂ اہل حدیث کو خصوصاً اور علی الخصوص خاندان صادق پور کو اس کا شکریہ قولاً و فعلاً ادا کرنا چاہیے۔ کیوں کہ الشکر یزید النعمة۔ ہم مسلمانوں کا فطری اور مذہبی شیوہ ہے کہ محسن کے احسان کا قولاً و فعلاً اعتراف کریں۔ جیسا کہ جناب سرور کائنات فخر موجودات رحمۃ للعالمین کا ارشاد ہے: لایشکر اللّٰہ من لایشکر الناس۔ پھر کون مسلمان ہوگا جو اس پر عمل نہیں کرے گا۔ خاص کر فرقۂ اہل حدیث کے لئے تو کسی اسلامی سلطنت میں بھی یہ آزادی مذہبی (کہ وہ بلا مزاحمت اپنے تمام ارکان دینی ادا کریں) نصیب نہیں۔ برٹش حکومت میں انھیں حاصل ہے۔ پس ان کا فرض مذہبی و منصبی دونوں ہے کہ وہ ایسی عادل اور مہربان گورنمنٹ کی مطیع و فرماں بردار رعایا ہوں اور ہمیشہ دعا گوئے سلطنت رہیں۔ فتدبر و تفکر ولاتکن من الغافلین۔

(ص:۲۔ الدرالمنثور از عبدالرحیم عظیم آبادی۔ طبع اول ھادی المطابع کلکتہ)

مولانا نذیر حسین دہلوی کو شمس العلماء کا خطاب دیے جانے کے تعلق سے ان کے شاگرد مولانا فضل حسین بہاری (متوفی ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء) لکھتے ہیں—

> "گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۲۲ر جون ۱۸۹۷ء مطابق ۲۱ر محرم الحرام ۱۳۱۵ھ روز سہ شنبہ کو ملا۔ (ص ۱۲۲۔ الحیاة بعد المماة۔ مطبوعہ الکتاب انٹرنیشنل۔ بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵)

مولانا نذیر حسین بہاری ثم دہلوی (متولد ۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء۔ متوفی ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء)

استاد اور مولانا محمد حسین بٹالوی (متولد ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء۔ متوفی ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء) ان کے شاگرد تھے۔ یہ دونوں استاذ شاگرد وھابی/ غیر مقلد/ اہل حدیث کے اکابر اور تاریخ ساز علماء ہیں۔

مولانا محمد حسین بٹالوی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حکومت ہند کو درخواست دی کہ جماعت اہل حدیث حکومت ہند کی مکمل وفادار اور خیر خواہ ہے اس لئے لفظ "وھابی" کی جگہ لفظ "اھل حدیث" لکھنے اور سرکاری کاغذات میں اسی طرح اندراج کرنے کا حکم صادر فرمایا جائے۔ چنانچہ یہ درخواست ۱۹ر جنوری ۱۸۸۷ء میں تحریری طور پر منظور ہوئی اور ۱۸۸۸ء میں اس کے لئے سرکاری پروانہ مسٹر جے پی ہیوٹ انڈر سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا نے ۱۱ر جون ۱۸۸۸ء کو شملہ سے جاری کیا۔ (ص ۴۷۔ اشاعۃ السنۃ لاہور۔ ج ۱۱۔ شمارہ ۲۔ از محمد حسین بٹالوی)

تبدیلیِ نام کے سلسلے میں پیش کردہ درخواست پر دستخط کرنے والوں میں سے چند نمایاں نام یہ ہیں۔ سید محمد نذیر حسین دہلوی، ابوسعید محمد حسین بٹالوی وکیل اھل حدیث ہند، محمد یونس خاں رئیس دتہ ولی علی گڑھ، قطب الدین روپڑی، محمد سعید بنارسی، سید نظام الدین مدراسی۔
(ص:۴۲۔ اشاعۃ السنۃ مذکورہ)

ملکۂ برطانیہ کی گولڈن جبلی (۱۸۸۶ء) کے موقعہ پر اہل حدیث نے جو سپاس نامہ پیش کیا تھا وہ مولانا محمد حسین بٹالوی (متوفی ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء) کی زبان میں یہ ہے:

> "پس واضح ہو کہ جو کچھ اس موقعہ پر اھل حدیث نے کیا ہے۔ وہ امور ذیل ہیں:
> (۱) ملکۂ معظّمہ کی تعظیم کرنا اور تعظیمی الفاظ سے ان کو یاد کرنا۔
> (۲) ملکۂ معظّمہ کی حکومت پنجاہ سالہ پر خوشی کرنا اور اس خوشی میں مسلمانوں کو کھانا کھلانا۔
> (۳) برٹش حکومت کی اِطاعت و عقیدت ظاہر کرنا اور اس کو فرضِ مذہبی بتانا۔
> (۴) ملکۂ معظّمہ اور اس کی سلطنت کے لئے دعائے سلامتی و حفاظت و برکت کرنا۔
> وعلیٰ ھذالقیاس۔
> ان امور میں کوئی امر بھی ایسا نہیں ہے جس کے جواز پر شریعت کی شہادت نہ پائی جاتی ہو۔"
> (ص:۲۲۹۔ اشاعۃ السنۃ لاہور۔ ج ۹۔ شمارہ ۸۔ از محمد حسین بٹالوی)

مولانا محمد حسین بٹالوی اپنی کتاب "الاقتصاد فی مسائل الجھاد" کے حوالہ سے اپنے رسالہ اشاعۃ السنۃ مطبوعہ لاہور میں لکھتے ہیں کہ انگریزوں سے دنیا بھر میں کہیں بھی جہاد کرنا جائز نہیں

ہے۔انھیں کی زبانی یہ تحریری بیان ملاحظہ کیجیے جس سے لاہور سے پٹنہ تک کے بہت سے علماے اہل حدیث متفق تھے۔

''۱۸۷۲ء میں ایڈیٹر اشاعۃ السنہ رسالہ ''الاقتصاد فی مسائل الجہاد'' تالیف کر چکا ہے جس میں قرآن وحدیث وفقہی دلائل سے ثابت ومدلل کیا ہے کہ اس گورنمنٹ سے مسلمانوں کا ہند کے ہوں خواہ روم یا عرب کے مذہبی جہاد جائز نہیں۔اور اسی سال پنجاب کے عام اہل حدیث نے بذریعہ ایک عرض داشت اپنی عقیدت واطاعتِ گورنمنٹ کا اظہار کیا تھا جس پر گورنمنٹ کی طرف سے اس کی تائید وتصدیق میں ایک سرکلر جاری ہوا تھا جو اشاعۃ السنہ نمبر ۹۔جلد ۸ میں منقول ہو چکا ہے۔'' (ص:۲۶۔جلد ۹۔شمارہ ۱۔اشاعۃ السنہ لاہور۔از محمد حسین بٹالوی)

انقلاب ۱۸۵۷ء میں شریک مسلمانوں کو باغی وبدکردار ثابت کرتے ہوئے مولانا محمد حسین بٹالوی (متوفی ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء) لکھتے ہیں:

''مفسدۂ ۱۸۵۷ء میں جو مسلمان شریک ہوئے تھے وہ سخت گنہگار اور بحکمِ قرآن وہ مفسد و باغی وبدکردار تھے۔اکثر ان میں عوام کالانعام تھے۔بعض جو خواص وعلماء کہلاتے تھے وہ بھی اصل علومِ دین سے بے بہرہ یا نافہم وبے سمجھ۔باخبر سمجھ دار علماء اس میں ہرگز شریک نہ ہوئے اور نہ ہی اس فتویٰ پر جو اس غدر کو جہاد بنانے کے لئے مُفسد لیے پھرتے تھے انھوں نے خوشی سے دستخط کیے۔

یہی وجہ تھی کہ مولوی اسمٰعیل دہلوی جو حدیث وقرآن سے باخبر اور اس کے پابند تھے اپنے ملک ہندوستان میں انگریزوں سے (جن کے امن وعہد میں رہتے تھے) نہیں لڑے اور نہ اس ملک کی ریاستوں سے لڑے۔اس ملک سے باہر ہو کر قوم سکھوں (جو مسلمانوں کے مذہب میں دست اندازی کرتے تھے، کسی کو اونچی اذان نہیں کہنے دیتے تھے) سے لڑے۔(۵۰۔الاقتصاد فی مسائل الجہاد۔وکٹوریہ پریس لاہور۔از محمد حسین بٹالوی)

غیر مقلد عالم مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں:— ''مولوی محمد حسین بٹالوی نے جہاد کی منسوخی پر ایک رسالہ (الاقتصاد فی مسائل الجہاد) فارسی زبان میں تصنیف فرمایا تھا اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجے بھی شائع کرائے تھے۔معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اس کے معاوضے میں سرکار انگریزی سے انھیں جاگیر بھی ملی تھی۔'' (ص:۲۷۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔از مسعود عالم ندوی)

کتابیات کے حصے میں لکھتے ہیں:

''۷— الاقتصاد فی مسائل الجہاد— مصنفہ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) اس رسالہ میں جہاد کو منسوخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔مطبوعہ ۱۳۰۶ھ/ ۱۸۸۸ء۔اردو، انگریزی، عربی میں اس کے ترجمے بھی شائع ہوئے اور انگریزی اور اردو ترجمے سر چارج ایبکسن اور سر جیمس لائل گورنرانِ پنجاب کے نام معنون کیے گئے ہیں۔اس کی تالیف ۱۲۹۳ھ میں ہوئی۔علماے عصر سے رائے لینے کے بعد ۱۲۹۶ھ میں رسالہ اشاعت السنہ (لاہور) میں شائع کیا گیا (جلد ۲۔ اا ضمیمہ) پھر مزید مشورہ و تحقیق کے بعد ۱۳۰۶ھ میں باضابطہ کتابی صورت میں اس کی اشاعت ہوئی۔اللہ مرحوم کی مغفرت کرے۔اس کتاب پر انعام سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔

جماعت اہل حدیث کو فرقہ کی شکل دینے میں ان کا خاص حصہ ہے۔اور یہ وہی بزرگ ہیں جنھوں نے اس سادہ لوح فرقے میں وفاداری کی خو بو پیدا کی۔نہ صرف یہ بلکہ دوسرے معاصر علما کو سرکار کی مخالفت کے طعنے بھی دیے۔(ص ۱۵۴ و ۱۵۵۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی نئی دہلی ۲۵)

متحدہ ہندوستان کے بڑے بڑے غیر مقلد محدثین کے استاذ مولانا نذیر حسین بہاری ثم دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) نے فتویٰ دیا تھا کہ—

''ہندوستان میں شوکت وقوت اور قدرتِ سلاح وآلات مفقود ہیں اور ایمان پیان یہاں موجود ہے۔پس جب کہ شرط جہاد اس دیار میں معدوم ہوئی تو جہاد کرنا یہاں سبب ہلاکت اور معصیت ہوگا۔(ص:۲۸۵۔ج ۳۔فتاویٰ نذیریہ مطبوعہ لاہور)

جہاد کی چار شرطیں بیان کرنے کے بعد مولانا نذیر حسین دہلوی لکھتے ہیں— ''پس جب یہ بات بیان ہو چکی تو میں کہتا ہوں کہ اس زمانے میں ان چار شرطوں میں سے کوئی شرط موجود نہیں تو کیوں کر جہاد ہوگا؟ ہرگز نہیں—'' (ص ۲۸۴۔جلد ۳۔فتاویٰ نذیریہ۔مطبوعہ لاہور)

مزید لکھتے ہیں— "علاوہ بریں ہم لوگ معاہد ہیں۔ سرکار سے عہد کیا ہوا ہے۔ پھر کیوں کر عہد کے خلاف کر سکتے ہیں؟ عہد شکنی کی بہت مذمت حدیث میں آئی ہے۔" (حوالۂ مذکورہ)

مولانا نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) کی انگریز نوازی مشہور تھی۔ چنانچہ محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء) لکھتے ہیں:

"چنانچہ مولوی نذیر حسین محدث دہلوی جو ایک نامی خیر خواہ دولت انگلشیہ کے ہیں۔" (ص ۱۹۔ تواریخ عجیب/ کالا پانی مؤلفہ محمد جعفر تھانیسری۔ مطبوعہ دینی تعلیمی بورڈ، گلی قاسم جان دہلی۔ ۱۹۶۹ء)

مولانا نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) کی خدمات اور ان کے انعامات ذیل میں تفصیل سے ملاحظہ فرمائیں۔ مولانا فضل حسین بہاری (متوفی ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۶ء) شاگرد مولانا نذیر حسین دہلوی لکھتے ہیں:

"حج کو جاتے وقت جو چھٹی کمشنر دہلی وغیرہ نے میاں صاحب (نذیر حسین دہلوی) کو دی تھی اس کی نقل سفر حج کے بیان میں ہدیۂ ناظرین کی جائے گی مگر اسی کے ساتھ یہ بتا دینا بھی ضرور ہے کہ میاں صاحب بھی گورنمنت انگلشیہ کے کیسے وفادار تھے۔

زمانۂ غدر ۱۸۵۷ء میں جب دہلی کے بعض مقتدر اور بیشتر معمولی مولویوں نے انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ دیا تو میاں صاحب نے نہ اس پر دستخط کیا نہ مہر۔

وہ خود فرماتے تھے کہ:

"میاں وہ ہلڑ تھا۔ بہادر شاہی نہ تھی۔ وہ بیچارہ بوڑھا بہادر شاہ کیا کرتا۔ حشرات الارض خانہ براندازوں نے تمام دہلی کو خراب، ویران، تباہ اور برباد کر دیا۔ شرائطِ امارت و جہاد بالکل مفقود تھے۔ ہم نے تو اس فتویٰ پر دستخط نہیں کیا مہر کیا کرتے اور کیا لکھتے؟ مفتی صدرالدین خاں صاحب چکر میں آ گئے۔"

بہادر شاہ کو بھی بہت سمجھایا کہ انگریزوں سے لڑنا مناسب نہیں ہے مگر وہ باغیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو رہے تھے۔ کرتے تو کیا کرتے؟

اسی زمانہ میں جب کہ تمام شہر محصور اور قلعہ بند ہو رہا تھا آپ قلعہ میں گئے۔ دیکھا کہ شاہزادوں کے ہاتھیوں کے جھول نہایت ہی پر تکلف تیار ہو رہے ہیں اور بے فکرے شاہ زادے

سامنے پیچوان لگائے گپ لڑا رہے ہیں۔ آپ نے بہادر شاہ سے جا کر کہا کہ:

کیا حضور انھیں شاہ زادوں کو ہاتھیوں پر ساتھ لے کر انگریزوں سے لڑیں گے؟ اس پر بادشاہ چپ ہو گئے۔

ایک دن دیکھا کہ دس میم اور ایک لڑکی گرفتار ہو کر قلعہ میں لائی گئی۔ سب ایک صف میں بیٹھائی گئیں۔ صوبہ دار نالائق نے سب کو مار ڈالنے کا حکم دیا۔ اس لڑکی کی ماں بے اختیار پھوٹ کر رونے لگی۔ لڑکی نے ماں کو تسلی دی اور ایک چٹکی خاک زمین سے اٹھا کر ہتھیلی پر رکھ کر پھونک کر کہا: "ماں روتی کیوں ہے؟ ہماری فوج آئے گی اور اسی طرح ان سب کو اڑا دے گی۔"

میاں صاحب کے دل پر اس نظارہ کا صدمہ ایسا ہوا کہ آبدیدہ ہو کر اسی وقت قلعہ سے یہ کہتے ہوئے نکلے کہ اب دہلی اور اہل دہلی کی خیر نہیں ہے۔ عورتوں کا قتل اسلام نے کبھی جائز نہیں رکھا۔

عین حالت غدر میں جب کہ ایک ایک بچہ انگریزوں کا دشمن ہو رہا تھا۔ مسز لیسنس ایک زخمی میم کو رات کے وقت میاں صاحب اٹھوا کر اپنے گھر لے آئے پناہ دی، علاج کیا۔ کھانا دیتے رہے۔ اس وقت اگر ظالم باغیوں کو ذرا بھی خبر ہو جاتی تو آپ کے قتل اور خانماں بربادی میں مطلق دیر نہ لگتی۔

طرہ اس پر یہ تھا کہ پنجابی کٹرہ والی مسجد کو تغلباً باغی دخل کیے ہوئے تھے۔ اور اسی سے ملا ہوا زنانہ مکان تھا اسی میں اس میم کو چھپائے ہوئے تھے مگر ساڑھے تین مہینے تک کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ حویلی کے مکان میں کتنے آدمی ہیں؟ ساڑھے تین مہینوں کے بعد جب پوری طرح امن قائم ہو چکا تب اس نیم جاں میم کو جو اَب بالکل تندرست اور توانا تھی انگریزی کیمپ میں پہنچا دیا۔ جس کے صلے میں مبلغ ایک ہزار تین سو روپیہ اور مندرجہ ذیل سرٹیفکیٹس ملیں۔

میاں صاحب اس واقعہ کو خود اس طرح فرماتے تھے کہ:

اس زمانہ میں ایک دن نماز عصر کے بعد شہر سے باہر چلا گیا۔ ملا محمد صدیق پشاوری جو اس وقت مجھ سے اصول فقہ پڑھتا تھا ساتھ تھا، مجھ کو کسی آدمی کے کراہنے کی آواز معلوم ہوئی۔ میں اس آواز کی جانب بڑھا۔ جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک میم مجروح رو رہی ہے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر کہنے لگی کہ خدا کے واسطے میری جان مت مارو۔ میں نے اس کو دلاسا دیا اور کہا کہ ہم مسلمان ہیں ہمارے مذہب میں لڑائی کے وقت بھی کسی غنیم کی عورت اور بچوں کی جان مارنا یا تکلیف دینی حرام ہے۔ تم اپنی جان سے پوری طرح اطمینان رکھو اور اگر تمہاری مرضی ہو تو ہم تم کو اپنے گھر لے چلیں

اور تمہارے زخم کا علاج اور تیمارداری کریں مگر چوں کہ وہ بہت ہی ڈری ہوئی تھی کہنے لگی کہ: اول تو ہم اپنے پاؤں سے چل نہیں سکتے اور تم لوگ اگر اٹھا کر لے بھی چلو تو باغیوں کی گولی سے بچ نہیں سکتے۔

میں نے کہا کہ اچھا ہم لوگ تم سے کچھ دور پر ٹھہرتے ہیں۔ رات کو اندھیرے میں تم کو اٹھا کر لے چلیں گے۔ آخر یہی ہوا کہ اندھیرے میں ہم اور ملا صدیق اٹھا کر اس کو ایسے راستہ سے لائے کہ کسی فرد بشر کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ اور گھر میں لے جا کر شریف حسین کی ماں سے کہا کہ یہ نہایت مظلومہ ہے اس کی بہت دل جوئی اور خدمت کرنی چاہیے کہ موجبِ خوشنودیِ خدا اور رسول ہے۔ اس میم کو میں نے باغیوں کے باہر رہنے کی خبر بھی نہ دی کیوں کہ خبر ہو جانے پر اس کے وہ ساڑھے تین مہینے نہایت ہی تشویش اور خوف کی حالت میں بسر ہوتے۔

فرماتے کہ "موسم سخت گرمی کا تھا اور وہ دن رات ایک کوٹھری میں بند رہتی۔ ہر چند میری اہلیہ اس کو کہتیں کہ رات کو انگنائی میں آ کر بیٹھو مگر وہ ڈر سے کوٹھری کے باہر نہ آتی اور اسی گرمی اور مچھروں کی تکلیف میں رات بھر ہاتھ اٹھائے دعا کرتی کہ اے اللہ! میرا قصور معاف کر۔

انگریزی سرٹیفکیٹ کی نقل مع ترجمہ

انگریزی سرٹیفکیٹ کی نقل

Delhi, Dated 27th September, 1877
from W.G. Weter field, offg commissioner

Moulvi Nazeer Hussain & his son Moulvi Shareef Hussain were with other members of thier family instrumental in seving the life of mrs. Leesons during the mutiny they tended her when. Wounded kept her in their house for 3½ months finally send her in to the british Campat Delhi.

He says that he has last in A fire which took place in his house in Delhi all his English Certificates I things this is extremely probable, he probably had certificates from general nevible chamberlain and general Burnard, colonel sytter and others.
I remember the facts well and mrs Lessons, coming in to camp. The family received a handsome reward of Rs. 400. Rs. 700 compens ation for the dimolions of houses bestouwed upon them.
The family all deser consideration ano kinduess at our hands.

Dated 17th September, 88
from magor G.E. young commissioner

I have seen the originol of this certificate and also learned from Mrs. Lessons the fact herein mentioned. It is proboble that he fact stated by Moulvi Nazeer Husain and Shreef Husain has made them enemies a mong desaffected persons.

ترجمہ:
دہلی مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۸۷۷ء۔ از ڈبلو جی واٹر فیلڈ
افی شیٹنگ کمشنر
مولوی نذیر حسین اور ان کے بیٹے مولوی شریف حسین اور ان کے دوسرے گھر والے غدر کے زمانہ میں مسز لیسنس کی جان بچانے میں ذریعہ ہوئے۔ حالت مجروحی میں انھوں نے ان کا علاج کیا۔ ساڑھے تین مہینے

برٹش کیمپ میں ان کو پہنچا دیا۔
اپنے گھر میں رکھا اور بالآخر دہلی کے
وہ کہتے ہیں کہ ان کی انگریزی سرٹیفکیٹس ایک آتش زدگی میں جوان کے
مکان واقع دہلی میں ہوئی تھی جل گئیں۔
میں خیال کرتا ہوں کہ یہ ان کا کہنا بہت ہی قرین امکان ہے۔ غالباً ان کو
جنرل نیوائل چمبر لین جنرل برنارڈ اور کرنل سائیٹر وغیرہم سے سرٹیفکیٹس
ملی تھیں۔
مجھ کو وہ واقعات اور مسز لیبنس کا کیمپ میں آنا اچھی طرح یاد ہے۔
ان لوگوں کو اس خدمت کے صلہ میں مبلغ دو سو اور چار سو روپیہ ملے تھے۔ مبلغ
سات سو روپے بابت تاوان منہدم کیے جانے مکانات کے ان لوگوں کو عطا
کیے گئے تھے۔ یہ لوگ ہماری قوم سے حسن سلوک اور الطاف کے مستحق ہیں۔
مورخہ ۱۷ر ستمبر ۱۸۸۱ء۔ از میجر جی ای ینگ کمشنر
میں نے اس سرٹیفکیٹ کی اصل کو ملاحظہ کیا ہے اور مسز لیبنس سے بھی مجھ کو وہ
حالات معلوم ہوئے ہیں جو اس میں مندرج ہیں۔ یہ امر قرین امکان ہے
کہ مولوی نذیر حسین اور شریف حسین کے بیان کیے ہوئے حالات نے
مخالفوں کو ان کا دشمن بنا رکھا ہے۔

ہندوستان کو ہمیشہ میاں صاحب دارالامان فرماتے تھے دارالحرب کبھی نہ کہا۔

سلطان روم خلد اللہ ملکہ کے ساتھ بھی بہ لحاظ اخوت اسلامی آپ کو غایت درجہ کی ہمدردی تھی چنانچہ اخیر جنگ روم وروس جو ۱۸۷۷ء مطابق ۱۲۹۴ھ میں ہوئی تھی میاں صاحب نے نماز پنجگانہ میں قنوت پڑھنے کا فتویٰ لکھا اور اس کو چھپوا کر شائع کیا۔ اور اپنی مسجد میں بالالتزام فریضۂ پنج گانہ میں قنوت پڑھوایا جب تک جنگ جاری رہی۔

راولپنڈی کی نظر بندی

وہابیت (بغاوت) کا مقدمہ ۶۵-۱۸۶۴ء مطابق ۸۱-۱۲۸۰ھ میں جب ہندوستان کے اکثر شہروں پٹنہ، دانا پور، میرٹھ، انبالہ وغیرہ وغیرہ میں چلایا گیا تو بیشتر ماخوذین کے لئے حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم دیا گیا۔ جناب مولوی یحیٰ علی و مولوی احمد اللہ صاحبان مہدانوی صادق

پوری عظیم آبادی (جنھوں نے انڈمان ہی میں وفات پائی) کے مقدمہ کی لپیٹ میں میاں صاحب پر بھی مؤاخذہ ہوا جو صرف مخبروں کی غلط خبر رسانی اور اہل کاروں کی غلطی پر مبنی تھا اور آپ تا تحقیقات کامل کم و بیش ایک برس تک راولپنڈی کے جیل میں نظر بند رہے۔

دہلی میں میاں صاحب کے مکان اور مسجد کی جب تلاشی ہوئی تو دوسروں کے بھیجے ہوئے خطوط بہ تعداد کثیر بے ٹھکانے دری پر چٹائی پر دری کے نیچے چٹائی کے نیچے چارپائی کے نیچے کتابوں میں پڑے ہوئے پائے گئے۔ پوچھا گیا کہ آپ کے ہاں اس قدر بہ کثرت خطوط کیوں آتے ہیں؟ آپ نے کہا کہ وجہ اس کی تو بھیجنے والوں سے پوچھنی چاہیے یا ان خطوط میں دیکھنا چاہیے؟ میرے خیال میں یہ بات ہے کہ سرکار نے خط کا محصول بہت کم آدھ آنہ رکھا ہے اس لئے لوگ دو پیسے دے کر خط بھیج دیتے ہیں۔ دیکھیے اس میں کوئی خط بیرنگ نہیں ہے سب پیڈ ہیں۔

خطوط جو پڑھے گئے تو ان میں اس کے سوا کیا دھرا تھا کہ فتویٰ کا سوال ذیل میں درج ہے۔ حضور اس کا جواب جلد بھیج دیں۔ فلاں مسئلے میں کیا حکم ہے؟ فلاں کتاب کی فلاں عبارت کا صحیح مطلب کیا ہے؟ فلاں موضوع پر متقدمین کی بھی کوئی تصنیف ہے؟ فلاں کتاب بھیج دیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسی قسم کے مضامین تھے۔ ایک خط میں لکھا تھا کہ ''نخبۃ الفکر'' (کتاب) بھیج دیجیے۔

مخبر نے کہا کہ ''یہی سب ان لوگوں کے اصطلاحی الفاظ ہیں۔'' میاں صاحب کو بھی جلال آ گیا۔ فرمانے لگے ''نخبۃ الفکر'' کیا؟ توپ؟ ''نخبۃ الفکر'' کیا؟ بندوق؟ 'نخبۃ الفکر'' کیا؟ گولہ بارود؟

پھر مجسٹریٹ سے آپ نے کہا کہ صاحب! آپ نے میرا مقدمہ کس جاہل کے سامنے پیش کیا ہے۔ آپ اپنے کسی یورپین یا دیسی عالم سے دریافت کیجیے کہ ''نخبۃ الفکر'' کتاب کا نام ہے یا نہیں؟ اور اس کتاب کا موضوع کیا ہے؟

الغرض بعد تحقیقات کامل یہ بات روز روشن کی طرح کھل گئی کہ ان پر مؤاخذہ محض ناجائز ہے۔ اور یہ بالکل بری الذمہ ہیں اس لئے رہا کر دیئے گئے۔

یہ باتیں ہیں جو میاں صاحب کے ظاہر و باطن کے یکساں ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ وہ جس طرح غدر ۱۸۵۷ء میں مسز لیبنس کی جان بچانے سے وفادار ثابت ہوئے تھے اسی طرح ۶۵-۱۸۶۴ء کے مقدمۂ بغاوت میں بھی بے لگاؤ ٹھہرے۔

نظر بندی میں ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کتب بینی کا خوب موقع ملا۔ کتب خانہ سرکاری سے

کتابیں منگوانے کی اجازت مل گئی تھی اور وہاں بخاری کا ایک سبق پڑھانے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ جی بھر کے مطالعہ کیا۔

عطاء اللہ نامی طالب علم جو آپ کے ساتھ تھے انھوں نے باطمینان تمام سبقاً سبقاً بخاری پڑھ ڈالی اور قرآن مجید بھی حفظ کر لیا۔

میر عبدالغنی ساکن سورج گڈھ جو نہایت ہی پرہیزگار عابد اور نیک بزرگ آپ کے ساتھ جیل میں تھے، انھوں نے جیل ہی میں وفات پائی۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے ان کی تجہیز و تکفین کی اور نماز جنازہ خود پڑھائی۔

میاں صاحب کی اہلیہ کی وفات

۱۴/رمضان ۱۲۸۷ھ مطابق ۸/دسمبر ۱۸۷۰ء جمعرات کے دن آپ کی وفادار بی بی نے انتقال کیا۔

سفر حج اور اس کے واقعات

۱۳۰۰ھ میں جب میاں صاحب نے حج کا ارادہ مصمم کرلیا تو اس خیال سے کہ مخالفین ایذا رسانی میں کچھ کم حصہ نہیں لیں گے اور یہ موقع ان کے لئے اوقات مغتنمہ سے ثابت ہوگا آپ نے کمشنر دہلی سے ملاقات کر کے حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ طیبہ و روضۂ مطہرہ سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارادہ ظاہر کیا۔

کمشنر دہلی نے آپ کو ایک چٹھی مورخہ ۱۰/اگست ۱۸۸۳ء دی جس کی بجنسہ نقل مع ترجمہ اردو ہدیۂ ناظرین ہے۔

کمشنر دہلی کی چٹھی

Moulvi Nazir Husain is a leading moulvi in Delhi who is difficult times proved his Loyalty to the British government and in his pilgrimage to Macca. I hope any British officer, whosed help or protection he may need will affordit to him as he most fully desres it.

Singed J.D. Tremlett
B.C.S. Commissioner
& Supdt. Delhi Division. August 10th, 1888

ترجمہ: مولوی نذیر حسین دہلی کے ایک بڑے مقتدر عالم ہیں۔ جنھوں نے نازک وقتوں میں اپنی وفاداری گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ ثابت کی ہے۔
اب وہ اپنے فرض زیارت کعبہ کے ادا کرنے کو مکہ جاتے ہیں۔
میں امید کرتا ہوں کہ جس کسی برٹش گورنمنٹ افسر کی وہ مدد چاہیں گے وہ ان کو مدد دے گا کیوں کہ وہ کامل طور سے اس مدد کے مستحق ہیں۔

دستخط۔ جے ڈی ٹریملٹ بنگال
سروس کمشنر دہلی و سپرنٹنڈنٹ
۱۰/اگست ۱۸۸۳ء

دوسری چٹھی

مسٹر لیسنس نے بنام کونسل مقیم جدہ کے دی جس میں آپ کی خیرخواہی زمانہ غدر کا مفصل بیان تھا۔ انھوں نے یہ بھی جتادیا تھا کہ ان کے مخالفین بھی بہت ہیں اور ان میں سے بعض مکہ معظمہ میں یہاں سے بھاگ کر مقیم ہوگئے ہیں۔ مسٹر لیسنس نے یہ بھی استدعا کی تھی کہ برٹش گورنمنٹ کونسل کا فرض ہے کہ ان کو ان کے مخالفین کے شر و فساد سے بچائے۔ یہ چٹھی برٹش کونسل مقیم جدہ (مکتوب الیہ) نے اپنے پاس رکھ لی۔

الغرض یہ دونوں چٹھیاں لے کر آپ دہلی سے رہ نورد مکہ معظّمہ زاداللہ تشریفاً ہوئے۔

مخالفین کو جب روانگی کا حال معلوم ہوا تو چند اشخاص کو مختلف مواضع پنجاب، دیوبند، بدایوں، اور خود دلی سے گلابی چو ورقہ کے ساتھ روانہ کیا اور ان لوگوں نے بمبئی پہنچ کر وہاں کے مولویوں کو اپنے منصوبوں میں شریک کر کے اور چو ورقہ کے سوالات پر اور کچھ ہذیانات اضافہ کر کے میاں صاحب کے روبرو پیش کیا۔

غرض اصلی مخالفین کی صرف اشتعال طبع تھی اور ہر طرح کی نزاع کا بڑھانا۔ آپ ان کی غرض کو سمجھ گئے اور جب ان سوالات کو پڑھوا کر سنا تو علانیہ فرمادیا کہ یہ سب باتیں مجھ پر بہتان ہیں اور میں ان کے معتقد کو کافر سمجھتا ہوں۔

جب آپ بمبئی میں جہاز پر سوار ہوئے تو مخالفین بھی اسی اسٹیمر میں روانہ ہوئے اور وہاں بھی چھیڑ چھاڑ سے باز نہ آئے بلکہ ہمیشہ ہر قسم کی ایذا رسانی کی تاک میں لگے رہے مگر آپ نے فحوائے" واعرض عن الجاهلين" کسی کو بھی کبھی منہ نہ لگایا۔ اور ان لوگوں کو بھی اپنی کسی سازش میں کامیابی نہیں ہوئی۔ زیادہ تر وجہ اس کی یہ تھی کہ ان مخالفین کو برٹش کونسل مقیم جدہ کا ڈر لگا ہوا تھا جس نے چٹھیوں کے دیکھنے کے بعد آپ کی بہت تعظیم و تکریم کی اور جب تک جہاز کامران میں رہا وہ ہر روز آپ کی ملاقات کے لئے آتا رہا مگر افسوس کہ وہ کامران ہی میں مفسدینِ سوڈان کے ہاتھوں سے قتل ہوگیا۔ اگر وہ جدہ میں واپس آتا تو یقیناً مکہ معظمہ کے معاملات میں نہایت قیمتی امداد کرتا۔
(ص۹۳ تا ۱۰۲۔ الحیاۃ بعد المماۃ مؤلفہ فضل حسین بہاری شاگرد مولانا نذیر حسین دہلوی۔ طبع جدید۔ الکتاب انٹرنیشنل بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵)

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی (متولد ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۱ء۔ متوفی ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۶ء) شاگرد میاں جی نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء) اپنی کتاب تاریخ اہل حدیث (محررہ ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء) میں لکھتے ہیں:

> "وہابیت کا مقدمہ ۶۵-۱۸۶۴ء میں جب ہندوستان کے اکثر شہروں میں چلایا گیا تو بیشتر ماخوذین کے لئے حبسِ دوام بعبور دریائے شور کا حکم دیا گیا۔ میاں صاحب پر بھی مؤاخذہ ہوا جو صرف مخبروں کی غلط خبر رسانی اور اہل کاروں کی غلط فہمی پر مبنی تھا۔ آپ تا تحقیقاتِ کامل کم و بیش ایک برس تک راولپنڈی کی جیل میں نظر بند رہے۔ بعد تحقیقاتِ کامل معلوم ہوگیا کہ مؤاخذہ ناجائز ہے اس لئے آپ کو رہا کر دیا گیا۔" (ص۴۲۸۔ تاریخ اہلِ حدیث۔ مطبوعہ الکتاب انٹرنیشنل بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔ ستمبر ۱۹۹۵ء)

"حکومت کی طرف سے خطاب" کے عنوان سے مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی لکھتے ہیں:

> "جون ۱۸۹۷ء مطابق محرم ۱۳۱۵ھ میں آپ (مولانا نذیر حسین دہلوی) کو گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے "شمس العلماء" کا خطاب ملا۔
> (ص۴۳۰۔ تاریخ اہل حدیث)

ایک مخبر نے کسی رنجش کی وجہ سے میاں جی نذیر حسین دہلوی کے برادر نسبتی مولوی عبدالقادر کے بارے میں غلط اطلاع دے کر ان کی پھانسی کا سامان کر دیا تھا مگر مسز لیسین کی سفارش پر ان کی رہائی ہوگئی اور مخبر کو پھانسی پر چڑھانے کا حکم ہوگیا۔

چنانچہ راشد الخیری دہلوی لکھتے ہیں:

"باغیوں کا قلع قمع ہو چکا۔ قلعۂ معلیٰ پر انگریزی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ اور مفسد اپنے اعمال کی سزا بھگت رہے ہیں۔ روزانہ آٹھ بجے کے قریب کنارِ جمنا پر، کوتوالی، اور دہلی دروازے کے باہر پھانسیاں ہوتی ہیں اور مٹکاف صاحب کے ایک اشارے پر بیسیوں بندگانِ خدا دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

......صاحب مرحوم جن کا نام لینا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا عبدالقادر صاحب کے حقیقی ہم زلف، مٹکاف صاحب کی ناک کے بال اور مخبروں کے سردار ہیں۔ ان کی اطلاع پر مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم گرفتار کر لیے گئے اور چار آدمیوں کی زبانی شہادت پر پھانسی کا حکم ہوگیا۔

......اب یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تقدیر تھی یا اتفاق کہ دونوں مجمع دیکھ کر ادھر چلے آئے۔ ان میں ایک میم تھی اور ایک انگریز، یعنی مسز لیسن اور مسٹر لیسن۔ مسز لیسن گھوڑا بڑھا کر قریب آئی تو مولوی عبدالقادر کو مشکیں بندھے دیکھا۔ جیب سے پنسل نکال کر اپنی ٹوپی پر لکھا۔ "انتظار کرو" ٹوپی درخت پر لٹکا دی۔ پہرہ دار کو حکم دیا کہ صاحب کو دکھا دینا۔ اور گھوڑے پر بیٹھ کر روانہ ہوگئی۔

......مٹکاف صاحب نے میم کی صورت دیکھ کر ٹوپی اتاری۔ ہاتھ ملایا۔ اور پوری داستان سننے کے بعد اپنے ہاتھ سے مولوی عبدالقادر صاحب کی مشکیں کھول کر حکم دیا۔ قاری...... مخبر کو حاضر کرو۔ تعمیل میں کیا دیر تھی۔ قاری صاحب ڈرتے ڈرتے اور روتے کانپتے اور ہانپتے حاضر ہوئے۔ صاحب نے اپنے ہاتھ سے ان کی مشکیں باندھ کر حکم دیا: اس کو فوراً لٹکا دو۔

جب قاری صاحب پھانسی پر چڑھنے لگے تو مولوی (عبدالقادر) صاحب کی خواہش پر میم صاحب نے سفارش کی۔ اور قاری صاحب اس شرط پر چھوڑے گئے کہ دو سال کے واسطے شہر سے باہر چلے جائیں۔ مطبوعہ عصمت۔ ۱۹۳۳ء۔ (ص۷۲ تا ۷۳۔ دلی کی آخری بہار، از راشد الخیری دہلوی۔ مطبوعہ دہلی)

اسی مضمون کے شروع میں راشد الخیری لکھتے ہیں:

''میرے جد امجد مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم اور ان کے بہنوئی شمس العلماء مولوی نذیر حسین صاحب مغفور محدث دہلوی مسلمانوں کی نگاہ میں اس وجہ سے کافر ٹھہرے کہ ان لوگوں نے جہاد کے فتوے پر دستخط نہیں کیے تھے۔ (ص ۶۸۔ دلی کی آخری بہار)

تحریک بالاکوٹ وعلماے صادق پور کے ہمدرد و مداح پروفیسر محمد ایوب قادری (متوفی نومبر ۱۹۸۳ء کراچی) لکھتے ہیں:

''مولوی محمد حسین بٹالوی کی پوری پالیسی میں شمس العلما شیخ الکل میاں نذیر حسین ممدو معاون بلکہ سرپرست و دخیل رہے۔ اور صادق پور کے بجائے مرکز قیادت دہلی اور لاہور منتقل ہو گیا۔ پھر بیسویں عیسوی کے آغاز میں دسمبر ۱۹۰۶ء میں بمقام آرہ (بہار) آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس وجود میں آئی جس کے سب سے فعال کارکن مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری تھے۔ اہل حدیث کی پالیسی بھی کم و بیش مولوی محمد حسین بٹالوی کے انداز پر رہی۔ (ص ۲۸۔ مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی)

☆☆☆☆☆☆

قصبہ شاملی کی جھڑپ کا اصل واقعہ

فیصل انعام یافتہ غیر مقلد عالم، مؤلفِ ''الرحیق المختوم'' مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری (جامعہ سلفیہ بنارس، یوپی) علماے سہارن پور کا سیاسی جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

دیوبندی تحریک کے امیر اول مولانا مملوک علی نانوتوی کے متعلق سوانح نگاروں کا اتفاق ہے کہ وہ انگریزوں کے پکے وفادار تھے۔ موصوف دہلی کالج میں جہاں سے انگریز نواز ہندوستانی تیار کیے جاتے تھے، تاحیات مدرس رہے۔ بلکہ آپ کے حسن کارکردگی سے متاثر ہو کر کالج کے وزیر مسٹر ٹامس کی سفارش سے ۸/نومبر ۱۸۴۱ء کو آپ صدر مدرس قرار پائے۔ کالج کے تمام انگریز پرنسپل مولانا پر بہت اعتماد کرتے تھے، چنانچہ ہر سالانہ رپورٹ میں آپ کی تعریف و توصیف کی گئی۔ گورنر جنرل نے مولانا کو انعام سے بھی نوازا اور خلعت سہ پارچہ مرحمت کیا۔ دہلی کالج کے نصابوں کا کام آپ کے زیر نگرانی ہوتا۔ ۱۸۴۲ء میں آپ نے حج کے لیے ایک سال کی رخصت لی تو انگریز سرکار نے چھ ماہ کی تنخواہ آپ کو پیشگی عنایت فرمادی۔ (تفصیل کے لئے دیکھیے کتاب ''مولانا محمد احسن نانوتوی'' مصنفہ پروفیسر محمد ایوب قادری۔ مطبوعہ کراچی)

یہ تھے دیوبندی تحریک کے امیر اول مولانا مملوک علی نانوتوی۔ آپ نے اپنی سرکاری ملازمت کے فوائد کو اپنی ذات تک محدود نہ رکھا، بلکہ اپنے اعزہ واقارب کو بھی خوب فائدہ پہنچایا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی (متولد ربیع الاول ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء۔ متوفی ۱۳۷۶ھ/جون ۱۹۵۶ء) لکھتے ہیں:

''نانوتہ کے لئے تعلیمی راہ کا دروازہ مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے کھل چکا تھا۔ وہ دہلی میں مقیم تھے اور دہلی کی سب سے بڑی درس گاہ دہلی کالج کے استاد تھے۔ نہ صرف نانوتہ بلکہ عثمانی شیوخ کی برادری اطراف و جوانب کے جن قصبات میں پھیلی ہوئی تھی وہاں

تک کے بچے مولانا مملوک العلی کے ان خاص حالات سے کافی استفادہ کرر ہے تھے۔ (سوانح قاسمی جلد اول ص ۲۳)

پروفیسر محمد ایوب قادری کا بیان ہے کہ مولانا محمد احسن نانوتوی اور ان کے دونوں بھائی مولانا محمد مظہر نانوتوی اور مولانا محمد منیر نانوتوی، حضرت شیخ الہند (مولانا محمود حسن) کے والد مولانا ذوالفقار علی، مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد مولانا فضل الرحمٰن، مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ یہ تمام حضرات بقول مولانا مناظر احسن گیلانی مولانا مملوک علی سے تعلق کی وجہ سے دہلی پہنچے۔ اور تعلیمی سہولتوں (وظائف وغیرہ) سے مستفید ہوئے۔ پھران میں سے مولانا قاسم نانوتوی کو چھوڑ کر باقی تمام حضرات نے سرکاری ملازمت بھی اختیار کی۔ مولانا محمد احسن، مولوی مظہر اور مولوی منیر تو بنارس کالج، آگرہ کالج اور بریلی کالج میں ملازم ہوئے۔ اور مولوی ذوالفقار علی، مولوی فضل الرحمٰن اور مولوی محمد یعقوب نانوتوی محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر بھی رہے۔ (دیکھیے مولانا احسن نانوتوی۔ ص ۲۶)

مولانا مملوک علی اپنے شاگردوں کو کس ڈھنگ کی تربیت دیتے تھے، اور ان میں انگریزوں سے وفاداری کی کیسی خو بو پیدا کرتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب جمال الدین افغانی نے مفتی محمد عبدہ اور سید رشید رضا کے ساتھ مل کر عالم اسلام کو متحد اور آزاد کرانے کی تحریک کو مصر میں خاصی قوت بخشی تو انگریزوں نے ان ہی مولانا مملوک علی کے ایک شاگرد رشید مولوی سمیع اللہ کو سیاسی مشن پر مصر بھیجا۔ اور مولوی سمیع اللہ نے انگریزوں کے تفویض کیے ہوئے اس فرض کو اس چابکدستی سے انجام دیا کہ جمال الدین افغانی کو مصر سے نکال دیا گیا اور اس کارنامے پر مولوی سمیع اللہ کو انگریز کی طرف سے سی۔ ایم۔ جی کا خطاب ملا۔ (جناب ایوب قادری نے بھی اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ص ۱۸۴)

ظاہر ہے کہ اکابر دیوبند جو ایسے استاد کے تربیت یافتہ تھے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ان کا رول کیا ہو سکتا تھا؟ چنانچہ حالات و واقعات شہادت دیتے ہیں کہ ان بزرگان دیوبند نے اپنے استاد کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے من حیث الجماعۃ انگریز کا ساتھ دیا۔ چند کردار ملاحظہ ہوں:

(۱) مولانا محمد احسن نانوتوی: یہ مولانا مملوک علی کے بھتیجے، اِحیاء العلوم کے مترجم، مظاہر علوم سہارن پور کے پہلے صدر مدرس کے برادر، اور دیوبندی مکتب فکر کے مشہور بزرگ ہیں۔ موصوف

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے وقت انگریز کے ملازم تھے۔

ان کے متعلق ایوب قادری صاحب لکھتے ہیں: ''۲۲ مئی ۱۸۵۷ء کو نماز جمعہ کے بعد مولانا محمد احسن نے بریلی کی مسجد نو محلہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلاف قانون ہے۔ (کتاب مولانا احسن نانوتوی۔ ص ۵۰) اس تقریر سے لوگوں میں آپ کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوگئی۔ جان خطرہ میں پڑ گئی۔ کچھ عرصہ کے لئے آپ نے بریلی چھوڑ دیا۔ امن وامان ہوا تو اپنی ڈیوٹی پر واپس آ گئے۔

(۲) (۳) مولانا مظہر اور مولانا منیر: مولانا محمد احسن نانوتوی کے بھائی اور انھیں کے مسلک پر کاربند تھے۔ انگریز کی وفاداری ہی کی ''برکت'' سے ۱۸۵۷ء کے بعد بھی اپنے سرکاری منصب پر برقرار رہے۔

(۴) مولانا محمد یعقوب نانوتوی: مولانا مملوک علی کے صاحبزادے اور دیوبند کے پہلے صدر مدرس: آپ ۱۸۵۷ء میں سہارن پور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدہ پر فائز تھے۔ موصوف ۱۸۵۷ء کی جنگ کو ''غدر'' اور اس میں حصہ لینے والوں کو ''مفسدین'' سے تعبیر کرتے تھے۔ (سوانح قاسمی۔ ص ۱۶)

ہنگامہ کے وقت آپ گھر ہی تھے۔ ہنگامہ فرو ہوا تو کام پر تشریف لے گئے۔ برطانوی حکومت کے افسران بالا آپ سے بہت خوش تھے اور آپ کی بڑی قدر کرتے تھے۔

مفتی عزیز الرحمٰن لکھتے ہیں:

> ''ایام غدر کی چھ ماہ کی تنخواہ آپ کو پیش کی گئی تو آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جب میں نے کام نہیں کیا تو کیوں تنخواہ لوں؟ (تذکرہ مشائخ دیوبند۔ ص ۱۷۷)

(۵) مولانا فضل الرحمٰن: جو مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد اور دار العلوم کے بانیوں میں سے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے وقت بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ مولانا محمد احسن نانوتوی نے بریلی چھوڑتے ہوئے اپنے بعض ضروری کام انھیں کے سپرد کیے تھے۔ (کتاب مولانا احسن نانوتوی ص ۴۶) انگریزوں کی وفاداری کے صلے میں ہنگامہ کے بعد سرکاری منصب پر برقرار رہے۔

(۶) مولانا ذوالفقار علی: جو شیخ الہند مولانا محمود حسن کے والد تھے اور مولانا فضل الرحمٰن مذکور

سے مل کر دارالعلوم دیوبند کی تحریک شروع کی تھی۔ یہ بھی ۱۸۵۷ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدہ پر فائز تھے۔ انگریزوں کو آپ پر اس قدر اعتماد تھا کہ ہنگامے کے بعد نہ صرف یہ کہ آپ کو اپنے عہدے پر برقرار رکھا گیا بلکہ ریٹائر ہونے کے بعد دیوبند ہی میں آنریری مجسٹریٹ بنا دیا گیا۔
(کتاب مذکور۔ص ۴۵)

......اکابر دیوبند کے یہ چند نام مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ جن کی انگریز سے وفاداری مسلم ہے۔ ہاں بعض جوشیلے نوجوان اور بعض درویش صفت حضرات کے متعلق علمائے دیوبند کا خیال ہے کہ انھوں نے براہ راست اس جنگ (۱۸۵۷ء) میں شمولیت کی۔ اور جوانمردی اور بہادری کے بڑے بڑے جوہر دکھلائے۔ ان حضرات میں مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، جناب حاجی امداد اللہ صاحب اور حافظ ضامن صاحب کا خاص طور پر نام لیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

......بس پوری تاریخ میں یہی ایک واقعہ (شاملی) ہے جسے بعد کے علمائے دیوبند نے اپنے زبردست پروپیگنڈے اور تاریخ سازی کے زور سے انگریزوں کے خلاف جہاد کا رنگ دے دیا۔ حالاں کہ یہ خلوص کی حد تک انگریز سے تعاون تھا۔ چنانچہ بعد میں ہنگامہ ختم ہونے کے بعد قاضی محبوب علی خاں کی جھوٹی مخبری پر جب مولانا رشید احمد گنگوہی کو گرفتار کیا گیا تو اپنے متعلق ان کے تأثرات یہ تھے۔

"جب میں حقیقت میں اپنی سرکار کا فرمانبردار ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بیکا نہ ہوگا۔ اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے، اسے اختیار ہے جو چاہے کرے۔" (تذکرۃ الرشید۔ ج ا۔ صفحہ ۸۰)

..........غرض اس وقت جبکہ معمولی معمولی بات پر لوگوں کو پھانسی اور کالے پانی کی سزا دی جارہی تھی۔ انگریز نے مولانا کی وفاداری سے جلد ہی مطمئن ہوکر انہیں رہا کر دیا۔ اور پھر ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔

اخیر میں اکابر دیوبند کے اس موقف کی ایک شہادت سن لیجیے۔ قیام مدرسۂ دیوبند کے چند سال بعد ۳۱/جنوری ۱۸۷۵ء کو لفٹنٹ گورنر نے اپنے خاص معتمد آدمی مسٹر پامر کو دارالعلوم دیوبند کے معائنہ کے لئے بھیجا تو اس نے ان لفاظ میں آکر رپورٹ دی کہ:

"یہ مدرسہ خلاف سرکار نہیں بلکہ موافق سرکار و ممد و معاونِ سرکار ہے۔

یہاں کے تعلیم یافتہ لوگ ایسے آزاد اور نیک چلن ہیں کہ ایک کو دوسرے سے کچھ واسطہ نہیں۔" (محمد احسن نانوتوی۔ص ۱۱۷)

ظاہر ہے کہ انگریز کے نزدیک "نیک چلن اور موافقِ سرکار" وہی ہوسکتا ہے جو اس کا کامل وفادار ہو اور اس میں کسی قسم کی بغاوت کے جراثیم نہ ہوں۔ لیکن یہ لوگ اس وفاداری سے بھی دو قدم آگے تھے یعنی ممد و معاونِ سرکار تھے۔ سوال یہ ہے کہ یہ درویش صفت حضرات اتنی بڑی انگریزی حکومت کی کیا معاونت کر رہے تھے؟ صفی الرحمٰن مبارک پوری۔ (حاشیہ ۲۴۸ تا ۲۵۲۔ اہل حدیث اور سیاست مؤلفہ نذیر احمد رحمانی ۔ اشاعتِ سوم ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰ء۔ ادارۃ البحوث جامعہ سلفیہ بنارس۔ یوپی)

شاملی اور تھانہ بھون (مظفر نگر، سہارن پور) کے اصل واقعہ کے برعکس پوری اختراعی مہارت کے ساتھ ایک نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ واقعۂ شاملی کو ایک بہت بڑا معرکہ اور جنگ آزادی کے سنگِ میل وغیرہ وغیرہ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر علما و قائدین انقلاب ۱۸۵۷ء کی صف اول میں مولانا محمد قاسم نانوتوی و مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ کا نام درج کرانے کی کوششوں کا سلسلہ آزادیِ ہند (۱۹۴۷ء) کے بعد سے علمائے دیوبند کی طرف سے جاری ہے۔ چنانچہ مولانا حسین احمد مدنی (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) لکھتے ہیں:

"بہر حال! مسلمان علماء میں سے مولانا احمد اللہ شاہ دلاور جنگ مدراسی اور مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی اور مولوی امام بخش صاحب صہبائی، مفتی صدرالدین صاحب آزردہ صدر الصدور، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد صاحب بدایونی، مولوی عبدالقادر صاحب، مولوی وزیر خاں اکبرآبادی، سید مبارک شاہ رام پوری، مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی، سید اسمٰعیل صاحب منیر شکوہ آبادی، مفتی مظہر کریم صاحب دریابادی، مولانا لیاقت علی صاحب الٰہ آبادی، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی، حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی، اور ان حضرات کے تلامیذ وغیرہ نے جہادِ حریت ۱۸۵۷ء میں بڑے پیمانے پر حصہ لیا تھا۔

جنرل بخت خاں صاحب، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب، مولوی فیض احمد صاحب (بدایونی) مع اپنے ماتحتوں اور فوجیوں کے حالت خطرناک دیکھ کر دہلی سے نکل کر لکھنؤ چلے گئے تھے اور

مولوی احمد اللہ شاہ دلاور جنگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے اور وہاں انگریزی فوج سے خوب مقابلے کیے مگر اپنوں ہی کی غداری سے شکست کھانی پڑی اس لئے جب حالت خطرناک دیکھی تو شاہجہاں پور کو روانہ ہوگئے اور محمدی پور میں اسلامی حکومت قائم کرلی۔ الخ (ص ۶۶، ۶۷۔ حصہ دوم نقشِ حیات۔ مکتبہ دینیہ دیوبند ۱۹۹۹ء)

سوانحِ مولانا رشید احمد گنگوہی (متوفی جمادی الآخرہ ۱۳۲۳ھ/ اگست ۱۹۰۵ء) بنام تذکرۃ الرشید میں معروف دیوبندی عالم مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (متولد ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء۔ متوفی ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء) نے ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء ہی میں قصبہ شاملی کی جھڑپ کا اصل واقعہ لکھ کر شایع کردیا تھا۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری تذکرۃ الرشید کی تالیف کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''۹ر اگست ۱۹۰۵ء بہ روز منگل حضرت گنگوہی نے انتقال فرمایا تھا۔ اس سے اگلے ہی سال ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء میں مولانا میرٹھی نے اس کی تالیف کا آغاز کردیا تھا اور تقریباً دو برس کی محنت کے بعد ۳۰ر ذی الحجہ ۱۳۲۶ھ مطابق ۵ر فروری ۱۹۰۸ء بہ روز چہار شنبہ اس تذکرے کی تالیف سے فارغ ہوگئے تھے۔'' (ص ۱۹۔ بزرگانِ دارالعلوم دیوبند۔ ابوسلمان شاہجہاں پوری۔ مطبوعہ فرید بک ڈپو، ضیا محل، دہلی۔ ۲۰۰۶ء)

مولانا محمد یعقوب نانوتوی (۱۸۳۳ء۔ ۱۹۰۱ء) کی تالیف ''سوانح عمری مولانا محمد قاسم'' کو تذکرۃ الرشید کے بیان واقعہ شاملی کا اصل ماخذ قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں:

''ان کی تالیف ''سوانح عمری مولانا محمد قاسم'' تذکرۃ الرشید سے تقریباً انتیس برس پہلے اور مولانا میرٹھی کی پیدائش سے ایک سال پہلے ۱۸۸۰ء/ ۱۲۹۷ھ میں شائع ہوچکی تھی۔ یہ بائیس صفحوں کا ایک مختصر رسالہ ہے اور تقریباً دو صفحوں میں اس زمانے کے بعض واقعات بہ طور مشاھدات بیان ہوئے ہیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تذکرۃ الرشید کے کئی بیانات کا ماخذ مولانا محمد یعقوب نانوتوی کا یہی رسالہ ہے۔ (ص ۸۷۔ بزرگان دارالعلوم دیوبند)

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (متولد ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء۔ متوفی ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء) نے اپنے ممدوح امام ربانی کا نام حمد و صلوٰۃ کے بعد بڑی عقیدت کے ساتھ اس طرح لکھا ہے:

"قطب العالم، قدوۃ العلماء، غوث الاعظم، اسوۃ الفقھا، جامع الفضایل و الفواضل العلیه، مستجمع الصفات و

الخصایل البهیة السنیه، حامی دین مبین، مجدد زمان، وسیلتنا الی الله الصمد الذی لم یلد و لم یولد، شیخ المشائخ، مولانا الحافظ الحاج المولوی رشید احمد صاحب محدث گنگوهی قدس سره العزیز"۔ (ص:۲۔ تذکرۃ الرشید حصہ اول از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، مکتبہ خلیلیہ متصل مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور، یوپی)

آگے چل کر مولانا میرٹھی نے جہاں جہاں لفظ سرکار لکھا ہے اس سے مراد انگریزی حکومت ہے اور مفسدوں و بندوقچیوں و باغیوں سے مراد انگریز مخالف عوام ہیں۔ اور جہاں جہاں حضرت مولانا و امام ربانی لکھا ہے اس سے ان کی مراد مولانا رشید احمد گنگوہی اور اعلیٰ حضرت سے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی مراد ہیں۔ تذکرۃ الرشید کے دونوں حصوں میں حاجی صاحب کو جا بہ جا اعلیٰ حضرت لکھا گیا ہے۔ مولانا خلیل احمد انبیٹھوی سہارنپوری (متولد صفر ۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۳ء۔ متوفی ربیع الآخر ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۸ء) نے بھی اس کتاب کے جملہ اوراق قبل طبع پڑھ لیے تھے جیسا کہ حصہ دوم تذکرۃ الرشید کے آخری صفحہ پر اس کی صراحت ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی (متوفی ۱۳۷۶ھ/ جون ۱۹۵۶ء) بڑے معنی خیز انداز میں تذکرۃ الرشید اور واقعۂ شاملی کے اصل حقائق کی طرف اس انداز سے اشارہ کرتے ہیں کہ:

''بہرحال! مصنفِ امام کی کتاب اور حضرت گنگوہی کی سوانح عمری تذکرۃ الرشید جسے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے مرتب فرما کر جماعتِ دیوبند کے ذمہ دار بزرگوں کی خدمت میں پیش کی۔ اور کافی تنقیح و تحقیق کے بعد یہ کتاب شائع ہوئی۔ اس وقت کسی قسم کی تنقید اس کتاب کی روایتوں پر جہاں تک میں جانتا ہوں نہیں کی گئی ہے۔ (ص ۹۹۔ سوانح قاسمی جلد دوم۔ دارالعلوم دیوبند)

آگے ہم بلا تبصرہ ساری عبارتیں تذکرۃ الرشید سے نقل کررہے ہیں جنھیں پڑھ کر قارئین کو خود ہی سمجھ میں آجائے گا کہ قصبہ شاملی کی جھڑپ کا اصل واقعہ اور اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟

''قاضی سعادت علی خاں پسر نجابت علی رئیس اعظم زمیندار تھانہ بھون کے دو بیٹے تھے۔ قاضی عنایت علی اور قاضی عبدالرحیم۔ ایک بار قاضی عبدالرحیم مع چند احباب ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران سہارن پور کی ایک سرائے میں کسی دوست کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک مخالف

بنیا نے پنکھی صاحب انگریز (اسپنکی ۔Spankee) سے جو باغیوں کی سرکوبی کے لئے ضلع سہارن پور میں متعین تھا اس سے جھوٹی شکایت کردی کہ تھانہ بھون کا رئیس کمپنی کا باغی ہوگیا ہے اور اس کا بھائی دہلی کمک بھیجنے کے لئے یہاں ہاتھی خریدنے آیا ہے۔ رئیس کے کچھ دوسرے دشمنوں نے بھی یہ افواہ پھیلادی جس کی بنیاد پر فوج کی ایک ٹکڑی نے قاضی عبدالرحیم خاں کو مع ہمراہیان گرفتار کر کے جیل بھیج دیا اور بغاوت کے الزام میں انھیں پھانسی دے دی گئی۔ قاضی عنایت علی اپنے بھائی کی پھانسی کی خبر سن کر جوش انتقام میں کچھ فوجیوں کو جو سہارن پور سے کیرانہ کی طرف جارہے تھے ان کا تعاقب کیا اور مال واسباب لوٹ لیا۔ ایک فوجی زخمی ہوکر بھاگا اور گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس فساد کی خبر مظفر نگر پہنچی تو حاکم ضلع نے تھانہ بھون پر فوج کشی کا حکم دے دیا جس پر قاضی عنایت علی نے کھلم کھلا علمِ فساد بلند کیا۔ چنانچہ شاملی کی طرف انگریزی فوج جانے کی جھوٹی خبر کا نقارہ بجا اور جتھہ کا جتھہ تحصیل شاملی پر چڑھ دوڑا۔

گورنمنٹ کے اہل کارانِ تحصیل کے مارے جانے اور خزانہ لوٹے جانے کی خبر پاکر حاکم شاملی پہنچا اور نعشوں اور قصبہ کی بربادی دیکھ کر غم وغصہ میں اس نے کہا کہ تھانہ بھون بھی اسی طرح مسمار کر کے چھوڑوں گا۔

چند ماہ بعد جب دہلی کو انگریزوں نے فتح کیا اور ان کے شاملی آنے کی خبر گرم ہوئی تو لوگ ڈر کے مارے ادھر ادھر فرار ہونے لگے اور قاضی عنایت علی بھی ہمراہیوں کے ساتھ نجیب آباد کی طرف نکل بھاگے اور وہاں سے خدا جانے کہاں گئے اور کیا ہوا کچھ پتہ نہیں چلا۔ جب فوج تھانہ بھون پہنچی تو اس نے قتل وقتال کیا اور مکانات کو آگ لگادی۔ (تلخیص حاشیہ۔ ص ۴۷۔ تذکرۃ الرشید اول)

اسی سلسلے میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (متوفی ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) بعنوان ''الزام بغاوت اور اس کی کیفیت'' لکھتے ہیں:

کیا ظلم وستم ہے کہ مسیحائے جہاں کو افساد وستم پیشہ و سفاک کہا جائے؟
جو گوشہ نشیں خود ہی گرفتارِ محن ہو کس منہ سے اُسے مفسد وچالاک کہا جائے؟

شروع ۱۲۷۶ھ ہجری نبوی ۱۸۵۹ء وہ سال تھا جس میں حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی) قدس سرہٗ پر اپنی سرکار سے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا اور مفسدوں میں شریک رہنے کی تہمت باندھی گئی۔ اِس وحشتناک قصہ کا بقدرِ ضرورت تذکرہ بھی چوں کہ سوانح کا جزو لازم ہے

اس لئے مناسب ہے کہ ابتداء واقعہ سے لے کر انتہا تک اجمالی بیان کردیا جائے۔

رمضان ۱۲۷۳ھ یعنی مئی ۱۸۵۷ء کا وہ طوفان جس کے تصور سے رونگٹا کھڑا ہوتا ہے ہندوستان کیا بلکہ دنیا بھر میں ایسا مشہور ومعروف ہے کہ شاید دوسرا نہ ہو۔ سلطنت مغلیہ کا آخری دَور اور لبریز ہوجانے والے پیمانہ شاہی کا پہلا منظر یعنی بدنصیب خانماں برباد بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی کا وہ بلاخیز سماں تھا جس میں کارتوسوں پر چربی لپیٹے جانے کی جھوٹی افواہ اُڑی اور غدر برپا کرنے کے چُھپے کھُلے مجمعوں میں چرچے شروع ہوئے تھے۔

تباہ ہونے والی رعایا کی نحوستِ تقدیر نے اُن کو جو کچھ بھی بجھایا اُس کا انھوں نے نتیجہ دیکھا اور ان کی نسل دیکھ رہی ہے۔

جن کے سروں پر موت کھیل رہی تھی انھوں نے کمپنی کے امن وعافیت کا زمانہ قدر کی نظر سے نہ دیکھا اور اپنی رحم دل گورنمنٹ کے سامنے بغاوت کا علم قائم کیا۔ فوجیں باغی ہوئیں۔ حاکم کی نافرمان بنیں۔ قتل وقتال کا بند بازار کھولا اور جواں مردی کے غرّہ میں اپنے پیروں پر خود کلہاڑیاں ماریں۔

اس بھیانک منظر میں ہزارہا بندگان خدا ناکردہ گناہ بھی پھانسی چڑھائے گئے جن کے بچے یتیم اور بیبیاں بیوہ ہوئیں۔ اطراف کے شہر شہر اور قصبہ قصبہ میں بدنامی پھیل گئی۔ حاکم کے انتظام کا اُٹھنا تھا کہ باہم رعایا میں برسوں کی دبی ہوئی عداوت نکلنے اور خدا جانے کس کس زمانہ کے انتقام لینے کا وقت آگیا کہ جدھر دیکھو مار پیٹ اور جس محل پر نظر کرو معرکہ آرائی وجنگ۔

اسی بلاخیز قصہ میں تھانہ بھون کا وہ فساد واقع ہوا جس میں قاضی محبوب علی خاں کی مخبری سے حضرت مولانا (گنگوہی) پر مقدمہ قائم ہوا جس کی ابتدا یہ تھی کہ تھانہ بھون کے رئیس قاضی عنایت علی خان، کا چھوٹا بھائی عبدالرحیم خاں چند ہاتھی خریدنے سہارن پور گیا۔ وہاں اس آفت رسیدہ کا کوئی، بنیا قدیمی دشمن کئی دن سے ٹھہرا ہوا تھا جس کو زمین دارانہ تخمصات میں عبدالرحیم کے ساتھ خاص عداوت تھی۔ دشمن نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور فوراً حاکم ضلع سے جا رپورٹ کی کہ فلاں رئیس بھی باغی ومفسد ہے۔ چنانچہ دہلی، میں کمک بھیجنے کے لئے ہاتھی خریدنے سہارن پور آیا ہوا ہے۔ زمانہ تھا اندیشہ ناک اور احتیاط کا اُسی وقت دوڑ گئی اور رئیس گرفتار ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پھانسی ہوئی اور تھانہ بھون کے نیک دل سرکاری خیرخواہ زمین دار کو مظلوم بھائی سے دنیا میں ہمیشہ کے لئے جُدا ہوجانے کی خبر ملی۔

جس کو قصہ کی اصلیت ظاہر کرنے کے لئے مختصراً الفاظ میں حاشیہ
اس بدنامی کی حالت میں
پر درج کردیا گیا ہے۔ عام باشندگان قصبہ کی یہ حالت ہوئی گویا ان کا مربی پادشاہ سر سے اٹھ گیا
اور شرعی و طبعی ضروریات و مخصمات میں بھی کوئی خبر گیراں نہ رہا جس کی رائے پر عمل کریں۔
پس یہ لوگ اعلیٰ حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا
کہ بلا کسی حاکم کی سرپرستی کے گذران دشوار ہے۔ گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث
اپنا امن اٹھالیا اور بذریعۂ اشتہار عام اطلاع دی ہے کہ اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی
چاہیے۔ اس لئے آپ چوں کہ ہمارے دینی سردار ہیں اس لئے دنیاوی نظم حکومت کا بھی بار اپنے
سر رکھیں اور امیر المومنین بن کر ہمارے باہمی قضیے چکادیا کریں۔

اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت کو ان کی درخواست کے موافق اِن کے سروں پر ہاتھ رکھنا
پڑا اور آپ نے دیوانی و فوجداری کے جملہ مقدمات شرعی فیصلہ کے موافق چند روز تک قاضی
شرع بن کر فیصل بھی فرمائے۔ اِسی قصہ نے مفسدوں میں شریک ہونے کی راہ چلائی اور مخبروں کو
جھوٹی سچی مخبری کا موقع دیا۔

حضرت امام ربانی (مولانا گنگوہی) قدس سرہ دس برس ہوئے اعلحضرت (حاجی امداد
اللہ) کو اپنے دین و دنیا کا سردار بنا ہی چکے تھے۔ ہمیشہ آمد و رفت رہتی ہی تھی۔ اب جب کہ ہر
چہار طرف بدامنی تھی آپ کے لئے یہاں حاضر رہنے سے زیادہ بہتر کوئی جگہ دنیا میں نہ تھی۔ ادھر
اعلحضرت کو حکومت کے فیصلے اور شرعی قضا میں مولوی کی ضرورت تھی کہ حق بات میں اعانت کرتا
رہے اس لئے آپ اور مولانا محمد قاسم صاحب مع دیگر خدام کے یہیں رہ پڑے۔

اِتنی بات یقینی ہے کہ اُس گھبراہٹ کے زمانہ میں جب کہ عام لوگ بند کواڑوں میں گھر میں
بیٹھے ہوئے کانپتے تھے حضرت امام ربانی اور نیز دیگر حضرات اپنے کاروبار نہایت ہی اطمینان کے
ساتھ انجام دیتے اور جس شغل میں اس سے قبل مصروف تھے بدستور ان کاموں میں مشغول رہتے
تھے۔ کبھی ذرہ بھر اضطراب نہیں پیدا ہوا اور کسی وقت حبہ برابر تشویش لاحق نہیں ہوئی۔ آپ کو اور
آپ کے مختصر مجمع کو جب کسی ضرورت کے لئے شاملی، کیرانہ یا مظفر نگر جانے کی ضرورت ہوئی
غایت درجہ سکون و وقار کے ساتھ گئے اور طمانیت قلبی کے ساتھ واپس ہوئے۔

ان ایام میں آپ کو ان مفسدوں سے مقابلہ بھی کرنا پڑا جو غول کے غول پھرتے تھے۔

حفاظت جان کے لئے تلوار البتہ پاس رکھتے تھے اور گولیوں کی بوچھار میں بہادر شیر کی طرح
نکلے چلے آتے تھے۔

ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی اپنے رفیق جانی مولانا قاسم العلوم اور
طبیب روحانی اعلحضرت حاجی صاحب و نیز حافظ ضامن صاحب کے ہمراہ تھے کہ بندوقچیوں
سے مقابلہ ہوگیا۔ یہ نبرد آزما دلیر جتھہ اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ
جانے والا نہ تھا۔ اِس لئے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لئے
طیار ہوگیا۔ اللہ رے شجاعت و جواں مردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے
بہادر کا زہرہ آب ہوجائے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے
ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لئے ہیں۔ چنانچہ آپ پر فیریں ہوئیں اور حضرت حافظ
ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ زیرِ ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔

حضرت مولانا قاسم العلوم ایک مرتبہ یکا یک سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ جس نے دیکھا جانا کہ کنپٹی میں
گولی لگی اور دماغ پار کر کے نکل گئی۔ اعلحضرت نے لپک کر زخم پر ہاتھ رکھا اور فرمایا "کیا ہوا؟ میاں"
عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر۔

حضرت امام ربانی قدس سرہ کو خادمانہ و مریدانہ تعلق پر اعلحضرت کے ساتھ جو کچھ وابستگی تھی
وہ تھی ہی مگر چچا پیر حافظ ضامن صاحب کے ساتھ بھی نہایت ہی درجہ مخلصانہ اُنس تھا اور حافظ
صاحب بھی مولانا کے گویا جاں دادہ عاشق تھے۔ اُسی گھمسان میدان میں مولانا کو پاس بلایا اور
فرمایا "میاں رشید! میرا دم نکلے تو تم میرے پاس ضرور ہونا" تھوڑی دیر گذری تھی کہ حافظ صاحب
دھم سے زمین پر گرے۔ معلوم ہوا کہ گولی کاری لگی اور خون کا فوارہ بہنا شروع ہوا۔ حافظ صاحب
کا زخم سے چور ہو کر گرنا تھا اور حضرت امام ربانی کا لپک کر تڑپتی نعش کا کاندھے پر اٹھانا۔ قریب کی
مسجد میں لائے اور حضرت کا سر اپنے زانو پر رکھ کر تلاوت قرآن میں مشغول ہوگئے۔

دیکھنے والوں سے سُنا ہے کہ حضرت مولانا کی اِس مردانگی پر تعجب تھا کہ کس اطمینان کے
ساتھ سنسان مسجد میں تنہا بیٹھے ہوئے اپنے نور دیدہ چچا کے سفر آخرت کا سماں دیکھ رہے اور اپنے
عاشق محبوب کی نزع کا آخری وقت نظارہ کر رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور زبان پر کلام اللہ
یہاں تک کہ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا آپ کے زانو پر سر رکھے رکھے وصال ہوگیا اور حضرت

مولانا چچا کی وصیت کو پورا کرنے کے باعث مسرور ہو کر باطمینان اٹھ کھڑے ہوئے۔ بزرگوں سے سُنا ہے کہ حضرت حافظ صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تمامی نسبت حضرت قدس سرہ کی طرف منتقل ہوئی۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

اللہ اللہ! جس بزرگ نے دس برس ہوئے اعلیٰحضرت سے سفارش کر کے حضرت مولانا کو بیعت کرایا اور اعانت کے ایک کلمۃ الخیر سے ہمدردی ظاہر فرمائی تھی وہ قدسی نفس مرید آخری وقت میں اُس آخری خدمت کو انجام دینے کے لئے قدرت کی طرف سے تجویز ہوا تھا جس میں نہ کوئی پاس تھا نہ قریب، یگانہ تھا نہ بیگانہ۔ آخر جب مفسدوں کی معرکہ آرائی سے پیچھا چھٹا تو حضرت اپنے شہید وفا روحانی مربی کی نعش کو کاندھے پر لے کر اٹھے اور چارپائی پر لٹا کر یکے بعد دیگرے تھانہ بھون میں بسمت مغرب زمین کی گود کے حوالہ کیا۔

جب بغاوت و فساد کا قصہ فرو ہوا اور رحم دل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پا کر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بُزدل مفسدوں کو سوائے اس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں انھوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات پر بھی بغاوت کا الزام لگایا اور یہ مخبری کی کہ:

تھانہ بھون کے فساد میں اصل الاصول یہی لوگ تھے اور شاملی کی تحصیل پر حملہ کرنے والا یہی گروہ تھا۔ بستی کی دوکانوں کے چھپر انھوں نے تحصیل کے دروازہ پر جمع کیے اور اُس میں آگ لگادی یہاں تک کہ جس وقت آدھے کواڑ جل گئے ابھی آگ بجھنے بھی نہ پائی تھی کہ اِن نڈر ملانوں نے جلتی آگ میں قدم بڑھائے اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھس کر خزانۂ سرکار کو لوٹا تھا۔

حالاں کہ یہ کمل پوش، فاقہ کش، نفس کش حضرات فسادوں سے کوسوں دور تھے۔ ملک و مال کے جھگڑے اگر سر رکھتے تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی؟ کوئی کہیں کا ڈپٹی ہوتا اور کوئی کسی جگہ کا صدر الصدور۔ کچہری کے عالی شان کمرے اور عدالت کے وسیع اور اونچی چھتوں والے مکانات کو چھوڑ کر قبر کی تنگی یاد دلانے والے حجروں اور کھرّے بوریہ کے فرش والے تاریک گوشوں میں کیوں پڑتے؟ مگر:

کون سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

بڑی مصیبت یہ تھی کہ حکام کے سامنے جانے کا بھی ان کو اتفاق نہیں ہوا۔ ملزم و مجرم بننے کا موقع ہی نہیں ملا کہ برأت اور صفائی کا طریقہ معلوم ہو۔ نہ اتنی دنیاوی عزت کہ جس کا کوئی لحاظ کرے۔ نہ وہ چھل بل اور بے تکان لسّانی کہ جس کا پاس ہو۔ نہ پاس روپیہ کہ بذریعۂ وکالت اس الزام کو اٹھائیں اور خرچ کریں۔ نہ ایسی اندھی جنگ بغاوت کبھی دیکھی یا سنی کہ جس کے نتیجہ سے کچھ بھی واقفیت ہو۔ آخر بادل دردمند اپنے مالک جل وعلیٰ شانہ کی طرف متوجہ ہوئے اور جو حکم غیب سے صادر ہو اُس پر کاربند ہونے کے منتظر و آمادہ۔

حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ سچ سچ ہو کر رہا اور جھوٹ جھوٹ۔ اِن حضرات پر اتہام کا بحمد اللہ کوئی ثمرہ مرتب نہ ہوا گو خدائی آزمائش میں جھڑ جھڑائے گئے۔ پریشانیاں اٹھائیں، کوفت سہی، روپوش رہے مگر انجام کار حق کو غلبہ ہوا اور ''دودھ کا دودھ پانی کا پانی'' ان پاک نفوس اور ملکوتی صفات بدنوں پر آنچ نہ آئی۔

اعلیٰحضرت قدس سرہ نے اسی قصہ میں اپنے شیدائی بچوں یعنی مولانا قاسم العلوم اور خلف الرشید امام ربانی کو الوداع کہا کہ اب ارض ہند میں یک جائی فلک کو ناگوار ہے۔ اور یہ دونوں لاڈلے بچے اپنے غم خوار روحانی باپ سے بادل ناخواستہ تن بہ تقدیر رخصت ہوئے۔ اعلیٰحضرت نے چند ماہ انبالہ، تگری، پنجلاسہ وغیرہا مواضع و قصبات میں اپنے آپ کو چھپایا اور آخر براہ سندھ و کراچی عرب کا راستہ لیا۔ ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا اور جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ پہنچے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دیوبند اور امام ربانی قدس سرہ نے گنگوہ مراجعت فرمائی۔

انہیں ایام روپوشی میں مولانا قاسم العلوم کو املیا گمتھلہ، لاڈوہ، پنجلاسہ اور جمنا پار کئی دفعہ آنے جانے کا اتفاق ہوا اور امام ربانی قدس سرہ نے قیام زیادہ تر گنگوہ یا رامپور میں کیا مگر اپنے ہادی برحق کی ہندوستان میں آخری زیارت کے شوق سے بے تاب ہو کر انبالہ، تگری اور پنجلاسہ کے سفر کو اٹھے اور مستور الحال مخفی طور پر اس حق کو ادا فرما کر واپس وطن ہوئے۔ اِس زمانہ کی کیفیات ایسی عجیب و غریب گذری ہیں کہ اگر کھلی کراماتوں کے ذکر پر اکتفا کیا جائے تو کئی ورق چاہئیں۔ اس لئے ان کو تفصیلاً چھوڑتا ہوں اور ضروری مضمون پر اکتفا کرتا ہوں۔

تینوں حضرات کے نام چوں کہ وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے اور گرفتار کنندہ کے لئے صلہ

تھے۔ پھرتے میں ودو تگ کی حراست اور ساعی میں تلاش لوگ لئے اس تھا چکا ہو تجویز نکلے۔ باہر سے گھر حرمین بہ نیت اور کہا باد خیر کو وطن نے اعلحضرت سے گنگوہی مولانا کہ چوں لائے۔ تشریف گنگوہ لئے کے ہند ملاقات آخری لئے اس تھا تعلق زیادہ قدس مولانا حضرت وقت اس تھی۔ کی سال دو عمر کی ماجدہ والدہ کی صاحب یعقوب محمد حافظ یعنی صاحبزادی مآب عفت کی سرہ

جس وقت پنجلاسہ ضلع انبالہ میں پہنچے ہیں تو راؤ عبداللہ خان رئیس کے اصطبلِ اسپان کی ویران و تاریک کوٹھری میں مقیم تھے۔ ایک روز اُسی کوٹھری میں وضو فرما کر چاشت کی نماز کے ارادہ سے مصلی بچھایا اور جاں نثار حضار جلسہ سے فرمایا کہ آپ لوگ جائیں میں نفلیں پڑھ لوں۔ راؤ عبداللہ خاں اعلحضرت کے بڑے جاں نثار خادم اور مشہور مرید ہیں۔ گھر کے خوشحال زمین دار اور سرکار کے نزدیک باوجاہت شخص سمجھے جاتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ اعلحضرت پر جو الزام لگایا گیا ہے اس کے قائم ہوتے اپنا مکان کھول دینا دنیاوی حیثیت سے کس درجہ خطرناک ہے؟ کیوں کہ باغی کی اعانت بھی سرکاری بغاوت میں شمار ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی غلبۂ حبِ دین اور فرطِ عشق میں اس درجہ مغلوب تھے کہ نہ مال کی پروا تھی نہ جان کی۔ خدا کی شان کہ جس وقت راؤ عبداللہ خاں اعلحضرت کو تحریمہ باندھے نوافل میں مشغول چھوڑ کر کوٹھری سے باہر نکلے اور پٹ بند کر کے اصطبل کے دروازہ کے قریب پہنچے ہیں تو سامنے سے دَوِش کو آتے دیکھا اور ہکا بکا ششدر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

خدا جانے مخبر کون اور کس بلا کا پتلہ تھا جس نے عین وقت پر روپوشی کی کوٹھری تک معین کر دی تھی۔ چنانچہ دَوِش اصطبل کے پاس پہنچی اور افسر نے مسکرا کر راؤ صاحب سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ گویا اپنے ناوقت آنے کی وجہ کو چھپایا۔ جہاں دیدہ و تجربہ کار راؤ صاحب دور ہی سے تاڑ گئے تھے کہ "ایں گل دیگر شگفت" مگر نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن۔ اپنی جان یا عزت کے جانے ریاست و زمین داری کے ملیامیٹ ہونے اور ہتکڑیاں پڑ کر جیل خانہ پہنچنے یا پھانسی پر چڑھا کر عالم آخرت کا سفر کرنے کی تو مطلق پروا نہ تھی اگر فکر و رنج یا حزن و افسوس تھا تو یہ کہ ہائے غلام کے گھر سے اور آقا گرفتار ہو۔ اور عبداللہ خان کی نظر کے سامنے اُس کا جان سے زیادہ عزیز شیخ پابہ زنجیر کیا جائے؟ مگر اس کے ساتھ ہی راؤ صاحب ایک جواں مرد و مستقل مزاج نہایت دلیر اور قوی القلب راجپوت تھے۔ تشویش کو دل میں دبایا اور چہرہ یا اعضا پر کوئی اثر اضطراب کا محسوس نہ ہونے دیا۔ مسکرا کر جواب دیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

دُوِش کا افسر گھوڑے سے اترا اور یہ کہہ کر "میں نے آپ کے یہاں ایک گھوڑے کی تعریف سنی ہے اس لئے بلا اطلاع یکا یک آنے کا اتفاق ہوا" اصطبل کی جانب قدم اٹھائے۔ راؤ صاحب "بہت اچھا" کہہ کر ساتھ ساتھ ہو لیے اور نہایت ہی اطمینان کے ساتھ گھوڑوں کی سیر کرانی شروع کی۔

افسر بار بار راؤ صاحب کے چہرہ پر نگاہ جماتا اور اس درجہ مطمئن پا کر کبھی مخبر کی دروغ گوئی کا غصہ اور گاہے اپنی ناکامی و تکلیف سفر کا افسوس لاتا تھا یہاں تک کہ گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا ہوا حاکم اُس حجرہ کی طرف بڑھا جس میں اعلحضرت کی سکونت کا مخبر نے پورا پتہ دیا تھا اور یہ کہہ کر کہ "اس کوٹھری میں کیا گھاس بھری جاتی ہے" اُس کے پٹ کھول دیئے۔

راؤ عبداللہ خاں کی اس وقت جو حالت ہوئی ہوگی وہ انھیں کے دل سے پوچھنا چاہیے۔ سمجھتے تھے کہ تقدیر کے آخری فیصلہ کا وقت آگیا اور اپنا پیمانۂ حیات لبریز ہو کر اُچھلا چاہتا ہے اس لئے راضی برضا ہو کر "جی ہاں" کہا اور حکم گرفتاری کے منتظر کھڑے ہو گئے۔

خداوندی حفاظت کا کرشمہ دیکھئے کہ جس وقت کوٹھری کا دروازہ کھلا ہے تخت پر مصلّٰی ضرور بچھا ہوا تھا۔ لوٹا رکھا ہوا اور نیچے وضو کا پانی البتہ بکھرا ہوا پڑا تھا مگر اعلحضرت حاجی صاحب کا پتہ بھی نہ تھا۔ افسر متحیر و حیران اور راؤ عبداللہ خاں دل ہی دل میں شیخ کی عجیب کرامت پر فرحاں و شاداں۔ کچھ عجیب سماں تھا کہ حاکم نہ کچھ دریافت کرتا ہے نہ استفسار۔ کبھی اِدھر دیکھتا ہے کبھی اُدھر۔ آخر مخبر کی دھوکہ دہی سمجھ کر بات کو ٹالا اور کہا کہ خانصاحب "یہ لوٹا کیسا اور پانی کیوں پڑا ہے؟ راؤ صاحب بولے "جناب اس جگہ ہم مسلمان نماز پڑھتے ہیں اور وضو میں منہ ہاتھ دھویا کرتے ہیں۔ چنانچہ ابھی آپ کے آنے سے دس منٹ قبل اُسی کی تیاری تھی۔ افسر نے ہنس کر کہا کہ "آپ لوگوں کی نماز کے لئے تو مسجد ہے یا اصطبل کی کوٹھری؟" راؤ صاحب نے فوراً جواب دیا کہ "جناب مسجد فرض نماز کے لئے ہے اور نفل نماز ایسی ہی چھپی جگہ پڑھی جاتی ہے جہاں کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔"

لاجواب جواب سُن کر افسر نے پٹ بند کر دیئے اور اصطبل کے چاروں طرف غائر نظر دوڑانے کے بعد باہر نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو کر یہ کلمات کہہ کر رخصت ہوا "راؤ صاحب معاف کیجیے آپ کو اس وقت ہماری وجہ سے بہت تکلیف اٹھانی پڑی اور پھر بھی ہمیں کوئی گھوڑا پسند نہ آیا۔"

راؤ عبداللہ خاں صاحب کی نظر سے دَوِش کے سوار جب اوجھل ہو لیے تو واپس ہوئے اور

اور مصلّے پر مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں۔
کوٹھری کھولی۔ دیکھا کہ اعلحضرت نماز سے سلام پھیر چکے
ایک روز زنانہ مکان
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبند میں روپوش تھے۔
کے کوٹھے پر مردوں میں سے کوئی تھا نہیں۔ زینہ میں آکر فرمایا ''پردہ کرلو میں باہر جاتا ہوں''
عورتوں سے رُک نہ سکے باہر چلے گئے۔
جارہے تھے کہ دَوِش راستہ میں ملی۔ آپ ہی کی گرفتاری میں تھی۔ خدا کی شان ہے کہ ایک
شخص نے آپ ہی سے پوچھا کہ ''مولوی محمد قاسم کہاں ہیں؟'' آپ نے ایک قدم آگے بڑھا کر
پچھلے پاؤں کی جانب نظر ڈالی اور فرمایا ''ابھی تو یہاں تھا'' یہ فرما کر آپ آگے چلے گئے اور دَوِش
نے مکان پر جا کر تلاشی لی۔ آخر ناکام واپس ہوئے۔
ہر چند کہ یہ حضرات حقیقتاً بے گناہ تھے مگر دشمنوں کی یاوہ گوئی نے ان کو باغی ومفسد اور
مجرم وسرکاری خطاوار ٹھہرا رکھا تھا۔ اس لئے گرفتاری کی تلاش تھی مگر حق تعالیٰ کی حفاظت برسر
تھی اس لئے کوئی آنچ نہ آئی۔
اور جیسا کہ آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے تازیست خیر خواہ ہی ثابت
رہے۔ ہاں چندروز کی تفریق بین الاحباب مقدر تھی وہ اٹھانی تھی سو اٹھائی۔
اور اس ضمن میں کرامات وخوارق عادات، غیبی حفاظت کے سامان اور سچائی ثابت ہونے
کے اسباب ظاہر ہوئے۔ اس قصہ کے بعد مولانا مسجد میں رہتے اور کوئی کسی قسم کا تعرض نہ کرتا تھا۔
حضرت امام ربانی، قطب الارشاد مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہ کو اس سلسلہ میں امتحان
کا بُرا مرحلہ طے کرنا تھا اس لئے گرفتار ہوئے اور چھ مہینے حوالات میں بھی رہے۔ آخر جب
تحقیقات اور پوری تفتیش وچھان بین سے کالشمس فی نصف النہار ثابت ہو گیا کہ:
آپ پر جماعت مفسدین کی شرکت کا محض الزام ہی الزام اور بہتان ہی بہتان ہے اس
وقت رہا کیے گئے اور آپ بخیر وعافیت وطن مالوف کو واپس آئے۔

گرفتاری وحوالات اور رہائی وبراءت

دردِ دل کا ہائے درماں لے چلے   باغِ دیں کا ابرِ نیساں لے چلے
ڈال کر عالم کو چاہِ حزن میں   یوسفِ ثانی کو زنداں لے چلے

اعلحضرت سے رخصت ہو کر امام ربانی گنگوہ واپس ہوئے تو نہایت درجہ محزون ومغموم۔
اس وقت سیکڑوں افواہیں رات دن میں مشہور ہوتیں اور ہزاروں جھوٹی سچی گپ شپ اڑا کرتی
تھیں۔ جدھر جائیے یہی تذکرہ کہ آج فلاں رئیس پھانسی دیا گیا اور فلاں شخص قتل کیا گیا اور جہاں
دیکھئے یہی ذکر مذکور کہ وہ باغی سمجھا گیا اور اس کو بجرم فساد سولی چڑھایا گیا۔ وہ روپوش ہے اور اس کی
تلاش ہے۔ غرض ایسی گھبراہٹ کا گھمسان تھا کہ ہر عورت کو بیوہ ہو جانے کا ہر وقت خطرہ تھا اور ہر
بچہ کو قدم قدم پر یتیم بن جانے کا اندیشہ وغم۔
حضرت مولانا کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ آپ کا نام بھی مشتبہ اور قابل اخذ مجرموں کی
فہرست میں درج ہو چکا ہے اور آپ کی گرفتاری وتلاش میں دَوِش آیا چاہتی ہے مگر آپ کوہِ
استقلال بنے ہوئے خدا کے حکم پر راضی تھے اور سمجھے ہوئے تھے کہ:
میں جب حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار رہا ہوں تو جھوٹے الزام سے
میرا بال بھی بیکا نہ ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے اُسے اختیار ہے
جو چاہے کرے۔ (ص: ۷۳ تا ص ۸۰۔ حصہ اول تذکرۃ الرشید از مولانا
عاشق الٰہی میرٹھی۔ مکتبہ خلیلیہ متصل مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور)
گرفتاری کے بعد مولانا گنگوہی چھ ماہ تک مظفر نگر جیل میں رکھے گئے پھر رہائی ہوئی۔ یہاں
کے حالات کے بارے میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (متوفی ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) لکھتے ہیں:
''آپ نے کبھی کوئی کلمہ دبا کر یا زبان کو موڑ کر نہیں کہا۔ کسی وقت جان
بچانے کے لئے تقیہ نہیں کیا۔ جو بات کہی سچ کہی۔ جس بات کا جواب دیا خدا
کو حاضر وناظر سمجھ کر بالکل واقع کے مطابق اور حقیقت حال کے موافق۔
کبھی آپ سے سوال ہوا کہ رشید احمد! تم نے مفسدوں کا ساتھ دیا اور فساد
کیا؟ آپ جواب دیتے۔ ہمارا کام فساد کا نہیں نہ ہم مفسدوں کے ساتھی۔
کبھی دریافت ہوتا کہ تم نے سرکار کے مقابلے میں ہتھیار اٹھائے؟ آپ
اپنی تسبیح کی طرف اشارہ کر کے فرماتے کہ۔ ہمارا ہتھیار تو یہ ہے۔
کبھی حاکم دھمکاتا کہ ہم تم کو پوری سزا دیں گے۔ آپ فرماتے! کیا
مضایقہ ہے مگر تحقیق کر کے۔

ایک مرتبہ حاکم نے پوچھا کہ تمہارا پیشہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا! کچھ بھی نہیں مگر زمین داری۔ غرض حاکم نے ہر چند تحقیق کیا اور تجسس و تفتیش میں پوری کوشش صرف کردی مگر کچھ ثابت نہ ہوا۔ اور ہر بات کا معقول جواب پایا۔ آخر بری کیے گئے اور فیصلہ سنا دیا گیا کہ۔ رشید احمد رہا کیے گئے۔ (ص:۸۵۔ حصہ اول تذکرۃ الرشید۔ از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی)

۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء کے درمیان علمائے ہند کا شاندار ماضی از سید محمد میاں دیوبندی، سوانح قاسمی از مولانا مناظر احسن گیلانی، نقشِ حیات از مولانا حسین احمد مدنی جیسی کتابوں کے ذریعہ شاملی کا واقعہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔

اس واقعہ شاملی کو ۱۹۵۳ء میں مولانا حسین احمد مدنی صدر جمعیۃ العلمائے ہند نے لکھا تو وہ اس طرح منظم و منصوبہ بند ہو گیا۔

"پھر جہاد کی تیاری شروع ہو گئی اور اعلان کر دیا گیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو امام مقرر کیا گیا۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو سپہ سالارِ افواج قرار دیا گیا۔ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو قاضی بنایا گیا۔ اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی کو میمنہ میسرہ (دائیں اور بائیں) کا افسر قرار دیا گیا۔" (ص:۵۷۔ حصہ دوم۔ نقش حیات۔ مکتبہ دینیہ دیوبند)

"سوانح عمری مولانا محمد قاسم" مؤلفہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی مطبوعہ ۱۸۸۱ء میں اس کا ذکر اس طرح ہے:

چند بار مفسدوں سے نوبت مقابلے کی آ گئی۔ اللہ رے مولوی صاحب ایسے ثابت قدم، تلوار ہاتھ میں اور بندوقچیوں سے مقابلہ۔" (ص ۶۵۔ بزرگانِ دار العلوم دیوبند مؤلفہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری)

حافظ ضامن صاحب کی شہادت ہی اس سارے ہنگامے کی اصل وجہ تھی اور جیسے ہی یہ شہادت ہوئی کہ سارا ہنگامہ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا۔ یہ بیان ہے مولانا حافظ محمد احمد بن مولانا محمد قاسم نانوتوی کا جسے انھوں نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی طرف منسوب کیا ہے کہ حافظ ضامن

کے جنازے پر نظر پڑتے ہی حاجی صاحب نے فرمایا:

"جس کے لئے یہ سب کچھ ہوا، وہ بات پوری ہو گئی۔ دیکھنا قصہ بھی ختم ہو گیا۔" (ص ۱۸۵۔ سوانح قاسمی جلد دوم)

اور قاری محمد طیب صاحب (متوفی ۱۹۸۳ء) فرزند حافظ محمد احمد مہتمم دار العلوم دیوبند اپنی تحریری یادداشت میں فرماتے ہیں کہ:

"پابندانِ اسباب و وسائل نے تو شکست پر محمول کیا۔ اور عارفین و اربابِ باطن نے اپنے غیبی ادراک سے بتایا کہ اس جہاد کا آخری نقطہ حافظ صاحب شہید کی شہادت تھی۔ تکمیلِ مقصد کے بعد مبادی کی گرم بازاری ختم ہو جاتی ہے اس لئے حضرت شہید کی شہادت پر یہ سارا ہنگامۂ رست و خیز ختم ہو گیا۔ (۱۵۹۔ سوانح قاسمی دوم)

خلاصہ یہ ہوا کہ بیان کردہ اس معرکہ کا اول و آخر صرف حافظ ضامن کی شہادت ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی (متوفی ۱۳۷۶ھ/ جون ۱۹۵۶ء) نے یقینی بات جو لکھی وہ یہ ہے:

...... مقابلہ اور مقاتلہ میں عملی شرکت کا فیصلہ اگر سیدنا الامام الکبیر (مولانا نانوتوی) پہلے سے کیے ہوئے ہوتے تو اس زمانہ تک آپ کا جنگی آلات کم از کم بندوق کے استعمال سے اس درجہ بیگانہ رہ جانا کیا ممکن تھا؟

کچھ بھی ہو اتنی بات بہر حال یقینی ہے اور ان ناقابلِ انکار چشم دید گواہیوں کا کھلا اقتضاء ہے کہ مالیخولیا سے زیادہ اس قسم کی افواہوں کی کوئی قیمت نہیں ہے کہ ہنگامہ کے برپا کرانے میں دوسروں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر (مولانا نانوتوی) اور آپ کے دینی و علمی رفقاء کے بھی ہاتھ تھے۔ بلکہ واقعہ وہی ہے جو مصنفِ امام (مولانا گنگوہی) نے لکھا ہے کہ — مولانا فساد سے کوسوں دور تھے۔" آخر حسب روایت مولانا طیب صاحب جب سنبھالنے والے حضرت کو نظر نہیں آ رہے تھے تو تعمیر سے پہلے تخریب کی یا خروج سے پہلے ولوج کا خیال ممکن ہے عامیوں کے نزدیک ضروری ہو لیکن سیدنا الامام الکبیر جیسے دین کی مثالی شخصیتوں کے متعلق اس قسم کے خود تراشیدہ اوہام، بدخواہیوں کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتے ہیں؟ (ص:۱۰۹۔ سوانح قاسمی جلد دوم از مولانا مناظر احسن گیلانی)

بزدل مفسدوں کی مخبری اور الزام بغاوت جب کہ فی الواقع مذکورہ علما فساد سے کوسوں دور تے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور غیر مقلد عالم مولانا نذیر احمد رحمانی (متولد ذو الحجہ ۱۳۲۳ھ/فروری ۱۹۰۶ء۔ متوفی محرم ۱۳۸۵ھ/مئی ۱۹۶۵ء) لکھتے ہیں:

''۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ان حضرات نے جو جنگ لڑی تھی انگریزی سرکار کے خلاف اور بغاوت کی جنگ نہ تھی بلکہ اس کے برعکس وہ تو سرکار کی حمایت میں جاں نثارانہ اور فدویانہ جنگ تھی۔
ان کی یہ نبرد آزمائی انگریزی فوج اور پلٹن کے مقابلے میں نہ تھی بلکہ سرکار کے مخالف باغیوں کی سرکوبی کے لئے تھی۔
یہ کہنا تہمت اور جھوٹی مخبری ہے کہ انھوں نے تھانہ بھون کے فساد میں حصہ لیا اور شاملی تحصیل پر چڑھائی کی تھی۔ (ص ۳۶۴۔ اہل حدیث اور سیاست۔ مؤلفہ نذیر احمد رحمانی مطبوعہ ادارۃ البحوث، جامعہ سلفیہ بنارس۔ اشاعت سوم ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء)

سرسید احمد خاں (متوفی مارچ ۱۸۹۸ء) حادثۂ شاملی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ستمبر سنہ ۱۸۵۷ء میں دفعتاً مسلمانانِ ساکنانِ تھانہ بھون نے جن کا افسر قاضی عنایت علی تھا۔ فساد برپا کیا اور ایک بڑے گروہ نے تحصیل شاملی پر حملہ کیا۔ اس وقت تحصیل شاملی میں تخمیناً دس سوار پنجابی رسالہ کے اور اٹھائیس سپاہی جیل خانہ کے اور پچاس سے زاید سپاہی متعینہ تھانہ و تحصیل کے اور باقی آدمی اس افسر کے خاندان کے تھے۔ معہ اکبر خان اس کے بھائی کے جو رام پور سے گئے تھے اور وہاں موجود تھے۔ یہ افسر بکمال دلاوری و بہادری بمقابلہ پیش آیا اور تحصیل شاملی کو مستحکم کرا کر اور اس میں محصور ہو کر بخوبی لڑا اور ہر دفعہ مفسدوں کے حملہ کو ہٹا دیا اور بہت سے آدمی ان میں سے مارے گئے۔ آخیر کو گولی و بارود تحصیل میں (ختم) ہو چکی اور نہایت مجبوری کا وقت آیا اور مفسدوں کو قابو ہو گیا اور وہ لوگ تحصیل کے قریب آگئے۔ یہاں تک کہ تحصیل میں گھس آئے۔ وہاں بھی مقابلہ ہوا اور یہ افسر نہایت بہادری سے معہ اکثر آدمیوں اپنے خاندان کے کام آیا اور

شرط نمک حلالی کو پورا کر دیا۔
یہ قتل و خون ریزی شاملی میں ۱۴ ستمبر سن ۱۸۵۷ء کو واقع ہوئی جو دن کہ فتح دہلی کا تھا، مگر نہایت افسوس ہے کہ اس افسر کے کان تک مژدۂ فتح دہلی جس کا وہ ہر دم مشتاق تھا پہنچنے نہیں پایا تھا۔ اس ہنگامے میں ایک سو تیرہ (۱۱۳) آدمی جن میں سو سے زیادہ مسلمان تھے کام آئے اور ہر ایک تمغۂ خیر خواہی سرکار کا اپنے نام کے ساتھ لے گیا۔
یہ ہنگامہ جو تحصیل شاملی میں تھانہ بھون کے مفسدوں کے ساتھ ہوا وہ ہنگامہ بھی جس کو مفسدان تھانہ بھون نے جہاد نام رکھا تھا مگر اس تمام حالات کے دیکھنے سے واضح ہوگا کہ جو لوگ ان مفسدوں کے مقابلے میں آئے اور دو بدو ہو کر لڑے اور بہتوں کو جان سے مارا اور مرتے دم تک مقابلہ و مقاتلہ سے باز نہ رہے وہ بھی مسلمان تھے اور نیک بخت اور اپنے مذہب کے پکے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مفسدوں نے صرف فساد مچانے اور غلغلہ ڈالنے اور ہنگامہ کرنے کو اپنے فسادوں کو جھوٹا جہاد کے نام سے مشہور کیا تھا۔
درحقیقت کوئی مسلمان ان بغاوتوں کو جہاد خیال نہیں کرتا تھا۔ کیوں کہ یہ بات سب لوگ جانتے ہیں کہ جس حاکم کی عمل داری میں جو لوگ بطور رعیت ہو کر اس کے امن میں رہتے ہیں ان حاکموں سے مقابلہ کرنا بغاوت ہے نہ کہ جہاد!
میں نے سنا ہے کہ جب یہ مفسد تھانہ بھون کی تحصیل میں گھس آئے اور ابراہیم خان نے بہت بہادری سے ہتھیار ڈالنے کی بجائے مقابلہ کرنے میں جان دی تو باقی ماندہ آدمی پریشان ہوئے اور مسجد میں اور ایک درگاہ میں جو تحصیل (شاملی) میں ہے پناہ لی تاکہ مفسدان مقاموں کو مقدس سمجھ کر ان کی جان معاف کریں مگر ان کم بختوں نے وہاں بھی نہ چھوڑا اور سب کو جان سے مار ڈالا کہ مسجد اور درگاہ کی سب دیواریں خون سے بھر گئی تھیں۔
(مقالات سرسید، حصہ ہفتم، مجلس ترقی ادب لاہور)

''غول کے غول پھرنے والے مفسدین'' جن سے مقابلہ کرتے ہوئے حافظ ضامن صاحب کی شہادت کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ وہ مفسدین ''انگریز حامی'' تھے؟ ''انقلابی'' تھے؟ آخر کون لوگ تھے وہ؟ اسے مزید جاننے کے لئے مندرجہ ذیل عبارتیں پڑھیں اور پھر اس پر آگے تبراتی عبارتیں بھی پڑھ لیں تو سب کچھ آسانی سے سمجھ میں آجائے گا اور واضح ہو جائے گا کہ یہ انقلابی تھے یا کوئی تیسرا فسادی وغارت گر ٹولہ تھا جو انگریز حکام کے اس اعلان کے بعد کہ ہماری انتظامی ذمہ داری اٹھالی گئی ہے اب رعایا اپنے تحفظ کا خود انتظام کرلے، سرگرم ہوگیا تھا اور جس سے تصادم کے نتیجے میں حافظ ضامن صاحب کی مبینہ شہادت ہوئی۔

''ان ایام میں آپ کو ان مفسدوں سے مقابلہ بھی کرنا پڑا جو غول کے غول پھرتے تھے۔ حفاظتِ جان کے لئے تلوار البتہ اپنے پاس رکھتے تھے اور گولیوں کی بوچھار میں بہادر شیر کی طرح نکلے چلے جاتے تھے۔

ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی اپنے رفیق جانی مولانا قاسم العلوم اور طبیب روحانی اعلیٰ حضرت حاجی صاحب و نیز حافظ ضامن صاحب کے ہمراہ تھے کہ بندوقچیوں سے مقابلہ ہوگیا۔ یہ نبرد آزما جتھہ اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا اس لئے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لئے تیار ہوگیا۔

اللہ رے شجاعت وجواں مردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہوجائے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چنانچہ آپ پر فیریں ہوئیں اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ زیر ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔ (تذکرۃ الرشید۔ حصہ اول۔ مؤلفہ عاشق الٰہی میرٹھی)

یہ فسادی گروہ جس سے تصادم کے نتیجے میں حافظ ضامن صاحب کی مبینہ شہادت ہوئی اس کی نشان دہی کرتے ہوئے ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری لکھتے ہیں:

''دفعہ سوم سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ غیر ذمہ دار (خواہ ہندو ہوں خواہ مسلمان) اہل وطن نے حالات کی خرابی اور نظام حکومت کی ابتری سے فائدہ اٹھا کر اپنے ہی ہم وطنوں کی لوٹ کو اپنا شعار

بنالیا تھا۔ یہ فساد تھا اور اس کے پھیلانے والے مفسد تھے۔

یہی (دفعہ) اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ حضرت امام ربانی اور آپ کے رفقائے محترم نے ان فسادیوں سے سختی سے نمٹا تھا اور نہایت بہادری کا ثبوت دیا تھا۔ صاحب تذکرہ کے الفاظ ہیں۔

......ان ایام میں آپ کو ان مفسدوں سے مقابلہ بھی کرنا پڑا جو غول کے غول پھرتے تھے۔''

اس کا سیاق وسباق اور اسلوب بیان اس بات کا غماز ہے کہ ایک بار سے زیادہ اس قسم کا واقعہ پیش آیا تھا۔ نیز یہ کہ غول کے غول انگریزی حکومت کے وفادار نہیں تھے۔ بلکہ صاف اشارہ اہل ملک فسادیوں کی طرف ہے۔ جنھوں نے حضرت حاجی صاحب کے نظام امامت یا حکومت کو بھی قبول نہیں کیا تھا۔ اس وقت انگریزی نظام حکومت اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ موجود بھی نہ تھا۔ اگر اعلیٰ حضرت حاجی صاحب ان فسادیوں سے تعرض نہ کرتے۔ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیتے تو فرائضِ امامت / امارت میں کوتاہی ہوتی۔ (ص ۴۰۔ بزرگان دارالعلوم دیوبند۔ مؤلفہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری۔ مطبوعہ فرید بک ڈپو، دہلی۔ ۲۰۰۶ء)

شیخ محمد اکرام (متولد ۱۹۰۸ء۔ متوفی جنوری ۱۹۷۳ء) لکھتے ہیں:

''جب تھانہ بھون میں بے انتظامی عام ہوئی تو حاجی صاحب نے قصبے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور دیوانی وفوج داری کے جملہ مقدمات شرعی فیصلہ کے مطابق چند روز تک قاضیِ شرع بن کر فیصل بھی فرمائے۔ ان کوششوں میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی آپ کے ساتھ تھے۔ اور ایک ہنگامہ میں ان حضرات کا اُن مفسدوں سے جو عام بد انتظامی کا فائدہ اٹھانے کے لئے غول کے غول پھرتے تھے، مقابلہ بھی ہوا۔ اور مولانا محمد قاسم ایک گولی سے زخمی ہوئے۔

جب ہنگامۂ مذکورہ فرو ہوا اور انگریزی نظم ونسق دوبارہ قائم ہوا تو مخبروں نے حاجی صاحب اور ان کے رفقائے کار کے خلاف رپورٹ دی۔ اور پولیس ان کی گرفتاری کے درپے ہوئی۔ (ص ۱۹۵ و ۱۹۶۔ موج کوثر۔ از شیخ محمد اکرام۔ مطبوعہ ادبی دنیا، مٹیا محل، دہلی ۶)

۱۹۵۷ء میں جب کہ ہندوستان کے اندر سو سالہ جنگ آزادی (از ۱۸۵۷ء تا ۱۹۵۷ء) کا جشن منایا جانے والا تھا اس وقت مولانا سید محمد میاں دیوبندی نے چار جلدوں پر مشتمل ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' لکھا تو اس کی چوتھی جلد میں قصبہ شاملی وتھانہ بھون کے واقعہ کو اتنے زبردست تاریخی معرکہ کے طور پر پیش کیا اور پھر بعد کی کتب ورسائل اور مقالات ومضامین میں اس کے اندر اتنی گہری رنگ آمیزی ومبالغہ آرائی ہوئی کہ سب نے مل جل کر اسے ''پانی پت'' کی فیصلہ کن

جنگ بنادی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ برتقدیر صحتِ واقعہ بھی مذکورہ علماء کا جنگی کردار اور ان کی ا
جھڑپ محض ایک محدود اور مقامی نوعیت کی ہے۔ اس کی وہ حیثیت ہرگز نہیں جو بڑے فخر ومباہات
کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ ایسے ہی موقع کے لئے کسی شاعر نے کہا ہے کہ:

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیب داستاں کے لئے

مولانا سید محمد میاں دیوبندی (وبعض دیگر حضرات) حادثۂ شاملی کی اولین حیثیت کو ثانوی درجہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ — "شاملی کی طرف اقدام کا ایک دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ مہار سنگھ رئیس شاملی نے جو علم آزادی بلند کیا تھا اس کو کمک کی شدید ضرورت تھی۔"
اور پھر حاشیہ میں یہ ایک تاریخی حوالہ نقل کرتے ہیں جس سے سارا واقعہ اور اصل حقیقت سمجھ کر نتیجہ نکالنا اور فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

"انگریز مصنف "میلی سن" اپنی تاریخ کی جلد ششم ص: ۱۲۴ پر تحریر کرتا ہے:

شاملی میں ایک ہندو زمین دار مہار سنگھ نے ہنگامہ برپا کیا تھا اور خط وکتابت کر کے دربارِ دہلی سے تعلقات قایم کرلیے تھے۔ انگریز اس کو دبا نہ سکتے تھے۔ البتہ شاملی کو کھلم کھلا بغاوت سے محفوظ رکھا۔ شاملی جو آج کل ضلع مظفرنگر کی ایک سب ڈویژن (تحصیل) کا ہیڈ کوارٹر ہے اس زمانہ میں سہارن پور سے متعلق تھا۔ حاکم سہارن پور اسپنکی (Spankee) صاحب نے اس کی پوزیشن مضبوط رکھنے کے لئے گورکھا فوج کا ایک دستہ بھیج دیا۔ ایڈورڈز (اس مقام کے فوجی کمانڈر) نے گورکھوں کی مدد سے شاملی میں مکمل قبضہ کرلیا۔ ایک مسلمان وفادار ابراھیم خاں کے ماتحت تھوڑی سی فوج شاملی چھوڑی اور ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو خود آگے روانہ ہو گیا۔

قاضی عنایت علی اور ان کے ساتھیوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر شاملی پر حلہ بول دیا۔ تقریباً ایک سو تیرہ فوجیوں کے نقصان کے بعد ابراہیم خاں ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔

ایڈورڈز واپس ہوا تو شاملی کی حالت دیکھ کر جہاں ایک سو تیرہ فوجی کام آچکے تھے بہت غصہ میں آیا مگر اس وقت مظفرنگر کی حالت بہت خراب تھی۔ وہاں چلا گیا۔ پھر کپتان اسمتھ اور لفٹنٹ کیول روس کی زیر کمان سکھوں اور گورکھوں کی فوج تھانہ بھون بھیجی۔ مجاہدین نے اسے بھگایا۔

دوبارہ کرنل ڈنلاپ کی سرکردگی میں فوج بھیجی گئی جس نے پہلے تھانہ بھون پھر شاملی پر قبضہ کر کے ان کو تباہ و برباد کیا۔ (۱۸۵۷ء کے مجاہد۔ ص ۱۶۷)۔ (ص: ۲۷۵۔ جلد چہارم۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی از مولانا سید محمد میاں۔ مطبوعہ کتابستان دہلی ۶)

قارئین کرام کو مندرجہ ذیل الفاظ اور جملوں کا مطلب بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان سے کیا مراد اور کیا مطلب ہے؟ اور انھیں یہ سمجھانے کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے کسی دوراز کار تاویل کی بھی گنجائش ہے یا نہیں؟

"رحم دل گورنمنٹ"، "مہربان سرکار"، "باغی"، "بندوقچی"، "کارتوسوں پر چربی لپیٹے جانے کی جھوٹی خبر"، "کمپنی کے امن وعافیت کا زمانہ"، "رحم دل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پا کر باغیوں کی سرکوبی شروع کی"، "گوشہ نشیں حضرات پر بغاوت کا الزام اور مخبری"، "مہربان سرکار کے دلی خیرخواہ"، "تازیست خیرخواہ" — (تذکرۃ الرشید)

یہ بھی ایک حسنِ اتفاق ہے کہ ان عبارتوں کا آج تک وہی مطلب سمجھا جا رہا ہے جو مؤلفِ کتاب نے سمجھا اور سمجھایا ہے۔ اور ۱۹۲۰ء کی تحریک ترکِ موالات کے بعد سے جب کہ ہندوستان کے حالات اس طوفانی رفتار سے تبدیل ہونے لگے کہ انگریزوں کو اپنا دفاع اور تحفظ مشکل نظر آنے لگا اور لاکھوں کروڑوں ہندوستانی ان کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ ان کے خلاف تحریروں اور تقریروں کا سیلاب تیزی کے ساتھ امنڈنے لگا اس وقت بھی تذکرۃ الرشید کے مؤلف مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (متوفی ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء) اور اسے پڑھ کر اس کی تصدیق کرنے والے اولین مصدّق مولانا خلیل احمد انبیٹھوی سہارن پوری (متوفی ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۸ء) نیز دیگر علمائے دیوبند نے مذکورہ قصۂ شاملی میں کسی ترمیم واصلاح کی ادنیٰ ضرورت محسوس نہیں کی تو پھر ۵۵۔۱۹۵۰ء سے اس کے اندر کسی تاویل اور انگریزی دور کے حالات کی دہائی دینے کی گنجائش کہاں باقی رہ جاتی ہے؟ اپنے تحریری بیان میں مؤلف ومصدّق یا ان کے ہم پلّہ کسی معاصر کی جانب سے کسی طرح کی ترمیم وتردید نہ کیے جانے کا سیدھا مطلب یہی ہے کہ تذکرۃ الرشید میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہی اصل ہے اور باقی جو کچھ ہے وہ افسانہ ہے اور جھوٹی تاریخ نویسی کا ایک افسوسناک نمونہ ہے۔

حکیم ضیاء الدین رام پوری (رام پور منیہاران، ضلع سہارن پور) حافظ محمد ضامن صاحب کے مریدِ مخلص اور خلیفہ بھی تھے۔ آپ نے اپنے پیر حافظ ضامن صاحب کے احوال واقعات پر مشتمل ایک کتاب "مونسِ مہجوران" کے نام سے تالیف کی جو ۴/ ربیع الآخر ۱۲۸۴ھ/ مطابق ۵/ اگست ۱۸۶۷ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس "مونسِ مہجوران" کے اندر واقعۂ شہادت کے تعلق سے صرف اتنا مرقوم ہے کہ:

سُبحٰن اللہ! کیا ہمتِ مردانہ اور مددِ خدا کا تماشہ دکھا کر مردانہ اور مشتاقانہ بہ تاریخ چوبیسویں محرم الحرام بارہ سو چوہتر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم برسرِ معرکہ جام شہادت نوش فرمایا۔ واہ کیا خوب داد لے گئے اور داغِ حسرت دے گئے۔ "مونس مہجوران" مخطوطے کا صفحہ ۱۵۔۱۴۔ حوالہ تذکرۂ سردارِ شہیداں۔ ص ۸۴۔۸۳۔ مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ ۱۹۸۲ء۔ (ص ۵۶۔ بزرگانِ دار العلوم دیوبند از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری)

حکیم ضیاء الدین رام پوری مدرسہ دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر (۱۳۰۵ھ تا ۱۳۱۶ھ) تھے۔ ان کی تالیف "مونسِ مہجوران" کی ایک نقل رام پور منیہاراں ضلع سہارن پور میں تھی اور ایک نقل انھوں نے مکہ مکرمہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے پاس بھیج دی تھی۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) کے احوال و واقعات پر مشتمل پہلی کتاب "سوانح عمری مولانا محمد قاسم" مؤلفہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی (متولد ۱۳/ صفر ۱۲۴۹ھ/ مطابق ۲/ جولائی ۱۸۳۳ء۔ متوفی ۲/ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ/ مطابق ۲۰/ دسمبر ۱۹۰۱ء) ۱۸۸۰ء میں لکھی گئی اور ۱۸۸۱ء میں اس کی اشاعت بھی ہوگئی۔ مولانا یعقوب نانوتوی ۱۸۵۲ء میں گورنمنٹ کالج اجمیر میں ملازم ہوئے تھے اور بنارس ورڑکی کے بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس سہارن پور بنا دیے گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی سہارن پور میں ہی تھے۔ وہ اپنی مذکورہ کتاب میں بس اتنا لکھتے ہیں کہ:

> "ایک بار گولی چل رہی تھی یکا یک سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ جس نے دیکھا جانا گولی لگی۔ ایک بھائی دوڑے۔ پوچھا! کیا ہوا؟ فرمایا کہ سر میں گولی لگی ہے۔ عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا، کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا۔ اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر۔"

> "انھیں دنوں میں ایک نے منہ در منہ بندوق ماری جس کے سنبھے سے ایک مونچھ اور کچھ داڑھی جل گئی اور قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا۔ اور خدا جانے گولی کہاں گئی؟ اور اگر گولی نہ تھی تو اتنے پاس سے سنبھ بھی بس تھا، مگر حفاظتِ الٰہی برسر تھی، کچھ اثر نہ ہوا۔"
>
> "اس زخم کی خبر اجمالی بعض دشمنوں نے جو سنی تو سرکار میں مخبری کی کہ تھانہ بھون کے فساد میں شریک تھے، حالاں کہ مولانا فسادوں سے کوسوں دور تھے۔ ملک و مال کے جھگڑے اگر سر رکھتے تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی؟ کہیں کے ڈپٹی یا صدر الصدور ہوتے—"
>
> "اس لئے حاجت روپوشی کی ہوئی۔ حضرت حاجی صاحب بھی ایسے ہی باعث سے روپوش ہو گئے تھے—" الخ۔ (ص ۶۵۔ بزرگانِ دار العلوم دیوبند۔ مؤلفہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری)

مولانا رشید احمد گنگوہی کی گرفتاری اور چھ ماہ کی سزا اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے نام گرفتاری وارنٹ کا جہاں تک سوال ہے تو اس زمانے کی یہ عام وبا اور شکایت ہے کہ جس مخبر نے کسی بھی وجہ سے جسے چاہا گرفتار کرا دیا، سزا دلا دی، پھانسی کے پھندے پر چڑھا دیا۔ اس قسم کے سیکڑوں نہیں ہزاروں واقعات ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں ہوئے جن کا ذکر تاریخی کتابوں میں موجود ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی گرفتاری وارنٹ کے باوجود اطراف و جوانب میں علانیہ گھومتے رہے۔ ایک بار تین روز کی روپوشی کے بعد کہنے لگے کہ غار ثور کی سنت بس اتنی ہی ہے اور تین روز سے زیادہ کی روپوشی سنت سے ثابت نہیں۔ اور اکتوبر ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ کے جاری عام معافی نامہ مع بعض مستثنیات کے بعد تو مولانا نانوتوی بالکل ہی آزاد و بے فکر ہو گئے۔ ۱۸۶۰ء میں حج بھی کیا (تفصیل کے لئے دیکھیے سوانح قاسمی دوم)۔ مگر کسی مرحلے میں کوئی مخبری اور کوئی گرفتاری نہیں ہوئی۔ کیا ۱۸۵۷ء کے کسی سرغنہ انقلابی قائد کے ساتھ انگریزوں نے کہیں بھی ایسی دیدہ و دانستہ چشم پوشی کی؟ جب کہ نہ جانے کتنے ہزار علما اور عام مسلمان محض شک کی بنیاد پر سنگین سزاؤں سے دوچار کیے گئے۔

ان حقائق کا کھلا ہوا مطلب یہ ہوا کہ مخبروں کی احتیاطی یا ذاتی انتقامی خبر رسانی کے نتیجے میں مقامی پولیس کی تھوڑی سی توجہ ہوئی اور اس کے بعد سارا معاملہ ہمیشہ کے لئے رفع دفع ہو گیا۔ مولانا نانوتوی ۱۸۸۰ء تک اور مولانا گنگوہی ۱۹۰۵ء تک بقید حیات رہے مگر کسی مخبر کو نہ کسی پولیس نہ کسی سرکاری اہل کار کو کسی نگرانی و تفتیش کی کبھی کوئی ضرورت پیش آئی۔ نہ ان کو بعد کے کسی دور میں مقدمہ و گرفتاری سے کبھی دوچار ہونا پڑا۔

حافظ ضامن صاحب کی سوانح بنام ''مونس مہجوران'' از حکیم ضیاء الدین رام پوری محررہ در ۱۸۶۷ء، مولانا محمد قاسم نانوتوی کی سوانح بنام ''سوانح عمری مولانا محمد قاسم'' از مولانا محمد یعقوب نانوتوی محررہ ۱۸۸۰ء، مولانا رشید احمد گنگوہی کی سوانح بنام ''تذکرۃ الرشید'' محررہ ۱۹۰۸ء جو اولین ماخذ ہیں ان کا بیان آپ کے سامنے ہے۔ اب ان سے الگ ہٹ کر کسی نے اگر آزادیٔ ہند (۱۹۴۷ء) کے بعد کچھ لکھا ہے تو اس کی کوئی بھی بات حوالہ و سند کی محتاج ہو گی اور سابقہ بیانات کے برعکس بلا سند و شہادت لکھے گئے بیان کو قبول کرنا بھی اصولِ روایت و درایت کے قطعاً خلاف ہے۔

ہندوستان سے مکہ مکرمہ ہجرت کر جانے کے تعلق سے حضرت حاجی امداد اللہ چشتی فاروقی مہاجر مکی (متوفی ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء) کا واقعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارن پوری (متوفی ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء) اپنی ایک کتاب محررہ در ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۵ء مصدقہ مفتی محمود حسن مفتی دارالعلوم دیوبند میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حضرت اقدس (حاجی امداد اللہ) کے قلب میں جو کیفیاتِ شوقیہ روز افزوں ترقی پذیر رہتی تھیں انھوں نے ہجرت کا ولولہ حضرت کے ذہن میں پیدا کیا۔ لیکن اکابر کا نقل و حرکت چوں کہ تابعِ حکم ہوتا ہے اس لئے یہ اشتیاق دل ہی دل میں رہا کہ اتفاقاً ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) میں غدر کا کریہہ منظر پیش آیا اور ''مفسدین'' نے اپنی برأت اسی میں سمجھی کہ دوسروں کا نام بتلاؤ تا کہ ہم لوگ خیر خواہِ سرکار شمار ہوں۔
>
> اور یہ گروہ چوں کہ سرکاری درباری قصوں سے متنفر اور مسجد کے کونوں کا خوگر تھا۔ نہ لسانیت کا عادی نہ قوانین سے واقف، نہ رشوت کی بھینٹ نہ فضول روپیہ پاس، جس کے ذریعہ اپنی برأت ثابت کرے اور دوسروں کا جھوٹ جتلائے۔ اس لئے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کی اور اسی ذیل میں حضرت حاجی صاحب نے بہ زبانِ حال یہ مصرع فرماتے ہوئے—
>
> جاتے ہیں ترے کوچے سے ظالم خفا نہ ہو
>
> ہند کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا۔ (ص ۲۴۹۔ تاریخ مشائخ چشت۔ مؤلفہ شیخ زکریا کاندھلوی سہارن پوری۔ مکتبہ شیخ زکریا۔ مفتی اسٹریٹ، سہارن پور، یوپی۔ طبع اول ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء)

اصل بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے دس پندرہ سال پہلے جب کہ ہندوستان سے انگریزوں کا انخلا یقینی ہونے لگا اور ۱۹۴۷ء کے بعد جب کہ انگریز یہاں سے رختِ سفر باندھ کر سات سمندر پار چلے گئے تب ''یارانِ تیز گام'' کو ''قافلۂ جہاد حریت ۱۸۵۷ء'' سے بچھڑنے کا غم ستانے لگا۔ اور پھر ان ''پاکبازانِ امت'' نے بڑی چابک دستی کے ساتھ اپنے ''فنِ تاریخ سازی'' اور کمالِ ہنر کا مظاہرہ شروع کیا۔ اور اس فرضی تاریخ کا اتنا ذکر و اعادہ کیا کہ بہت سے مؤرخین بھی ان کے بیان کردہ حالات و واقعات کی تحقیق سے بے نیاز ہو کر نقل در نقل کی رسم نبھانے سے زیادہ کچھ نہ کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ ''پانی پت'' کی طرح ''شاملی'' کو پیش کرنے والے افراد نے انقلاب ۱۸۵۷ء میں دہلی و لکھنؤ میں برپا معرکۂ کارزار میں عملاً حصہ لینے والے یا ان کی حوصلہ افزائی و منصوبہ بندی کرنے والے علما و قائدین کی صف میں اپنے ''مولانا حضرات'' کو شامل کرنے کی جو ناکام کوشش کی ہے اس کا سراغ نہ اس وقت کی لکھی ہوئی کسی تاریخ میں ملتا ہے نہ ہی شاملی و تھانہ بھون سے متعلق مظفر نگر و سہارن پور کے کسی سرکاری گزٹ میں آج تک مل سکا ہے۔

مذکورہ کتبِ علمائے سہارن پور میں انگریزوں کے خلاف کسی جہاد و جدو جہد کا ذکر نہ ہونا اگر اسی طرح حالات کی مجبوری ہے جیسے اپنی جان و مال کے تحفظ کے لئے ۱۸۵۷ء کے مقدمات میں توریہ و قانونی موشگافی کے لئے ایک وجہِ جواز ہے اور یہ عذر اہل علم و عقل کے نزدیک مسموع بھی ہے تاہم کسی مستند مخطوطے میں یا مستند و متصل روایات میں کہیں نہ کہیں کوئی ایسی بات ضرور ملنی چاہیے جس سے ان حضرات کی تحریر کردہ جدید اختراعی تاریخ کا جواز نکل سکے؟ اور اگر ایسا کچھ نہیں ہے تو پھر بلا حوالہ و سند ایسی باتیں اہل علم و تحقیق کے نزدیک ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتی ہیں۔

حضرات اس واشگاف حقیقت سے ناواقف اور بے بہرہ ہیں کہ جب لکھنؤ میں قائد جنگ آزادی علامہ فضل حق خیرآبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) کے خلاف ۱۸۵۹ء میں انگریزوں نے مقدمہ چلا کر انھیں جزیرۂ انڈمان بھیج دیا تو وہاں حالتِ اسیری ہی میں علامہ نے "الثورة الهندية" اور "قصائد فتنة الهند" لکھ کر حضرت مفتی عنایت احمد کاکوروی (متوفی ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۳ء) کے بدست انڈمان ہی سے ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء میں ہندوستان بھیجا۔ اور ان کے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی (متوفی ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء) نے انھیں مرتب کر کے ان کی نقلیں متعدد جگہوں پر (مثلاً گوپامئو ولاہرپور) بھیج دیں اور آج بھی اس کے کئی مخطوطے کتب خانہ ٹونک (راجستھان) اور مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود و محفوظ ہیں؟

خود اپنے والد ماجد مولانا خیرالدین دہلوی (متوفی ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء) شاگرد علامہ فضل حق خیرآبادی کے تعلق سے اس مخطوطہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) لکھتے ہیں کہ:

> "والد مرحوم نے معقولات کی تکمیل مولانا مرحوم سے کی تھی اس لئے ان کی مصنفات اور حالات سے خاص علاقہ رکھتے تھے۔ مولانا کے فرزند مولانا عبدالحق مرحوم نے یہ رسالہ خود اپنے قلم سے نقل کر کے والد مرحوم کو مکہ معظمہ بھیجا تھا۔ چنانچہ وہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔
> مولوی عبدالشاہد صاحب شیروانی نے جب مجھ سے اس رسالہ کی تصحیح و اشاعت کے ارادہ کا ذکر کیا تو مجھے نہایت خوشی ہوئی۔" ابوالکلام۔ دہلی۔ ۲۱راگست ۱۹۴۶ء (تعارف۔ باغی ہندوستان۔ مرتبہ عبدالشاہد شیروانی علی گڑھی، طبع اول مدینہ پریس بجنور ۱۹۴۷ء)

یہاں ہم نے طویل اقتباسات اس لئے نقل کیے کہ قطع و برید اور خود ساختہ مطلب نکالنے کا الزام عاید نہ کیا جاسکے۔ اور ہمارے قارئین انھیں پڑھ کر خود نتیجہ نکال سکیں کہ ۱۹۰۸ء میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (متوفی ۱۹۴۱ء) کی شائع کردہ کتاب جسے قبل طبع مولانا خلیل احمد انبیٹھوی سہارن پوری (متوفی ۱۹۲۸ء) و دیگر علمائے دیوبند بھی مکمل مطالعہ کر چکے ہیں۔ اس تاریخ میں اور

انگریزوں کے خلاف پرجوش تحریک آزادی شروع ہونے نیز ۱۹۴۷ء کے بعد کی تحریر کردہ تاریخ میں کتنا بُعد اور کتنا تضاد ہے؟

شاملی کی جھڑپ میں علمائے دیوبند کی شرکت کا نہ کسی سرکاری ریکارڈ میں نہ کسی معاصر تاریخ میں نہ ہی ان علما کی کسی تحریر میں کوئی ادنیٰ اشارہ ہے جن کا نام اچھال کر انھیں مجاہدین جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء ثابت کرنے کی آج لگاتار کوشش کی جارہی ہے۔

تذکرۃ الرشید (سوانح مولانا رشید احمد گنگوہی) کی طرح تذکرہ الخلیل (سوانح مولانا خلیل احمد انبیٹھوی سہارن پوری) بھی مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (متوفی ۱۹۴۱ء) نے لکھی اور اس کے اندر بھی بعض واقعات و حالات ایسے درج ہیں جن سے انگریز دشمنی نہیں بلکہ اس طرح کی کسی مہم سے صاف صاف لاتعلقی کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ یہ سوانحی کتابیں ہیں جنھیں خود اپنی مرضی سے پورے اطمینان کے ساتھ بلا کسی خوف و طمعِ ظاہری کے لکھا گیا ہے جس میں کسی طرح کی مجبوری کا کوئی دخل نہیں۔ ہاں اگر کسی سرکاری آفیسر کے سامنے یا کورٹ میں دیا گیا کوئی بیان ہوتا تو اس میں توریہ و تاویل کی گنجائش نکل سکتی تھی، مگر یہاں تو رضا و رغبت کے ساتھ فخریہ یہ سب کچھ لکھا جارہا ہے اور پوری جماعت کے کسی بھی ایک فرد کی طرف سے اس دور کی ایسی کوئی تحریری روایت نہیں ملتی جس میں مولانا میرٹھی کے بیان کی کوئی تردید و تکذیب کی گئی ہو۔ پھر بعد کے عام انگریز مخالف ماحول میں مذکورہ قدیم تاریخ کو بدل کر نئی تاریخ بنانے کا جواز کہاں سے اور کس طرح پیدا ہو گیا؟

☆☆☆☆☆☆☆

مدرسہ دیوبند کے بانی اور مقصدِ قیام

علماے دیوبند تفصیل کے ساتھ یہ لکھتے اور بیان کرتے چلے آرہے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نونوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) ہیں۔ اور اسی مناسبت سے فضلائے دارالعلوم دیوبند اپنے آپ کو "قاسمی" لکھتے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مدرسہ عربی و فارسی دیوبند (قائم شدہ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء) معروف بہ دارالعلوم دیوبند کے بانی حاجی عابد حسین قادری چشتی (متوفی ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء) ہیں۔ اس سلسلے میں خود حاجی عابد حسین قادری چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے افرادِ خاندان اور بعض انصاف پسند علما کی تحریریں اس کی مکمل تصدیق و تائید کرتی ہیں کہ دار العلوم کے اصل بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی نہیں بلکہ حاجی عابد حسین قادری چشتی دیوبندی ہیں۔

قیام مدرسہ دیوبند کے تعلق سے کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ محض ایک مکتب تھا جس کا بعد کے ہونے والے دارالعلوم سے کوئی تعلق نہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے محرک و بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی ہی ہیں مگر قیام مدرسہ کے وقت وہ دیدہ و دانستہ دیوبند سے غیر حاضر رہے تاکہ اس پر حکومت کی نظر نہ پڑے۔

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حاجی سید عابد حسین نے مدرسہ قائم کر کے ایک مضبوط بنیاد فراہم کردی مگر بعد کے حالات میں مولانا نانوتوی نے اپنے مخصوص رجحانِ طبع کی وجہ سے حاجی صاحب کو اہمیت دیے بغیر ۱۲۹۲ھ میں چھتہ کی مسجد سے ہٹ کر توسیع مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور پھر وہ اس پر ہر طرح حاوی ہوگئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ جس کی صدائے بازگشت یہ ہے:

"نکتہ تراشیوں کا وہ سلسلہ اس سے بھی زیادہ عجیب تر ہے جب نہ ماننے والی عقل کو تھپکیاں دیتے ہوئے لوریاں سنائی جاتی ہیں۔ انار کے درخت کے نیچے چھتہ کی مسجد میں پندرہ روپے ماہوار کے ایک مدرس کا تقرر کر کے کھولنے والوں نے جس مدرسہ کو کھولا تھا وہ مدرسہ ہی نہ تھا۔ ایک قصباتی

مکتب مقامی بچوں کی تعلیم کے لئے کھولا گیا تھا۔ گویا دارالعلوم کی تاریخ کا جو سلسلہ انار والے درخت کے ساتھ باندھا جاتا ہے، چاہا جاتا ہے کہ اس تاریخی رشتہ ہی کا انکار کر کے عقلی بے چینیوں کا ازالہ کردیا جائے۔

اس سے بھی زیادہ دور کی کوڑیوں کے لانے والوں کا یہ سیاسی نکتہ ہے کہ اپنے خاص حالات کے لحاظ سے قصداً وارادۃً سیدنا الامام الکبیر نے اپنے آپ کو اس مقام سے غائب کردیا تھا۔ جہاں بہر حال ان کی حاضری عقلاً ضروری اور ناگزیر تھی۔ یعنی اشتباہی نظر حکومت کی جو آپ پر تھی یہ عدم حاضری اسی مصلحت سے تھی۔

الغرض یہ یا اسی نوعیت کی "فیل شناسیوں" اور "دقیقہ آفرینیوں" کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو پیش کرنے والوں کی طرف سے پیش ہوتا رہتا ہے۔ (ص ۲۴۳ و ۲۴۴۔ سوانح قاسمی جلد دوم مؤلفہ مولانا مناظر احسن گیلانی)

حاجی سید عابد حسین صاحب (متوفی ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء) کے بانی مدرسہ دیوبند ہونے کے چند مستند حوالہ جات ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

"حاجی (عابد) صاحب نے تین چلّے کیے۔ پہلا جنگل میں دوسرا چودھری صابر بخش کی مسجد میں اور تیسرا مسجد چھتہ میں۔ جب آپ تیسرے چلّے ہی میں تھے کہ آپ کو مدرسہ قائم کرنے کا الہام ہوا۔ جمعہ کی شب خواب دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور حاجی صاحب قدس سرہ کو حکم فرمارہے ہیں کہ یہاں ایک عربی مدرسہ دین اسلام کی بقا اور ترویج کے لئے قائم کیا جائے۔

صبح کو حاجی صاحب نے دیوبند کے سر برآوردہ حضرات کو مسجد چھتہ میں بلایا۔ مولانا مہتاب علی، مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمٰن، مولانا فضل حق، مولانا نذیر احمد اور دوسرے حضرات شریک ہوئے۔ حضرت حاجی محمد عابد صاحب قبلہ نے ان حضرات کے سامنے اپنے رات کے خواب کو بیان کیا اور ایک عربی مدرسہ کے قیام کی رائے پیش فرمائی۔ اور فرمایا کہ جب پرانے عالم نہ رہیں گے تو کوئی مسئلہ بتانے والا بھی نہ ملے گا۔

ان حضرات نے مکمل طور پر تعاون کا یقین دلایا اور امداد کا وعدہ فرمایا۔ اسی مجلس میں حاجی صاحب قدس سرہ نے اپنا سفید رومال چندہ کے لئے بچھادیا اور ساتھ ہی اپنی جیب سے تین

ان حضرات نے بھی اپنا نام لکھوایا اور
روپے اس رومال پر رکھے۔ اور ہمیشہ دینے کا وعدہ فرمایا۔
مجلس ختم ہوگئی۔ یہ واقعہ ۲/ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ بروز جمعہ کا ہے۔
صبح ہوئی۔ اشراق کی نماز کے بعد گلے میں جھولی ڈالی اور اپنے تین روپے اس میں ڈالے اور
گھر گھر جا کر چندہ کا عمل شروع کردیا۔ اور شام تک چار سوا ایک روپے اور آٹھ آنے جمع ہو گئے۔ اور
پھر ڈیڑھ ماہ کی مدت میں اتنے روپے جمع ہو گئے کہ ۱۵/محرم ۱۲۸۳ھ کو دارالعلوم کا قیام عمل میں آ گیا۔
(ص: ۳۔ روداد دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۳ھ۔ خواب اور چندہ کا واقعہ تذکرۃ العابدین از مولانا نذیر احمد دیوبندی مطبوعہ دہلی ۱۳۱۷ھ میں بھی درج ہے)

"حاجی صاحب نے خود ہی شوریٰ سے کہا کہ مدرسہ کے واسطے زمین خریدنی چاہیے۔ اہل شوریٰ نے آپ سے کہا کہ اگر آپ کی رائے یہ ہے تو بہتر ہے مگر آپ ہی جگہ تجویز کر کے خرید فرمائیے۔ چند روز کے بعد حاجی صاحب نے جگہ تجویز کر کے خرید کی۔ اور اس کا بیع نامہ بھی حاجی صاحب کے نام ہوا۔ اور مولوی رفیع الدین جو مدرسہ کے مہتمم تھے انھیں کے ذمہ مدرسہ کی تعمیر کا اہتمام سپرد کیا۔ اور ایک لاکھ کی لاگت سے مدرسہ تعمیر ہوا۔ (ص: ۳۷۔ تذکرۃ العابدین از مولانا نذیر احمد دیوبندی۔ مطبوعہ دہلی ۱۳۱۷ھ)

خانوادۂ حاجی سید عابد حسین قادری چشتی دیوبندی (متوفی ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء) کے ایک رکن سید افتخار حسین محلہ ضیاء الحق دیوبند کی ایک تحریر کے اقتباسات یہ ہیں:

"وہ فخر اماثل واماجد سید محمد عابد رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو سحاب کے برسنے تک اور کتاب کے پڑھے جانے تک باقی رکھے۔ اس مدرسہ مقدسہ کی بنیاد قائم کرنے کا (اللہ نے ان پر) الہام کیا۔

پس حضرت ممدوح نے تائید رائے کے لئے ۱۲۸۲ھ میں پکارا۔ خلقت نے اسے نہایت غور سے سنا اور قبول کیا۔ اور جناب والا کی التماس کا اتباع کیا۔ پس یہ مدرسہ آں جناب کی سعیِ مشکور سے علم اور علماء کا ٹھکانہ اور مرجع فضل و فضلاء و پناہِ دین و دین داراں بن گیا۔
(الهدية السنية فی ذکر المدرسة الاسلامیه الدیوبندیة ۔مطبوعہ ۱۳۰۷ھ۔ از مولانا ذوالفقار علی دیوبندی والدِ گرامی مولانا محمود حسن دیوبندی)

چندہ کے لئے رومال پھیلانے والے اور سب سے پہلے چندہ دینے والے حاجی سید محمد عابد

حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ جس زمانے میں مدرسہ قائم ہوا اس زمانے میں مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی میرٹھ کے مطبع مجتبائی میں تصحیح کا کام انجام دیتے تھے جس کا ذکر مولانا یعقوب صاحب نے سوانح عمری مولانا محمد قاسم (مطبوعہ ۱۳۰۷ھ) میں کیا ہے۔ دیوبند میں مولانا محمد قاسم کا قیام ۱۲۹۰ھ سے پہلے ثابت نہیں۔ اس سے پہلے تک مولانا محمد قاسم کا مستقل قیام میرٹھ اور دہلی میں رہا۔ کبھی نانوتہ اور دیوبند بھی آجایا کرتے تھے۔

۱۳۰۶ھ میں شاہ رفیع الدین صاحب کے دیوبند سے ہجرت کر جانے کے بعد مدرسے سے ایک اشتہار شائع ہوا تھا (جو الحمد للہ ہمارے پاس ابھی تک محفوظ ہے) جس پر مندرجہ ذیل بزرگوں کے دستخط موجود ہیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا ذوالفقار علی صاحب، مولانا فضل الرحمٰن صاحب، منشی فضل حق صاحب مہتمم سوم دارالعلوم دیوبند، حکیم مشتاق احمد دیوبندی، حکیم ضیاء الدین صاحب رام پوری۔ اس اشتہار کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

"جملہ خیر خواہانِ مدرسہ کو بسبب روانگی مولوی صاحب موصوف کے نہایت تشویش پیش آئی۔ ناچار بجز اس تدبیر کے کوئی چارہ نہ بن پڑا کہ سب مجتمع ہو کر بخدمتِ بابرکت حضرت حاجی عابد صاحب جو بانی مدرسہ و مجوزِ اول مدرسہ ہذا و حامی و سرپرست و سرآمد اربابِ شوریٰ ہیں، حاضر ہو کر ملتجی ہوئے کہ اب جناب اس کارِ اہتمام کو انجام دیں کہ آخر یہ مدرسہ آپ ہی کا ہے۔"

ابتدائی تیس سالوں کی رودادوں میں بار ہا حاجی محمد عابد صاحب کو اصل اصول مدرسہ لکھا گیا۔ ملاحظہ ہو روداد ۱۲۸۶ھ۔ حضرت نانوتوی کو مدیر لکھا گیا اور بعض جگہ مربیِ اعظم کے الفاظ ہیں لیکن اصل اصول حاجی صاحب کو ہی لکھا گیا۔ ملاحظہ ہو روداد ۹۶۔۱۲۹۵ھ۔ (روزنامہ قومی آواز نئی دہلی۔ شمارہ ۲۲/دسمبر ۱۹۹۷ء)

سچی بات یہی ہے۔ یہی واقعہ ہے۔ اور اسی کو واقعہ ہونا بھی چاہیے کہ جامعہ قاسمیہ یا دیوبند کے دارالعلوم کی جب بنیاد پڑی تو سیدنا الامام الکبیر (مولانا نانوتوی) اس وقت دیوبند میں موجود نہ تھے۔ اس لئے قیام دارالعلوم کی ابتدائی داستان سچ پوچھیے تو میرے دائرۂ بحث سے خارج ہے۔ (ص ۲۴۸۔ سوانح قاسمی جلد دوم از مولانا مناظر احسن گیلانی)

"مولانا محمد قاسم مدرسہ دیوبند کے اصل بانی نہ تھے۔ لیکن مدرسہ کو ایک شاندار دارالعلوم بنانے کا خیال آپ کا تھا۔ جن قابلِ عزت بزرگوں نے اس مدرسے کو شروع کیا شاید ان کا

منتہائے مقصود ایک مکتب سے زیادہ نہ تھا جو جامع مسجد کی سہ دریوں میں جاری رہ سکتا تھا لیکن مولانا محمد قاسم نے شروع ہی سے اپنا تخیل بلند رکھا اور مدرسہ کی بنیادیں اس قدر وسیع اور بلند رکھیں کہ ان پر دارالعلوم کی عالی شان عمارت تعمیر ہو سکی۔ (ص: ۲۰۰۔ موج کوثر۔ از شیخ محمد اکرام مطبوعہ دہلی)

اس مدرسہ کی ابتدا سہارن پور کے ایک قصبہ دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد (چھتہ والی) میں ایک بزرگ حاجی محمد عابد صاحب نے قائم کیا تھا لیکن اس یہ ایک ابتدائی مدرسہ تھا جو دیوبند کے ایک بزرگ حاجی محمد عابد صاحب نے قائم کیا تھا لیکن اس کی ساری ترقی و توسیع، شہرت و مقبولیت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے اخلاص وللّٰہیت، بلند ہمتی و بلند نظری کی رہین منت ہے۔ الخ (ص ۱۲۳۔ ہندوستانی مسلمان! ایک جائزہ۔ مولفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ بار سوم ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوہ لکھنؤ)

مولانا محمد یونس فاضل دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

"مجھے یاد ہے۔ میں اس وقت دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرتا تھا۔ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد اور شیخ الادب و الفقہ مولانا اعزاز علی حیات تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کو بانی دارالعلوم کون؟ تحقیق سپرد کی گئی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنے قلم سے حضرت حاجی عابد کو بانی دارالعلوم تحریر کیا۔

قاری طیب صاحب نے اعتراض کیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے فرمایا۔ میری تحقیق یہی ہے کہ حضرت حاجی عابد بانی دارالعلوم ہیں۔ اور میں اپنے قلم سے اس کو قلم زد نہیں کروں گا۔ آپ کی مرضی۔ آپ اپنے قلم سے اس کو قلم زد کر دیجیے۔ قاری صاحب نے برہمی کا اظہار فرمایا اور اپنے قلم سے اس کو قلم زد کر دیا۔

حقیقت اپنی جگہ ہے کہ دارالعلوم کے بانی حضرت حاجی عابد ہیں۔ حافظ محمد احمد مہتمم رہے۔ پھر ان کے بیٹے مولانا طیب مہتمم رہے۔ اس وجہ سے ان کے دادا دارالعلوم کے بانی بن گئے۔ (روزنامہ قومی آواز، نئی دہلی، شمارہ ۱۶؍دسمبر ۱۹۹۷ء)

"حاجی محمد عابد کی مساعی سے ۱۵؍محرم الحرام ۱۲۸۳ھ/ ۳۰؍مئی ۱۸۶۶ء بروز پنج شنبہ اس

مدرسہ کی بنیاد پڑی اور اس کا نام "مدرسہ عربی و فارسی و ریاضی" رکھا گیا۔ (ص: ۱۵۵۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اول از سید محبوب علی رضوی۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۷۷ء)

مولانا عبدالحمید نعمانی قاسمی ناظم نشر و اشاعت جمعیۃ العلماء ہند لکھتے ہیں:

"دیوبند میں حضرت حاجی صاحب کے سگے پوتے سید شاداب ہمارے ہم درس تھے۔ ان کے پاس بہت سے پرانے کاغذات ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قیام دارالعلوم کے اول محرک و مجوز حضرت حاجی صاحب ہی تھے۔ البتہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سمیت دوسرے اکابر سے صلاح و مشورہ کیا جاتا رہا۔ (روزنامہ قومی آواز، نئی دہلی۔ ۲؍جنوری ۱۹۹۸ء)

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مدرسہ دیوبند کا قیام محض ایک مدرسہ کی حیثیت سے ہوا تھا۔

"یہ ادارہ ایک چھوٹے سے مدرسہ کی حیثیت سے جس کی کوئی اہمیت نہ تھی قائم ہوا لیکن اس کے ذمہ داروں اور مدرسہ کے اساتذہ کے اخلاص، قناعت اور ایثار کی بدولت برابر ترقی کرتا رہا۔ الخ (ص ۱۳۲۔ ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ۔ مؤلفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ بار سوم ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء۔ مجلس تحقیقات ندوہ لکھنؤ)

"الحاج صوفی روشن ضمیر مولانا عابد حسین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بلاشبہ دارالعلوم کے ابتدائی بانی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی اور آفاقی تخیل سے مرحوم کا دل و دماغ بالکل خالی تھا۔ ایک عظیم درس گاہ جو آفاقی تصورات کی حامل ہو کلیۃً حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مرہونِ منت ہے۔ نیز ابتدا کی آویزشیں جن کی محتاط تعبیر شکر رنجی یا مشاجرت ہی سے ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی واقعیت صرف اتنی نہیں کہ عمارت کے مختصر یا وسیع کرنے پر دونوں بزرگوں کا اختلاف تھا جیسا کہ اپنے بزرگوں سے برابر سنتا رہا۔

مجھے عرض کرنے دیجیے کہ یہ آویزش خالص نظریاتی جنگ تھی۔ میں تفصیلات میں تو ہرگز نہ جاؤں گا اس لئے کہ وہ ایک دل خراش تاریخ کا باب ہے۔ لیکن اپنے علم و مطالعہ کی بنیاد پر اتنا ضرور عرض کر دوں گا کہ جو دیوبند حضرت حاجی عابد حسین المغفور کی زیر تربیت بن رہا تھا وہ یقیناً اس دیوبند سے مختلف ہوتا جس کا تعارف اور شہرت عالم اسلام سے گذر کر اقصائے عالم تک پہنچ چکی ہے۔ (ص: ۴۹۔ ماہنامہ البلاغ کراچی، ذوالحجہ ۱۳۸۸ھ/ مارچ ۱۹۶۹ء۔ از مولانا انظر شاہ کشمیری استاذ دارالعلوم دیوبند)

Scanned by CamScanner

"چوں کہ لوگوں کے دلوں میں خلوص نہیں رہا اس لئے اختلافات رونما ہوتے رہے۔ نتیجہ
یہ ہوا کہ ایک وقت وہ آیا کہ آپ (حاجی صاحب) مدرسہ کے کاروبار سے علیحدہ ہو گئے اور فرمایا
کہ اب للّٰہیت نہ رہی بلکہ نفسانیت آ گئی۔ فقیر کو ان سب باتوں سے کیا غرض؟۔ (ص:۶۷۔
تذکرۃ العابدین از مولانا نذیر احمد دیوبندی)

"سمجھنے کے لئے صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ چھتہ کی مسجد جہاں سے دارالعلوم کی ابتدا
ہوتی ہے حضرت حاجی صاحب کی نشست گاہ یہی مقدس عمارت ہے۔ اس مسجد میں رمضان
المبارک کے چاروں جمعوں میں اب تک میلاد، حضرت حاجی صاحب کی یاد میں جاری ہے۔ میں
نے کیا لکھا بس اس اجمال میں نکتہ سنج ان ساری تفصیلات کو پڑھ لیں جسے میں نے کم از کم تاریخ
نگاری کے تلخ فریضہ کے قطعاً خلاف سنانے سے پہلو بچا لیا۔ (حاشیہ۔ ص:۵۰۔ ماہنامہ البلاغ
کراچی۔ ذوالحجہ ۱۳۸۸ھ/ مارچ ۱۹۶۹ء بقلم مولانا انظر شاہ کشمیری)

"—— اکابر دیوبند جن کی ابتدا میرے خیال میں سیدنا الامام مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ
اللہ علیہ اور فقیہ اکبر مولانا رشید احمد گنگوہی سے ہے —— دیوبندیت کی ابتدا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ
اللہ علیہ سے کرنے کی بجائے مذکورہ بالا دو عظیم انسانوں سے کرتا ہوں —— (ص:۴۸۔ ماہنامہ
البلاغ کراچی، ذوالحجہ ۱۳۸۸ھ/ مارچ ۱۹۶۹ء بقلم مولانا انظر شاہ کشمیری)

"ہمارے اکابر حضرت گنگوہی و حضرت تھانوی نے جو دین قائم کیا تھا اس کو مضبوطی سے
تھام لو۔ اب رشید و قاسم پیدا ہونے سے رہے۔ بس ان کے اتباع میں لگ جاؤ۔ (ارشاد شیخ زکریا
سہارن پوری در مجلس ۱۹ر رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ بموجودگی مولانا محمد منظور نعمانی و مولانا ابوالحسن
علی ندوی، ص ۱۲۶۔ صحبتے با اولیاء۔ مرتبہ تقی الدین ندوی مظاہری، مطبوعہ مجلس معارف سرکیس،
سورت، گجرات۔ طبع اول ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء)

مولانا محمود حسن دیوبندی (متوفی نومبر ۱۹۲۰ء) کی تعلیم کے بارے میں مولانا عاشق الٰہی
میرٹھی (متوفی ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء) لکھتے ہیں:

"پھر ۱۲۸۶ھ میں کتب صحاحِ ستہ اور بعض دیگر کتب اپنے فخر زمانہ استاد حضرت مولانا
محمد قاسم صاحب سے پڑھیں جو اس وقت میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے مطبع کی خدمتِ تصحیح قبول
فرمائے ہوئے تھے۔ (ص ۱۱۰۔ تذکرۃ الخلیل مطبوعہ میرٹھ)

ان حقائق کے باوجود یہ حیرت انگیز اور "تاریخ ساز روایت" ملاحظہ فرمائیں جس کی تشہیر
ہوتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری لکھتے ہیں:

مولانا مناظر احسن گیلانی (متولد ربیع الاول ۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۲ء۔ متوفی ۱۳۷۶ھ/ جون
۱۹۵۶ء) نے لکھا ہے کہ جب انھوں نے ایک مرتبہ حضرت شیخ الھند (مولانا محمود حسن) سے
دریافت فرمایا کہ سیاسیات میں حضرت کا مسلک کیا ہے؟ تو حضرت پر ایک خاص کیفیت طاری
ہو گئی اور حضرت نے فرمایا:

"حضرت الاستاذ (حضرت نانوتوی) نے اس مدرسے کو کیا درس و تدریس
اور تعلیم و تعلم کے لئے قائم فرمایا تھا؟ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء
کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ ایسا کوئی مرکز ہو جس
کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی
جائے۔ (سوانح قاسمی۔ جلد۲۔ ص ۲۲۶)

مولانا گیلانی نے اسے دارالعلوم کی اساسی خصوصیت قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مدرسہ دیوبند کی یہی وہ "اساسی خصوصیت" تھی جس نے اس مدرسے
کے تمام کاروبار حتیٰ کہ تعلیم میں بھی ایسی ہی حریت پرور خصوصیات پیدا
کیں اور وہ دینی اور مذہبی حمیت اور غیرت کا ہندگیر ہی نہیں عالم گیر
جامعہ اور اِقامتی ادارہ بن گیا۔ اس کے فضلا کا ایک خاص مکتبِ خیال
نمایاں ہوا اور اس کے مستفیدین ایک ایسا خاص ملا جلا اور مرکب نصب
العین لے کر باہر نکلے جس میں سب پر چھا جانے کی اسپرٹ موجود تھی۔"
(ایضاً) (ص ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ بزرگان دارالعلوم دیوبند اور جہادِ شاملی
۱۸۵۷ء۔ از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری۔ فرید بک ڈپو۔ مٹیا محل،
دہلی۔ ۲۰۰۶ء)

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس روایت کو من و عن کیسے قبول کر لیا جائے جب کہ سوانح قاسمی کے
پانچ سو صفحات الحاقی ہیں۔ (دیکھیے ماہنامہ تجلی دیوبند۔ شمارہ فروری و مارچ ۱۹۶۱ء۔ ص ۵۷۔ تحریر
مولانا عامر عثمانی فاضل دارالعلوم دیوبند)

اور دوسری بات یہ ہے کہ جب مولانا مناظر احسن گیلانی مدرسہ عربی و فارسی دیو بند کا اصل
بانی حاجی عابد حسین کو سمجھتے تھے تو وہ اس جواب کو بلا چون و چرا کیسے تسلیم کر سکتے تھے کہ ''حضرت
الاستاذ (حضرت نانوتوی) نے اس مدرسے کو کیا درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کے لئے قائم کیا
تھا؟'' اور اگر انہیں اپنے شیخ الہند کے بیان پر اعتماد تھا تو انھوں نے حاجی عابد حسین کی جگہ مولانا
محمد قاسم نانوتوی کو اصل بانی سمجھنے سے کیوں انکار کر دیا تھا؟

تیسری بات یہ ہے کہ قیام مدرسہ دیو بند ۱۸۶۶ء سے کم از کم پچاس سال تک تحریراً و تقریراً
ذمہ داران مدرسہ کی جانب سے اس کا کوئی ہلکا سا بھی اشارہ کہیں نہیں ملتا کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی
تلافی کے لئے یہ مدرسہ قائم کیا تھا۔

حاجی سید عابد حسین قادری چشتی بانی مدرسہ دیو بند (قائم شدہ ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء) معروف
بہ دار العلوم دیو بند کو مدرسہ سے بے اثر و بے دخل کیے جانے کے اسباب و عوامل کی نشان دہی
کرتے ہوئے حاجی صاحب کے خانوادہ کے ایک فرد سید افتخار حسین لکھتے ہیں کہ:

''وہ نفسانیت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اس مدرسہ کے ذریعہ اسلام
کی حقانیت و صداقت کی نشر و اشاعت کا جو اہم فریضہ انجام دینا چاہتے تھے
اس ادارہ کے دوسرے اراکین اس سے متفق نہیں تھے۔

ان حضرات کا نقطۂ نظر بالکل جداگانہ تھا۔ وہ اس مدرسہ کو انگریزی حکومت کی رضا و منشا
کے مطابق چلانا چاہتے تھے۔ کیوں کہ مدرسہ کے صدر مدرس مولوی یعقوب حکومتِ وقت کے
زبردست بہی خواہ تھے۔ مدرسہ کی صدر مدرسی قبول کرنے سے قبل وہ کئی شہروں میں انگریز
گورنمنٹ میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول کے فرائض انجام دے کر اپنے حسنِ کارکردگی سے
انگریزوں کی نظر میں محبوب بن چکے تھے۔ اپنے اس کامیاب تجربہ کی روشنی میں اس مدرسہ کو اسی
روش پر لے جانا چاہتے تھے جو انگریز حکومت کے عین منشا کے مطابق تھا اس لئے ان کے
خیالات کا حاجی محمد عابد کے خیالات سے متصادم ہونا ناگزیر تھا۔ (ص ۶۱۔ دار العلوم دیو بند کا
بانی کون؟ از سید افتخار حسین دیو بند)

قاری محمد طیب مہتمم دار العلوم دیو بند (متوفی ۱۹۸۳ء) بتلاتے ہیں کہ اس کے ابتدائی دور
کے مدرسین دو طرح کے تھے۔ مسجد نشین حضرات یا گورنمنٹ کے سابق ملازمین۔ چنانچہ وہ تحریر

کرتے ہیں:

''پھر جس میں اکثریت ایسے حضرات کی تھی جو تارک الدنیا اور مسجد نشیں
بزرگ تھے۔ جنھیں سیاسیات سے تو کیا بجائے خود عام شہری معاملات سے
بھی کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔
یا ایسے بزرگوں کی تھی جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور حال پنشنر تھے۔ جن
کے بارے میں گورنمنٹ کو شک و شبہ کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔
(حاشیہ ص ۲۴۶ و ۲۴۷۔ سوانح قاسمی جلد دوم)

لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے معتمد مسٹر پامر نے ۳۱ر جنوری ۱۸۷۵ء میں
مدرسہ دیو بند کا دورہ کر کے معاینہ رپورٹ میں کہا—

''جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپے کے صرف سے ہوتا ہے وہ یہاں کوڑیوں
میں ہو رہا ہے۔ جو کام پرنسپل ہزاروں روپے ماہانہ تنخواہ لے کر کرتا ہے وہ یہاں ایک مولوی چالیس
روپے ماہانہ پر کر رہا ہے۔ یہ مدرسہ خلافِ سرکار نہیں بلکہ ممد و معاونِ سرکار ہے۔ (ص: ۲۱۷۔
سوانح مولانا محمد احسن نانوتوی مطبوعہ کراچی)

اس دورہ اور معاینہ پر ذمہ دارانِ مدرسہ دیو بند کو فخر بھی تھا۔

''تمام اندرونی، بیرونی صدمات اور حوادث کے بعد جو نہایت ہی اعلیٰ درجہ
کی کامیابی و شہرت مدرسہ کو حاصل ہوئی وہ سر جان ڈگس لاٹوش لفٹننٹ
گورنر ممالکِ متحدہ آگرہ و اودھ کا بغرضِ خاص معاینہ مدرسہ دیو بند آنا
تھا''۔ (ص: ۷۔ روئداد مدرسہ دیو بند ۱۳۲۲ھ)

۱۸ر مئی ۲۰۰۷ء کو ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم صدر شعبۂ علوم اسلامیہ ہمدرد یونیورسٹی نئی دہلی کے
آفس (ہمدرد یونیورسٹی) میں پروفیسر بصیر احمد خاں سابق صدر شعبۂ علوم اسلامیہ ہمدرد یونیورسٹی
سے ملاقات ہوئی۔ ان کے پاس میری کتاب ''انگریز نوازی کی حقیقت'' (مطبوعہ دار القلم دہلی۔
۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء) پہنچ چکی تھی۔ پروفیسر موصوف شیخ محمد زکریا سہارن پوری کے مرید اور میرٹھ
کے باشندے ہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں
مقالۂ ڈاکٹریٹ لکھ کر Ph.D کی سند سے سرفراز ہو چکے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک انھوں نے

مجھ سے مختلف موضوعات پر گفتگو کی۔ اسی دوران انھوں نے صراحتاً یہ باتیں کہیں:

(۱) مدرسۂ دیوبند اسی طرح ایک مدرسہ کی شکل میں شروع ہوا تھا جیسے ہندوستان میں عام طور پر دینی مدارس کا قیام ہوتا ہے کہ ان کا مقصد محض دینی تعلیم کا فروغ ہوتا ہے۔ اس لئے مدرسہ دیوبند کے بارے میں یہ دعویٰ کہ وہ انگریزوں کے خلاف تربیتی کیمپ اور ایک فوجی چھاؤنی کے طور پر قائم ہوا تھا ایک بالکل غلط اور بے بنیاد بات ہے جس کا حقیقت سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں۔

(۲) اس مدرسہ کے بانی حضرت حاجی عابد حسین صاحب تھے اور انھوں نے ہی اپنے اخلاص و محنت اور اپنے اثر و رسوخ نیز اپنے قریبی علما و احباب و متعلقین کے امداد و تعاون سے اس کی بنیاد مضبوط کی تھی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی بہت بعد میں اس سے باضابطہ منسلک ہوئے اس لئے انھیں بانی دارالعلوم کی حیثیت سے شہرت دینا دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کو مسخ کرنا ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی اس کے بانی قطعاً نہیں تھے۔ ہاں اسے ایک بڑے دارالعلوم اور ایک معیاری درسگاہ بنانے اور اسے ہندوستان گیر سطح پر مرکزِ تعلیم و تعلم بنانے میں یقیناً ان کا نمایاں اور مرکزی کردار ہے اس لئے ان کا ذکر شایانِ شان طور پر کرنا ناگزیر ہے۔ مگر انھیں بانی دارالعلوم قرار دینا تاریخی حقائق کی تکذیب اور ایک ناپسندیدہ کوشش ہے۔

(۳) شاملی کی جھڑپ جس میں مولانا محمد قاسم نانوتوی و مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرھما کی شرکت اور حافظ ضامن کی شہادت کا ذکر ہے وہ مقامی نوعیت کا ایک محدود تصادم تھا جس کا سہارا لے کر بہت بڑے پیانے پر جنگ ۱۸۵۷ء میں ان حضرات کے سرگرم کردار وغیرہ کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے۔ شاملی کے تصادم کو دہلی و لکھنؤ وغیرہ کی طرح پیش کرنے کی مہم اور ان حضرات کی لمبی چوڑی پلاننگ کی کوئی تاریخی بنیاد نہیں ہے۔ اس لئے اس طرح کی بات کو غلو ے عقیدت کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔

یہ پوری گفتگو ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم کے آفس میں ان کی موجودگی میں ہوئی۔ پروفیسر بصیر احمد خاں نے صاف الفاظ میں اپنے مذکورہ خیالات کا اظہار کیا۔ جولائی ۲۰۰۷ء کے دوسرے ہفتے میں پروفیسر موصوف اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی نئی دہلی کے پرو وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہو چکے ہیں۔

سید محبوب علی رضوی لکھتے ہیں:

''حضرت حاجی صاحب کا ساٹھ برس تک چھتہ کی مسجد میں قیام رہا۔ مشہور ہے کہ تیس سال تک آپ کی تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی۔ نماز تہجد کا ایسا التزام تھا کہ ساٹھ سال تک قضا کی نوبت نہیں آئی۔ صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے۔ رشد وھدایت اور تذکیر و تزکیۂ قلوب کے علاوہ آپ کو فنِ عملیات میں زبردست ملکہ تھا۔ (ص:۲۲۲۔ جلد دوم ۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند از سید محبوب علی رضوی۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۷۷ء)

حاجی سید عابد حسین کا تعارف کراتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی (متولد ربیع الاول ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء۔ متوفی ۱۳۷۶ھ/ جون ۱۹۵۶ء) لکھتے ہیں:

''سوانحِ مخطوطہ کے مصنف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چشتی طریقہ کے ایک بزرگ جن کا نام نامی میاں جی کریم بخش تھا۔ رام پور منیہاران کے رہنے والے تھے۔ ان ہی سے حاجی صاحب مرید ہوئے۔ کسب و سلوک کے مراتب ان ہی کے زیر تربیت طے کیے۔ خلافت بھی حاجی صاحب کو میاں جی کریم بخش ہی سے شروع میں حاصل ہوئی تھی۔ اسی بنیاد پر لکھا ہے کہ:

''جناب میاں جی کریم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ رام پوری چشتی کے خلیفہ ہیں۔'' ص ۳۶۔

اسی کتاب میں اس کی معاصرانہ شہادت بھی مصنف کتاب نے ادا کی ہے کہ:

''اہل دیوبند کو آپ (سید محمد عابد صاحب) سے کمال درجہ عقیدت ہے۔''

ظاہر ہے کہ ایک سالک مسلکِ معرفت و حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ جب اپنے پیر و مرشد میاں جی کریم بخش رحمۃ اللہ علیہ چشتی کے خلیفہ مجاز بھی سید صاحب ہو چکے تھے تو اس زمانہ کے لحاظ سے مسلمانانِ دیوبند کی عقیدت کیشیوں اور نیازمندیوں کا مرکز ان کی ذات گرامی بن گئی ہو تو اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا تھا؟

بلکہ اسی کے ساتھ اسی کتاب میں سید صاحب مرحوم کی ایک خصوصیت جس کے یک گونہ مشاہدہ کا موقعہ خود اس فقیر کو بھی اسی زمانے میں ملا جب دارالعلوم میں زیر تعلیم تھا۔ نہ صرف دیوبند بلکہ دیوبند سے باہر حتی کہ صوبہ جاتِ متحدہ سے بھی آگے بڑھ کر بہار و بنگال تک سید صاحب کی اس امتیازی خصوصیت کا چرچا اور شہرہ پھیلا ہوا تھا۔

اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ سید صاحب کے

دیگر ظاہری وباطنی کمالات کے ساتھ ساتھ:

''ان میں ادنیٰ تعویذ وگنڈہ ہے۔ جس کے سبب اہل دیوبند ونواح دیوبند
کے دکھ درد ودلدّر دور ہوتے ہیں۔''

اسی کا نتیجہ تھا کہ سید حاجی صاحب کی ہر دل عزیزیاں خواص ہی کے حلقے تک محدود نہ تھیں بلکہ بقولِ مصنفِ کتاب:

''دیوبند کے مسلمانوں میں شاید کوئی ایسا بچہ ہوگا جس کے گلے میں آپ
(سید محمد عابد) کا تعویذ نہ ہوگا۔ اور کم تر ایسی عورتیں ہوں گی جن کے بازو
پر آپ کا نقش نہ ہو۔'' (ص۲۳۹۔ سوانح قاسمی جلد دوم)

''ارباب حوائج اکثر ان (حاجی محمد عابد) کی خدمت میں آیا کرتے ہیں۔ صبح سے رات دس بجے تک نقوش اور تعویذ تقسیم کرتے ہیں۔ ساکنین دیوبند ان کے بہت معتقد ہیں۔ (ص:۸۰۔ دہلی اور اس کے اطراف۔ از حکیم عبدالحی رائے بریلوی۔ مطبوعہ دہلی)

''بعد نماز مغرب نوافل وختم خواجگان وغیرہ سے فراغ حاصل کر کے جو کوئی مرید یا مہمان ہوتا اس سے باتیں کرتے۔ ہر جمعہ کو بعد نماز مغرب مولود شریف کی محفل کا اہتمام کرتے۔ اس میں بہت زرِ کثیر صرف کرتے تھے اور تا زیست ہمیشہ کراتے رہے۔ (ص:۷۷۔ تذکرۃ العابدین از مولانا نذیر احمد دیوبندی۔ مطبوعہ دہلی ۱۳۱۷ھ)

گذشتہ حوالوں سے دو دو چار کی طرح واضح اور ثابت ہو جاتا ہے کہ:

(۱) مدرسہ اسلامی عربی دیوبند (در چھتہ والی مسجد سنِ قیام ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء) جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے نام سے مشہور ہوا۔ اس مدرسہ کے بانی سلسلۂ قادریہ وچشتیہ کے ایک بزرگ حاجی سید عابد حسین (وصال ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء) متوطن دیوبند تھے اور ۱۳۲۰ھ تک اس مدرسہ کی روداد واشتہارات وغیرہ میں انھیں کا نام بانی کی حیثیت سے درج کیا جاتا رہا۔

(۲) مدرسہ صرف دینی تعلیم کے لئے قائم ہوا تھا اور حاجی سید عابد حسین اور ان کے رفقا ومعاونین کی کسی مستند تحریر وبیان میں اس کا کوئی ہلکا سا بھی اشارہ نہیں ملتا کہ انگریزوں کے خلاف نظریاتی وعملی مرکز کے طور پر اس کی بنیاد رکھی جا رہی ہے اور اس کے اغراض ومقاصد میں بھی ایسی کوئی چیز شامل نہیں ہے۔

(۳) ۱۲۹۰ھ میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اس مدرسہ میں آئے اور انھوں نے اسے ترقی اور شہرت دی۔ اس طرح قیام مدرسہ کے آٹھ سال کے بعد مولانا نانوتوی اس سے باضابطہ منسلک ہوئے۔ ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں مولانا نانوتوی کا انتقال ہوگیا۔

دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے ایک رکن سید محی الدین صاحب تھے۔ جن کا مختصر تعارف اور چھتہ کی مسجد دیوبند کے ایک حجرے کے سلسلے میں ایک بڑا کام یہ ہے:

''ہمارے مخدوم ومحترم الحاج المولوی سید محی الدین صاحب بی۔اے
(علیگ) وبیرِ اسٹرایٹ لا، جو حکومت آصفیہ حیدرآباد دکن میں ایجوکیشن اور
ریلیجن یعنی تعلیم ومذہب کے محکمہ کی معتمدی (سکریٹری) کے عہدہ سے
وظیفہ یاب ہو کر اب بجائے البھاری والحیدرآبادی کے الباکستانی بنے
ہوئے کراچی میں مقیم ہیں۔
ان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ چھتہ کی مسجد کے اس ''کمرے'' کی فرسودہ وربودہ
حالت کو دیکھ کر اپنے ذاتی مصارف سے اتنا درست کرا دیا کہ گویا ایک نیا
کمرہ ہی بن گیا۔ جس سے طلبہ مستفید ہوتے ہے اور سید صاحب کے حق
میں دعا گو ہیں۔ (حاشیہ ص ۲۳۱۔ سوانح قاسمی جلد دوم)

انھیں سید محی الدین سابق ممبر مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی ایک روایت بیان کرتے ہوئے مولانا عامر عثمانی فاضل دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء) لکھتے ہیں:

''دارالعلوم کے سلسلے میں عاجز کے بزرگ واقربا کا تذکرہ آپ نے جس انداز میں کیا ہے اس پر چند الفاظ کہنے کو بے اختیار طبیعت چاہتی ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ اب وہ نہیں جو آپ سمجھے بیٹھے ہیں بلکہ وہ ہے جسے ''سوانح قاسمی'' میں باور کرایا گیا ہے۔ تاریخ نویسی کا فن پرانا ہے اور اب تاریخ سازی کا دور ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی پر اللہ کی رحمتیں ہوں۔ کچھ تو کرشمے ان کی پرواز خیال نے دکھلائے ہیں۔ کچھ ان بزرگوں نے دکھائے جن کے نزدیک دارالعلوم کے قیام کا کریڈٹ ایک خاص خاندان کو دینا دین وملت کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

ابھی جولائی ۱۹۶۰ء میں خاکسار کراچی گیا تھا۔ یہاں سید محی الدین صاحب جو کبھی

دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر بھی تھے جن کی نیک نفسی اور زہد وتقویٰ پر ان کے واقف کاروں میں
کوئی اختلاف نہیں اور جن کے گہرے تعلقات مولانا مناظر احسن سے بھی تھے، ملاقاتیں ہوئیں۔
ایک موقعہ پر انھوں نے واقعہ سنایا کہ جب ''سوانح قاسمی'' چھپنے کی تیاریاں تھیں تو ہمیں اس کے
پڑھنے کا بے حد اشتیاق لگا ہوا تھا۔ چھپ کر آگئی تو ذوق وشوق سے پڑھا۔
لیکن بڑی حیرت ہوئی یہ دیکھ کر کہ جن تاریخی امور کا ہمیں علم تھا ان کا تو دور دور تک اس میں
پتہ نہیں مگر ایک نئی تاریخ ضرور موجود ہے۔ اضطراب ضبط نہ ہوا تو سفر کر کے گیلانی صاحب کے
پاس پہنچے اور عرض کیا کہ حضرت! یہ آپ نے کیا کیا لکھ دیا؟ گیلانی صاحب کے چہرے پر کرب کی
علامات ظاہر ہوئیں اور تأسف کے ساتھ فرمانے لگے۔
کیا بتاؤں بھائی! کمال ہو گیا جو کچھ میں نے لکھا تھا وہ تو کچھ اور ہی تھا۔ ہم نے پوچھا اس کا
کیا مطلب ہوا؟ انھوں نے فرمایا! میرے تقریباً پانچ سو صفحات بدل دیے گئے ہیں۔
اس حقیقت کو اور بھی متعدد حضرات جانتے ہیں اور وہ ابھی زندہ ہیں۔ کہ دارالعلوم کی طرف
سے چھاپی ہوئی دارالعلوم کی مستند تاریخ ''سوانح قاسمی'' کس بے تکلفی کے ساتھ اصل مسودے
میں تغیرات کر کے چھاپی گئی ہے۔ اور تغیرات معمولی نہیں وسیع تر اور بنیادی ہیں۔ (ص:۵۷۔
ماہنامہ تجلی دیوبند۔ شمارہ فروری و مارچ ۱۹۶۱ء)

☆☆☆☆☆☆

تاریخ نویسی سے تاریخ سازی تک

مذکورہ سارے تاریخی حقائق کے باوجود قارئین کو حیرت ہوگی کہ اصل ماجرا کیا ہے؟ اور یہ
تاریخ تھی کچھ اور ہوگئی کچھ اور۔ اس کی آخر وجہ کیا ہے؟ اس کا صرف ایک جواب ہے کہ بعض
محققین ومؤرخین نے جان بوجھ کر فرضی تاریخ لکھنے کا مذموم کردار ادا کیا ہے۔ جیسا کہ اس سلسلے
کے ایک مشہور مؤرخ غلام رسول مہر (متوفی ۱۳۹۱/۱۹۷۱ء) ببانگِ دہل اعلان کرتے ہوئے
اس کا اعتراف واقرار خود ہی اس طرح کر رہے ہیں۔

''میں مجاہدین کی شان وآبرو قائم رکھنے کا قائل ہوں۔ اگرچہ وہ بعض سابقہ بیانات یا توجیہات
کے عین مطابق نہ ہو۔'' (ص:۳۳۳۔ افاداتِ مہر۔ از شیر محمد پنی۔ مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور)

تاریخ گری کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔ غیر مقلد محدث مولانا نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/
۱۹۰۲ء) نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے دوران ایک انگریز میم کو اپنے گھر میں ساڑھے تین ماہ تک پناہ
دی تھی اور پھر آگے کیا ہوا یہ معروف غیر مقلد عالم فضل حسین بہاری (متوفی ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۶ء)
شاگرد مولانا نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''تین مہینوں کے بعد جب پوری طرح امن قائم ہو چکا تب اس نیم جان
میم کو جواب بالکل تندرست وتوانا تھی، انگریزی کیمپ میں پہنچا دیا۔ جس
کے صلے میں مبلغ ایک ہزار تین سو اور مندرجہ ذیل سارٹیفکٹیس ملیں۔ الخ

(ص:۹۵۔ الحیاۃ بعد المماۃ از فضل حسین بہاری۔ مطبوعہ الکتاب انٹرنیشنل۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵)

اسی واقعہ کے بارے میں غیر مقلد عالم ومؤرخ غلام رسول مہر (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) اس طرح لکھتے ہیں:

''یہ بھی صحیح ہے کہ میاں نذیر حسین مرحوم نے ایک زخمی انگریز عورت کو جو
بے بس پڑی تھی اٹھا کر اپنے یہاں علاج کرایا تھا۔ وہ تندرست ہوگئی اور
اسے اس کی خواہش کے مطابق دہلی کا محاصرہ کرنے والی انگریز فوج کے

کیمپ میں پہنچادیا تھا مگراس کا صلہ کچھ نہیں لیا تھا اور کہا تھا کہ۔یہ میرا اسلامی فرض تھا۔(ص:۲۳۶۔افادات مہر مطبوعہ لاہور)

واقعات وحقائق کے اندر تحریف اور آمیزش کا عمل اتنا قوی اور مسلسل تھا کہ کئی حضرات اس ''کارخیر'' میں شریک رہے اور اس کی تائید واتباع میں غلام رسول مہر صاحب سے پیچھے رہنا گوارہ نہ کرسکے۔اور صاف لکھ دیا کہ نصاریٰ کے خلاف جو الفاظ تھے وہاں ان کے اگلوں نے سکھ یا درازمو لکھ دیا ہے۔چنانچہ مولانا سید محمد میاں دیوبندی رقم طراز ہیں:

''اس کتاب کی تسوید کے بعد جناب مہر صاحب کی کتاب ''سید احمد شہید'' سامنے آئی۔اس میں موصوف نے بڑی وضاحت کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ ان عبارتوں میں تحریف کی گئی ہے۔نہ صرف عبارت بلکہ متعدد عبارتیں بھی پیش کی ہیں جن میں تحریف کی گئی ہے۔(حاشیہ ص:۲۴۹۔علمائے ہند کا شاندار ماضی۔جلد دوم مطبوعہ دہلی)

یہ الگ بات ہے کہ مہر صاحب کی یہ تحقیق محلِ نظر ہے۔یہی حال ان کی کئی دیگر تحقیقات کا بھی ہے جسے بعض علماو محققین نے موضوع بحث بنایا اور مہر صاحب کی ''تاریخ سازی'' پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

حاجی سید عابد حسین قادری چشتی (متوفی ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء) بانی مدرسہ دیوبند (قائم شدہ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء) معروف بہ دارالعلوم دیوبند کو مدرسہ سے بے اثر و بے دخل کیے جانے کے اسباب وعوامل کی نشان دہی کرتے ہوئے حاجی صاحب کے خانوادہ کے ایک فرد سید افتخار حسین لکھتے ہیں کہ:

''وہ نفسانیت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اس مدرسہ کے ذریعہ اسلام کی حقانیت وصداقت کی نشرواشاعت کا جو اہم فریضہ انجام دینا چاہتے تھے اس ادارہ کے دوسرے اراکین اس سے متفق نہیں تھے۔

ان حضرات کا نقطۂ نظر بالکل جداگانہ تھا۔وہ اس مدرسہ کو انگریزی حکومت کی رضا ومنشا کے مطابق چلانا چاہتے تھے۔کیوں کہ مدرسہ کے صدر مدرس مولوی یعقوب حکومتِ وقت کے زبردست بہی خواہ تھے۔مدرسہ کی صدر مدرسی قبول کرنے سے قبل وہ کئی شہروں میں انگریز گورنمنٹ میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول کے فرائض انجام دے کر اپنے حسنِ کارکردگی سے انگریزوں کی نظر میں محبوب بن

چکے تھے۔اپنے اس کامیاب تجربہ کی روشنی میں اس مدرسہ کو اسی روش پر لے جانا چاہتے تھے جو انگریز حکومت کے عین منشا کے مطابق تھا اس لئے ان کے خیالات کا حاجی محمد عابد کے خیالات سے متصادم ہونا ناگزیر تھا۔(ص ۶۱۔دارالعلوم دیوبند کا بانی کون؟ از سید افتخار حسین دیوبند)

لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ واودھ کے معتمد مسٹر پامر نے ۳۱؍جنوری ۱۸۷۵ء میں مدرسہ دیوبند کا دورہ کرکے معاینہ رپورٹ میں کہا— ''جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپے کے صرف سے ہوتا ہے وہ یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے۔جو کام پرنسپل ہزاروں روپے ماہانہ تنخواہ لے کر کرتا ہے وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپے ماہانہ پر کر رہا ہے۔یہ مدرسہ خلافِ سرکار نہیں بلکہ ممد ومعاونِ سرکار ہے۔(ص:۲۱۷۔سوانح محمد احسن نانوتوی مطبوعہ کراچی)

''تمام اندرونی وبیرونی صدمات اور حوادث کے بعد جو نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی کامیابی وشہرت مدرسہ کو حاصل ہوئی وہ سرجان ڈگس لاٹوش لفٹننٹ گورنر ممالکِ متحدہ آگرہ واودھ کا بغرضِ خاص معاینہ مدرسہ دیوبند آنا تھا''۔(ص:۷۔روئداد مدرسہ دیوبند ۱۳۲۲ھ)

''مدرسہ دیوبند کے کارکنوں اور مدرسوں کی اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور حال پینشنز تھے جن کے بارے میں گورنمنٹ کو شک وشبہ کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔(حاشیہ ص:۲۴۷۔سوانح قاسمی جلد دوم)

مولانا اشرف علی تھانوی (متوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) اپنے ایک فتویٰ محررہ ۱۰؍صفر ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء میں لکھتے ہیں:

''چوں کہ قدیم سے مذہب اور قانون جملہ مسیحی لوگوں کا یہ ہے کہ کسی کی ملت ومذہب سے پرخاش اور مخالفت نہیں کرتے اور نہ کسی کی مذہبی آزادی میں دست اندازی کرتے ہیں اور اپنی رعایا کو ہر طرح سے امن وامان میں رکھتے ہیں۔لہذا مسلمانوں کو یہاں ہندوستان میں جو مملوکہ ومقبوضۂ اہلِ مسیح ہے، رہنا اور ان کا رعیت بننا درست ہے۔(ص:۳۲۴۔اوراق گم گشتہ۔از رئیس احمد جعفری ندوی۔مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء)

فرضی تاریخ نویسی کا حال تو یہ ہے کہ ''تحریک ولی اللٰہی'' کے نام پر ایک ایسی مسلسل تاریخ

گڑھ لی گئی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً

(۱) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے سید احمد رائے بریلوی کو امیر خاں نواب ریاست ٹونک کے پاس بھیجا تھا۔

(۲) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی یا شاہ محمد اسحٰق دہلوی نے ایک بورڈ کی تشکیل کی جس کے فلاں فلاں حضرات ممبر منتخب کیے گئے تھے۔

(۳) انقلاب ۱۸۵۷ء درحقیقت معرکۂ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) کا نتیجہ تھا اور اس میں تحریک سید احمد رائے بریلوی کے مجاہدین نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔

(۴) شاملی (مظفر نگر) میں مولانا محمد قاسم نانوتوی و مولانا رشید احمد گنگوہی نے انگریزوں کے خلاف بڑی منصوبہ بندی و مہارت کے ساتھ زبردست جنگ کی اور یہ حضرات صفِ اول کے قائدینِ جنگ آزادی تھے۔

(۵) علمائے دیوبند انقلاب ۱۸۵۷ء میں نمایاں اور پیش پیش تھے۔

(۶) انگریزوں کے خلاف تربیت گاہ اور ایک فوجی چھاؤنی کے طور پر دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا تھا۔

جب کہ علمائے اہل حدیث و جماعت دیوبند ہی کی کتابوں سے زیرِ نظر کتاب میں پیش کردہ مواد اس فرضی و اختراعی تاریخ نویسی کی تردید کر رہے ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی (متوفی ۱۹۴۴ء) نے اپنی کتاب ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' میں جو ایک تصوراتی محل تعمیر کیا ہے اسے مولانا مسعود عالم ندوی ''حزب ولی اللہ کی تشکیل اور من مانی توجیہ'' قرار دیتے ہیں۔ (ص ۸۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک از مسعود عالم ندوی۔ مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی نئی دہلی ۲۵)

مولانا فیصل احمد ندوی بھٹکلی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اپنی ایک تازہ کتاب کے اندر اس سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

''مولانا عبیداللہ سندھی نے ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' میں شاہ اسحٰق کے قائم کردہ جس بورڈ کا ذکر کیا ہے نیز ترکی سلطنت کے اتصال کے بارے میں جو لکھا ہے وہ ان کی ''ذہانت کی پیداوار'' ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ معتبر ذرائع سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

بورڈ سے متعلق مولانا سندھی ہی کے متن کی مولانا سید محمد میاں نے ''علماے ہند کا شاندار ماضی'' میں تشریح کی ہے۔ یا بالفاظِ دیگر انھیں کی بنیاد پر عمارت کھڑی کی ہے۔

اسی طرح سلطنت عثمانیہ سے ربط اور حجاز میں بیٹھ کر شاہ صاحب (شاہ محمد اسحٰق دہلوی) کی اس سلسلہ کی کوششوں کو بھی تحریک آزادی پر لکھنے والے بعض مصنفین نے خوب پھیلا کر بیان کیا ہے۔ جیسے ضامن علی خاں نے اپنی کتاب ''جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین'' میں اور اسی طرح رتن لال بنسل نے اپنی کتاب ''جدوجہدِ آزادی اور تحریکِ ولی اللّٰہی'' میں کیا ہے۔ اور یاد پڑتا ہے کہ میوارام سواریہ نے بھی اپنی کتاب ''ہندوستان کی جنگ آزادی کے شہیدوں کی سچی کہانیاں'' میں بھی کچھ اس قسم کی تفصیل بیان کی ہے جیسے حقیقتِ حال کا بیان ہے۔

یہاں مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کے خط کا ایک اقتباس فائدہ سے خالی نہیں ہوگا۔ لکھتے ہیں:

دراصل یہ قصہ ہی سرے سے غلط ہے اور بے اصل ہے کہ ہندوستان کی آزادی اور انگریزوں کے خلاف عملی جدوجہد کے لئے حضرت شاہ عبدالعزیز یا حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب نے کوئی بورڈ بنایا ہو۔ اس کی اطلاع میری معلومات میں صداقت سے عاری ہے۔

یہ بات مولانا عبیداللہ سندھی کی کتاب ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' سے چلی ہے۔ مولانا نے اس کے لئے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ اور جو دیگر اطلاعات و مآخذ ہیں وہ اس کی کسی طرح بھی تائید نہیں کرتے۔

شاہ محمد اسحٰق اس قسم کا کوئی بورڈ یا مشاورتی انجمن بناتے تو اس کا کوئی اور بھی کہیں ذکر کرتا۔ کسی خط، تحریر، وعظ، تقریر میں اس کا ذکر آتا مگر کچھ بھی نہیں ہے۔

بہرحال! یہ روایت جہاں بھی ہے مولانا سندھی سے لی گئی ہے جو کسی طرح بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

میری زیرِ طبع کتابت ''تذکرہ مولانا مملوک العلی'' میں بھی اس پر بحث ہے۔ میں نے اس کو بالکل رد کیا ہے۔ (مکتوب مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی بنام مولانا فیصل احمد ندوی بھٹکلی) (حاشیہ ص ۲۷۶ و ۲۷۷۔ تحریک آزادی میں علما کا کردار۔ مؤلفہ فیصل احمد ندوی بھٹکلی۔ مجلس

(۲۰۰۶ء)
تحقیقات ونشریات اسلام۔ندوہ لکھنو۔طبع دوم رمضان ۱۴۲۷ھ/اکتوبر
"شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتویٰ کے تعلق سے بعض مضمون نگاروں نے بالکل بے سروپا
باتیں لکھی ہیں۔ان کی وضاحت یہاں ضروری معلوم ہوتی ہے۔مثلاً جناب ضیاءالدین صدیقی
(اورنگ آباد) لکھتے ہیں: ٹیپوسلطان نے ایک خط میں شاہ صاحب کے جہادی فتوے کا ذکر
کرتے ہوئے لکھا تھا کہ محض ایمان اور آزادی کے تحفظ کے لئے وہ انگریزوں سے لڑ رہا ہے۔
(ششماہی الحرکت نئی دہلی، جلد نمبر۱،شمارہ۲،رجب تا ذی الحجہ۱۴۱۸ مطابق نومبر ۱۹۹۷ء تا اپریل
۱۹۹۸ء۔صفحہ۷) جب کہ ٹیپوسلطان کی شہادت بالاتفاق مئی ۱۷۹۹ء میں ہوئی اور یہ فتویٰ مندرجہ
بالاصراحتوں کے مطابق ۱۸۰۳ء کے بعد کا ہے پھر ٹیپوسلطان کی اس سے واقفیت کیسی؟

ہم نے ضیاءالدین صاحب کوخط لکھ کر اس کا حوالہ طلب کیا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔دو تین
مہینے انتظار کیے بعد دوسرا خط لکھا پھر بھی خاموشی رہی۔اس پر میں نے وقفہ وقفہ سے مزید دو خطوط
دستی روانہ کیے اور بڑی لجاجت اور اصرار کے ساتھ ایک علمی ضرورت کے تحت اس کے حوالہ سے
مطلع کرنے کی درخواست کی مگر آج تک کوئی جواب نہ آیا۔ایک خط "الحرکہ" کے ایڈیٹر کے نام لکھ
کر وضاحت طلب کی لیکن اس طرف سے بھی مایوسی ہوئی۔

اس دوران میں نے ٹیپوسلطان پر علمی کام کرنے والوں میں ڈاکٹر بی یو علی شیخ صاحب،
جناب سید خورشید مصطفیٰ رضوی صاحب اور مولانا محمد الیاس ندوی صاحب سے رابطہ کیا۔نیز خانوادۂ
ولی اللہی پر تحقیقی نظر رکھنے والوں میں پروفیسر نثار احمد فاروقی اور مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی سے
بھی رجوع کیا، مگر سب نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ٹیپوسلطان کی شاہ عبدالعزیز صاحب سے
مراسلت یا ٹیپو کی شاہ صاحب کے فتویٰ سے واقفیت، کوئی بات تاریخ سے ثابت نہیں۔اگر اس بات
کا کوئی ثبوت ملے جو ضیاءالدین صاحب نے ذکر کی ہے تو یہ ایک بہت بڑی تاریخی حقیقت کا
انکشاف ہوگا اور ٹیپوسلطان نے تاریخ میں جو ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا ہے اس کا سہرا شاہ
عبدالعزیز صاحب کے سر بندھے گا۔مگر ثبوت سے پہلے کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔

میں اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ روزنامہ راشٹریہ سہارا لکھنؤ کے مؤرخہ ۲۰/اگست ۲۰۰۱ء کے
شمارہ میں عبدالصمد قاسمی پورنوی صاحب کے ایک مضمون "جنگ آزادی میں علما کا کردار" پر نظر
پڑی اس میں انھوں نے شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتویٰ دارالحرب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

کہ حضرت شاہ صاحب کے اس فتوے کی روشنی میں مسلمان مجاہدین کی ایک جماعت ٹیپوسلطان
کی قیادت میں انگریزوں سے مقابلے کے لئے نکل پڑی۔

اولاً: عبارت کا یہ اسلوب ہی محل نظر ہے۔کوئی ایسا شخص یہ جملہ نہیں لکھ سکتا جو سلطان
شہید کے کارناموں سے واقف ہو۔خیر! مجھے اس سے بحث نہیں۔ہمیں اس کا تاریخی پہلو دیکھنا
ہے۔جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ ٹیپو کے مجاہدانہ کارناموں کو شاہ صاحب کے فتویٰ دارالحرب
سے کوئی سروکار نہیں۔اس لئے کہ یہ فتویٰ ٹیپو کی شہادت کے بعد کا ہے۔یہ مضمون دیکھتے ہی
مجھے مضمون نگار کے پتہ کی تلاش ہوئی۔

خدا کا کرنا کہ اگلے ہی دن ۲۱/اگست ۲۰۰۱ء کو راشٹریہ سہارا میں ان کا ایک مراسلہ شائع ہوا جس
کے اخیر میں ان کا پورا پتہ درج تھا۔میں نے فوراً اس پتہ پر عبدالصمد صاحب کو خط لکھ کر ان سے اس کی
وضاحت چاہی۔جواب نہ آنے پر تقریباً دو مہینے کے بعد دوسرا خط لکھا مگر اب تک کوئی جواب نہ مل سکا۔

مذکورہ مضمون میں اگرچہ مضمون بہت مختصر تھا، اور بھی کئی باتیں تاریخی لحاظ سے سراسر غلط تھیں۔مثلاً
(۱) اس میں شاہ اسماعیل شہید کو شاہ عبدالقادر کا فرزند قرار دیا ہے۔جب کہ شاہ اسمٰعیل شہید
شاہ عبدالغنی کے فرزند اور شاہ عبدالقادر کے بھتیجے تھے۔(۲) سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کا ذکر
کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دونوں انگریزوں سے جہاد کرتے ہوئے بالاکوٹ کی پہاڑی پر شہید
کردیئے گئے۔ حالاں کہ معرکہ بالاکوٹ سکھوں کے ساتھ تھا نہ کہ انگریزوں کے ساتھ
(۳) مولانا ولایت علی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجاہدین کے تعاون سے ایک آزاد ملک کی
بنیاد ڈالی۔حکومت کے نظم ونسق کے لئے سید اکبر شاہ ستھانوی کو تخت حکومت پر بٹھایا۔اور مولانا
عنایت علی کا کو امیر مقرر کیا گیا۔جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سید اکبر علی شاہ کی بادشاہت سے مولانا
ولایت علی کوئی علاقہ نہیں۔یہ دوسرا واقعہ ہے۔تفصیل انشاءاللہ کسی موقعہ پر آئے گی۔

میں اتنا لکھ چکا تھا اور مزید تحقیق میں لگا ہوا تھا کہ اس غلطی کی بنیاد کیا ہے کہ ایک دن مولانا
ضیاءالرحمٰن فاروقی (پاکستان) کی ایک مطبوعہ تقریر بعنوان "علمائے دیوبند کون ہیں اور کیا ہیں؟ پر
نظر پڑی۔اس میں وہ شاہ عبدالعزیز کے متعلق ایک جگہ کہتے ہیں۔

۱۷۶۳ء میں اس بچہ نے دیکھا کہ انگریز کا بڑے بڑے علاقوں پر تسلط ہوگیا ہے۔۱۷۷۲ء
میں سب سے پہلے ہندوستان کی تاریخ میں جس شخص نے انگریز کے خلاف دشمنی کا بیج بویا وہ شاہ

حکومت انگریزی ذریت انگریزی قوم کے
عبدالعزیز تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے انگریزی
خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کیا۔
شاہ عبدالعزیز کے اس فتویٰ کے بعد ایک آدمی جس کا نام حیدر علی تھا۔ وہ حیدر علی انگریز کی فوج میں شامل تھا۔ اس حیدر علی کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس نے یہ سنا کہ علما نے انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کر دیا ہے۔ وہ بچہ رضا کاروں کو تربیت دینے لگا۔ اس نے اپنی قوم کو زنجیروں میں جکڑا ہوا پایا۔ اس نے اپنی قوم کو غلامی کی زنجیروں میں پایا۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے ساڑھے تین سو رضا کاروں کا ایک دستہ مقرر کیا جس نے اس نوجوان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس نوجوان کو قوم کیا کہتی ہے؟ تاریخ کی زبان اس نوجوان کو جو حیدر علی کا بیٹا تھا سلطان ٹیپو کہتی ہے۔ فتح علی سلطان ٹیپو نے ۱۷۷۲ء میں شاہ عبدالعزیز کے فتوی کی وجہ سے میدان جنگ قائم کیا۔

پھر ذرا آگے لوگوں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہتے ہیں۔

ٹیپو کے وہ خطوط اٹھا کر دیکھو جو انھوں نے سید احمد شہید کو لکھے۔ وہ کہتے ہیں کہ انگریز کو ختم کر کے برصغیر پر اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ (۱۳۔۱۴)

اس تقریر کو پڑھ کر میرے دل نے فیصلہ کیا کہ لغزش کا سرچشمہ یہی ہے اور اسی کو مبنی برحقیقت سمجھ کر نقل کرنے والوں سے نقل کیا ہے۔ مقرر آدمی کبھی جو زبان پر آئے، بلا تحقیق کہہ دیتا ہے، بعد میں سوچتا ہے۔

مجھے اس کی فروگزاشتوں پر تنبیہ کی یہاں چنداں ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ ان بے بنیاد باتوں کی تردید ہو چکی ہے۔ جس کی تاریخ پر نظر ہو وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس میں کیا کیا غلطیاں ہیں۔ البتہ صرف آخری فقرہ کے متعلق اتنا عرض ہے کہ ٹیپو کی شہادت کے وقت سید احمد شہید صرف بارہ برس کے لڑکے تھے اور تکیہ کلاں رائے بریلی میں محصور۔ دنیا سے ابھی ان کا سابقہ نہیں پڑا تھا پھر سلطان سے مراسلت کیسی؟

ان کے علاوہ بھی اس تقریر میں تاریخی اعتبار کئی جگہوں پر کھٹک محسوس ہوتی ہے اور بعض تو فاش غلطیاں ہیں جن کی تردید کا یہ موقع نہیں۔ خطیب مولانا ضیاء الدین فاروقی صاحب حیات ہوتے تو میں ان سے پوچھتا۔ اللہ ان سے درگذر فرمائے۔ (حاشیہ ص ۲۵۲ تا ۲۵۴۔ تحریک آزادی میں علما کا کردار۔ مؤلفہ فیصل ندوی۔ مطبوعہ ندوہ لکھنؤ)

علامہ فضل حق کی

سیاسی بصیرت اور جرأت واستقامت

امام الحکمۃ والکلام قائد جنگ آزادی علامہ فضل حق فاروقی خیرآبادی (متولد ۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء خیرآباد، اودھ۔ متوفی ۱۲/صفر ۱۲۷۸ھ/ ۲۰/اگست ۱۸۶۱ء۔ جزیرۂ انڈمان) فرزند علامہ فضل امام فاروقی خیرآبادی صدر الصدور دہلی (متوفی ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۹ء) کی ولادت خیرآباد (موجودہ ضلع سیتاپور، یوپی) میں اور نشو ونما و تعلیم وتربیت اپنے والد ماجد کے زیر سایہ دہلی میں ہوئی۔

بتیس (۳۲) واسطوں سے آپ کا سلسلۂ نسب خلیفۂ دوم سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے منسلک جاتا ہے۔ دو اصحاب علم بھائی حضرت بہاء الدین فاروقی مفتی بدایوں (موجودہ صوبہ یوپی) اور حضرت شمس الدین فاروقی قاضی رہتک (پنجاب۔ موجودہ ہریانہ) میں سے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کا خانوادہ شمس الدین فاروقی سے اور علامہ فضل امام خیرآبادی کا خانوادہ بہاء الدین فاروقی سے مل جاتا ہے۔ یہ دونوں بھائی شمس الدین و بہاء الدین کسی خطۂ ایران کے ایک حاکم شیر الملک بن عطاء الملک کے صاحبزادگان ہیں۔

ہرگام (سیتاپور، اودھ) سے قاضی محمد ارشد فاروقی خیرآباد منتقل ہوئے اور مستقل سکونت اختیار کی۔ ان کے آبا واجداد میں کئی ایک معروف علما وفضلا تھے جن کے روابط و تعلقات فرنگی محل لکھنؤ و گوپامئو (ہردوئی) ولاہرپور (سیتاپور) وغیرہ سے تھے۔ قاضی محمد ارشد علامہ فضل امام خیرآبادی کے والد ماجد ہیں۔

علامہ فضل حق خیرآبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) اپنے والد ماجد کے علاوہ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۵ء) و حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کے قابل فخر شاگرد تھے۔ حضرت مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی صدر الصدور دہلی (متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) آپ کے رفیقِ درس اور معتمد دوست تھے۔ اور یہ دونوں حضرات اپنے

اساتذہ اور اسلاف کے علوم و روایات کے حامل و امین اور بہترین وارث و جانشین ثابت ہوئے۔

بعمر تیرہ سال ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں علامہ فضل حق خیرآبادی نے علوم و فنونِ درسیہ کی تکمیل کی۔ ۱۸۱۵ء میں اس وقت کے رواج کے مطابق دہلی میں ایک سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوگئے۔ طبعی ناپسندیدگی کے باوجود مختلف جگہوں پر ملازمت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ مگر سرکاری حکام سے جھک کر اور دب کر بات کرنا آپ کے لئے ایک بڑا ہی دل آزار معاملہ تھا اس لئے ۱۸۳۰ء میں سرکاری ملازمت سے استعفادے دیا۔ پھر جھجھر، الور، رام پور، لکھنؤ وغیرہ میں نوابوں نے عزت افزائی و قدر دانی کے ساتھ اپنے یہاں رکھا۔ لکھنؤ میں ''حضور تحصیل'' کے مہتمم اور صدر الصدور تھے۔

مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی (متوفی ۱۹۶۸ء) لکھتے ہیں:

''مولانا (فضل حق) نے حکام کا طریقہ خلاف مرضی پایا۔ مستعفی ہوگئے۔ نواب فیض محمد خاں رئیس جھجھر (پنجاب) کو جو معلوم ہوا انھوں نے پانچ سو روپے ماہوار مصارف کے لئے پیش کیا اور قدر دانی کے ساتھ اپنے پاس بلایا۔ دہلی سے روانگی کے وقت ولی عہدِ سلطنت صاحب عالم مرزا ابوظفر (بہادر شاہ ظفر) نے اپنا ملبوس دوشالہ علامہ فضل حق کو اڑھایا اور بوقت رخصت آب دیدہ ہو کر کہا۔ چوں کہ آپ جانے کے لئے تیار ہیں میرے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ میں بھی اس کو منظور کرلوں۔ مگر خدا علیم ہے کہ لفظ وداع زبان پر لانا دشوار ہے۔ پنج آہنگ از مرزا غالب (ص ۴۹۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما از مفتی انتظام اللہ شہابی۔ مطبوعہ دینی بک ڈپو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶)

منقولات میں علامہ فضل حق خیرآبادی کا سلسلہ حضرت شاہ عبدالقادر و حضرت شاہ عبدالعزیز فرزندانِ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے واسطے سے حضرت امام محمد بن اسمٰعیل بخاری اور معقولات میں علامہ فضل امام کے واسطے سے میر فتح اللہ شیرازی تک پہنچتا ہے۔

اپنی ملازمتوں اور مصروفیتوں کے باوجود علامہ فضل حق نے درس و تدریس کا سلسلہ ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں برقرار رکھا اور کتب و رسائل بھی تحریر کیے۔ آپ کی کتاب ھدیہ سعیدیہ مدارس اسلامیہ کے نصاب میں داخل ہے۔ شرح سلم از قاضی مبارک آپ کی تحقیق و جودتِ فکر کا شاہکار ہے۔ متعدد کتب معقول کے علاوہ امتناع النظیر، تحقیق الفتویٰ، الثورۃ الھندیہ، قصائد فتنۃ الھند

آپ کی دینی و علمی یادگاریں ہیں۔

تلامذہ اور شاگردوں کی نامکمل اور دستیاب فہرست میں سے چند نمایاں نام درج ذیل ہیں:

مولانا عبدالحق خیرآبادی، مولانا ہدایت اللہ رام پوری ثم جون پوری، مولانا عبدالقادر عثمانی بدایونی، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، مولانا سلطان حسن بریلوی، مولانا ہدایت علی بریلوی، مولانا غلام قادر گوپامئوی، مولانا عبدالعلی رام پوری، مولانا عبداللہ بلگرامی، مولانا خیرالدین دہلوی، حکیم سید دائم علی ٹونکی، مولانا قلندر علی زبیری پانی پتی، مولانا حکیم سید احمد حسن امروہوی ثم اجمیری، مولانا محمد احسن گیلانی، مولانا نور احمد بدایونی، مولانا نورالحسن کاندھلوی، نواب یوسف علی خاں رام پوری، نواب کلب علی خاں رام پوری، مولانا عبدالحق کان پوری، مولانا عبدالعزیز سنبھلی، مولانا جمیل احمد بلگرامی، حکیم امام الدین دہلوی، مولانا نورالنبی رام پوری، مولانا محمد محسن ترہٹی۔

سرسید احمد خاں (متوفی مارچ ۱۸۹۸ء) نے علامہ فضل حق کے علم و فضل کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''زبانِ قلم نے ان کے کمالات پر نظر کے فخر خاندان لکھا ہے اور فکرِ دقیق نے جب سرکار کو دریافت کیا فخر جہاں پایا۔ جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں۔ اور منطق و حکمت کی تو گویا انھیں کی فکرِ عالی نے بناڈالی ہے۔ علمائے عصر بل فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہِ اہل کمال کے حضور میں بساطِ مناظرہ آراستہ کرسکیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو یگانۂ فن سمجھتے تھے جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا دعوائے کمال کو فراموش کر کے نسبتِ شاگردی کو اپنا فخر سمجھے۔ (ص ۵۶۲۔ آثار الصنادید۔ از سرسید احمد مطبوعہ اردو اکاڈمی دہلی۔ ۲۰۰۰ء)

عربی زبان میں آپ نے ہزاروں اشعار کہے ہیں جن کے مخطوطات مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہیں۔ اردو زبان کے ذوقِ شعر و ادب کا یہ عالم تھا کہ مرزا غالب کو آپ نے راہِ راست پہ لاکر اور ان کی شاعری کا معیار اور رُخ متعین کر کے اردو زبان پہ عظیم احسان فرمایا ہے۔ شیخ محمد اکرام (متولد ۱۹۰۸ء۔ متوفی جنوری ۱۹۷۳ء) اس سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

غالب کو بیدلؔ کی تقلید سے روکا اور اس کی ادبی تربیت کے لئے ایک استادِ کامل ہوئے جو

بقول میرتقی میر مرزا غالبؔ کی شاعری کی نشو ونما کے لئے ضروری تھا۔ (ص۸۲۔ غالب نامہ۔ از
شیخ محمد اکرام۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۳۶ء)

خواجہ الطاف حسین حالیؔ (متوفی ۱۹۱۴ء) لکھتے ہیں:

''مولوی فضل حق سے مرزا کی رسم وراہ جب بہت بڑھ گئی اور مرزا ان کو اپنا خالص ومخلص
دوست اور خیر خواہ سمجھنے لگے تو انھوں نے اس قسم کے اشعار پر روک ٹوک کرنا شروع کر دی۔
یہاں تک کہ انھیں کی تحریک سے انھوں نے اپنے اردو کلام میں سے جو اس وقت موجود تھا دو
ثلث کے قریب نکال دیا۔ اور اس کے بعد اس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔ (یادگار غالب از
خواجہ حالی، مطبوعہ دہلی)

محمد حسین آزادؔ (متولد ذوالحجہ ۱۲۴۵ھ/ جون ۱۸۳۰ء۔ متوفی جنوری ۱۹۱۰ء) انتخاب دیوان
غالبؔ کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں ان کا دیوان بڑا تھا۔ یہ منتخب ہے۔
مولوی فضل حق صاحب فاضل بے عدیل تھے۔ ایک زمانہ میں دہلی میں سررشتہ دار تھے۔ اس عہد
میں مرزا خانی کوتوال تھے وہ مرزا قتیلؔ کے شاگرد تھے۔ نظم ونثر فارسی اچھی لکھتے تھے۔ غرض یہ دونوں
باکمال مرزا کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسہ اور شعر وسخن کے چرچے رہتے تھے۔
انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام
لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا جو کچھ کر چکا اب کیا تدارک ہوسکتا ہے؟ انھوں نے کہا
خیر جو ہوا سو ہوا، انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کر دیا۔
دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔
وہ یہی دیوان ہے جو آج عینک کی طرح لوگ آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔ (ص۵۱۲۔
آب حیات از محمد حسین آزاد۔ مطبوعہ دہلی)

مولانا محمد یعقوب ضیا قادری بدایونی (متولد ۱۳۱۰ھ/ ۱۸۸۳ء در بدایوں۔ متوفی ۱۳۹۰ھ/
۱۹۷۰ء در کراچی) علامہ فضل حق خیرآبادی کے حالات اختصار کے ساتھ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

''علوم منطق وحکمت وفلسفہ وادب وکلام واصول وغیرہ میں جس طرف توجہ ہوگئی تلامذہ کو
یکتائے روزگار کر دیا۔ علوم باطن کے جذبات بھی خانۂ قلب کی نورانیت کے لئے باعثِ فروغ

تھے۔ حضرت شاہ دھومن صاحب چشتی دہلوی سے بیعت حاصل تھی۔ مناصب جلیلہ پر ریاست
لکھنؤ ورام پور الور میں مامور رہے مگر کبھی یک منزل قرآن شریف روزانہ ونماز تہجد ناغہ نہ ہوئی۔
آپ کے مناقب علمیہ ظاہری ستائش سے مستغنی ہیں۔ (ص۸۸۔ اکمل التاریخ (۱۳۴۳ھ)
مؤلفہ محمد یعقوب ضیا قادری بدایونی مطبع قادری مولوی محلہ، بدایوں۔ باراول)

حضرت سیف اللہ المسلول (علامہ فضل رسول بدایونی) سے آپ کو نہایت خلوص وعقیدت
تھی۔ ایک زمانہ میں بدایوں بھی تشریف لائے تھے۔ اکثر اوراد واشغال کی اجازتیں حاصل کی
تھیں، مدرسہ عالیہ قادریہ میں مقیم رہے تھے۔ (۸۹۔ اکمل التاریخ)

شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی کی تقویۃ الایمان اور نجد کی وہابی فکر سے متاثر جدید منحرفانہ خیالات کے
منظر عام پر آتے ہی علما ومشائخ اہل سنت نے ان کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار اور مسلسل
تعاقب شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء)
کے بھتیجے مولانا شاہ مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ نے "معید الایمان" اور
دوسرے بھتیجے مولانا شاہ محمد موسیٰ بن شاہ رفیع الدین نے "حجۃ العمل فی اِبطال الجھل"
لکھ کر اپنا فرض منصبی پورا کیا اور ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۴ء میں جامع مسجد دہلی کے اندر ہونے والے مباحثہ
میں ان دونوں حضرات کے علاوہ حضرت مولانا رشید الدین خاں دہلوی و حضرت مولانا
منور الدین دہلوی وغیرہ تلامذۂ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی و
مولوی عبدالحی بڈھانوی کے انحرافات کو طشت ازبام کر دیا۔

علامہ فضل حق خیرآبادی نے "تحقیق الفتویٰ فی اِبطال الطغویٰ" اور "امتناع
النظیر" لکھ کر تحریک وہابیت کے خلاف بند باندھا اور پوری علمی توانائی کے ساتھ اس کا ردِ بلیغ
کیا۔ حضرت مفتی صدر الدین آزردہؔ صدر الصدور دہلی نے بھی ''امتناع النظیر'' کے نام سے ایک
رسالہ لکھا۔ اسی طرح حضرت شاہ احمد سعید نقشبندی مجددی دہلوی، حضرت مولانا خیر الدین دہلوی،
حضرت مولانا فضل رسول بدایونی، حکیم صادق علی خاں دہلی (مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے حقیقی
دادا) مولانا سید اشرف علی گلشن آبادی، مولانا مخلص الرحمٰن چاٹگامی، مولانا قلندر علی زبیری پانی پتی
وغیرہم نے بھی بذریعہ تحریر وتقریر اس فکرِ جدید کی تردید واِبطال میں نمایاں حصہ لیا۔
مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) اس دور کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"شاہ عبدالعزیز کے بعد جب انھوں نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین لکھی اور ان کے اس مسلک کا ملک میں چرچا ہوا تو تمام علما میں ہلچل پڑ گئی۔ ان کے رد میں سب سے زیادہ سرگرمی بلکہ سربراہی مولانا منورالدین (شاگرد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی) نے دکھائی، متعدد کتابیں لکھیں۔ (چند جملوں کے بعد) ہر طرح سمجھایا لیکن جب ناکامی ہوئی تو بحث و رد میں سرگرم ہوئے اور جامع مسجد (دہلی) کا شہرۂ آفاق مناظرہ ترتیب دیا جس میں ایک طرف مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی (بڑھانوی) تھے اور دوسری طرف مولانا منورالدین اور تمام علمائے دہلی۔ (ص ۴۵۔ آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی۔ مکتبہ اشاعت القرآن دہلی۔ بار دوم، نومبر ۱۹۶۵ء)

حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) نبیرۂ حکیم سید برکات احمد ٹونکی لکھتے ہیں:

مولانا (فضل حق خیر آبادی) نے "سن ستاون" کی جنگِ آزادی میں جو حصہ لیا وہ کسی وقتی جوش اور جذبے کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ جنگِ آزادی برپا ہونے سے برسوں پہلے آپ عظیم فرنگی راج کے استیلاء و تسلط، فرنگی حکومت کی نااہلی اور ستم شعاری کی وجہ سے بددل، بیزار اور نفور تھے۔

مولانا نے اپنی عملی زندگی کا آغاز اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت ہی سے کیا مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملازمت ناپسند ہونے کے باوجود والد ماجد کے حکم اور خواہش کی ایک سعادت مندانہ تعمیل تھی۔ ملازمت کے تین چار سال بعد ہی ۱۸۱۸ء میں والد ماجد کے نام اپنے ایک مکتوب میں اس ملازمت سے بیزاری کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

"میں خدا کے فضل و کرم سے خوش حال اور مطمئن ہوں مگر ملازمت میں ذلت و خواری بہت ہے۔ حاکم کے سامنے مستقل حاضر رہنا پڑتا ہے اور اس کے وہ احکام اِملا کرنا ہوتے ہیں جو قابلِ قبول نہیں ہوتے۔ قسم خدا کی اگر مجھے رسوائی کی شرم نہ ہوتی تو کبھی کا کہیں اور منتقل ہو جاتا اور متوکلانہ زندگی بسر کرتا۔" (ترجمہ از عربی۔ ص ۲۸۔ بیاض، علامہ فضل حق خیر آبادی۔ مملوکہ حکیم محمد نصیرالدین ندوی، کراچی)

شاید والد ماجد کا اصرار ملازمت کے برقرار رکھنے کے سلسلے میں جاری رہا اور مولانا صبر و تحمل سے کام لیتے رہے مگر والد کی رحلت کے معاً بعد مولانا نے غلامی کا یہ لبادہ اتار پھینکا اور والیِ جھجر نواب فیض محمد خاں کی دعوت پر ریاست جھجر کا قیام منظور فرما لیا۔

مرزا غالبؔ نے "آئینۂ اسکندری" (کلکتہ) کے مدیر کے نام اپنے مراسلے (مورخہ ۳۱ر جنوری ۱۸۳۲ء، بحوالہ کلیات نثر غالب۔ ص ۱۴۸) میں اس واقعہ پر جن جذبات کا اظہار کیا ہے اگر مولانا سے مرزا غالبؔ کے مراسمِ اخوت و اتحاد کے پیشِ نظر ہم انھیں مولانا کے جذبات و تأثرات تصور کریں تو بے جا نہ ہوگا، خصوصاً اس لئے کہ فرنگی حکومت کے متعلق مرزا غالبؔ نے ایسے الفاظ کہیں اور استعمال نہیں کیے:

بے تمیزی و قدر ناشناسیِ حکام فرنگ آں ریخت کہ فاضل بے نظیر والمعیِ یگانہ مولوی حافظ فضل حق از سررشتہ داری عدالت دہلی استعفا کردہ خود راز ننگ و عار اور ہانند۔ حقا کہ از پایۂ علم و فضل و دانش و بنیش مولوی فضل حق آں مایہ بکاہند کہ از صد یک دا ماند باز۔ آں پایہ را بسررشتہ داری عدالت دیوانی سنجند ایں عہدہ دوں مرتبہ وے خواہد بود۔

حکامِ فرنگ کی بے تمیزی اور قدر ناشناسی نے یہ رنگ دکھایا کہ فاضل بے نظیر والمعیِ یگانہ مولوی حافظ محمد فضل حق نے عدالتِ دیوانی کی سررشتہ داری سے استعفا دے کر ننگ و عار سے نجات پائی۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر مولانا کے علم و فضل کے ایک فی صدی کا عدالتِ دیوانی کی سررشتہ داری سے موازنہ کریں تو اس عہدہ کا پلّہ ہلکا نکلے گا۔

مولانا نے اس قطع تعلق پر ہی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ انگریز حکام کے ظالمانہ احکام و اقدامات اور اس سے عوام کی تکالیف اور پریشانیوں کا بھی بہ تفصیل جائزہ لیتے رہے اور ان تکالیف کے ازالہ کے لئے جدوجہد بھی فرماتے رہے۔ مولانا کی ان سرگرمیوں کا پتہ ہمیں اس درخواست سے چلتا ہے کہ جو مولانا نے ۱۸۵۷ء سے کم از کم تیس سال پہلے اکبر شاہ ثانی (۱۸۳۷ء) کے نام رعایائے شہر کی طرف سے مرتب کی تھی۔ (ص ۲۱ تا ۲۴۔ فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء)

حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) علامہ فضل حق کی بصیرت و سیاست و قیادت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایڈمنسٹریشن کورٹ

جیسا کہ ہم پہلے تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں کہ مولانا نے حالات کی رو کو دیکھ کر اور غالباً

جمہوریت کے رواج کی (مجملاً ہی سہی)
دہلی میں رہنے کی وجہ سے یورپ میں ملوکیت کے بجائے
اِطلاعات سے متاثر ہوکر ملک کے نظامِ حکومت کے لئے ایک دستور ترتیب دیا تھا اور اس طرح
بے آئین شاہی اور مطلق العنان ملوکیت کو دستور کا پابند کر کے جمہوری طرز حکومت کی طرف اقدام
کیا تھا تا کہ شہریوں کو بھی حکومت میں شرکت کو موقع ملے اور صرف مسلمان ہی نہیں دوسری اقوام
بھی اس شرکت سے مطمئن ہوکر استخلاصِ وطن کی اس جدو جہد (غدر) میں کھلے دل سے حصہ لیں۔
۱۹ویں صدی کے عین وسط میں ہمارے ملک میں لال قلعہ کی دیواروں کے سائے میں بیٹھ
کر بہادر شاہ کی ناک کے نیچے آئینی حکومت کی بات کرنا، شاہ کو دستور کا پابند بنانا، عوام کو حکومت
میں شریک کرنے کے لئے آواز اٹھانا جس روشن خیالی، دور اندیشی، انقلاباتِ عالم سے باخبری
اور حسن تدبّر کا آئینہ ہے، اس کے پیش نظر یہ کہنا پڑتا ہے کہ:
مولانا فضل حق صرف ایک یگانۂ عصر مصنف و مدرس ہی نہیں تھے بلکہ وہ سیاستِ مدنیہ اور
تدبیر مملکت پر بھی اس درجے کا عبور رکھتے تھے جس طرح دوسری انواع حکمت پر۔ اور اس طرح
وہ تاریخ ملت میں نظام الملک طوسی اور شاہ ولی اللہ جیسے ماہرین سیاست و مدنیت کے ساتھ محسوب
علمائے دین میں سے تھے۔
اوران کا یہ "دستور العمل سلطنت"، "سیاست نامہ" اور "البدور البازغہ" کی سی اہمیت اور
قدر و قیمت کا حامل تھا۔

افسوس یہ ہے کہ ہم اس دستور العمل کے تحفظ سے قاصر رہے اور غدر کا ہنگامۂ عالم آشوب
دوسرے ہزاروں نوادر کی طرح اس کو بھی بہالے گیا۔ اس کی صرف ایک دفعہ (امتناع ذبیحۂ گاؤ)
اور ۹؍جولائی ۱۸۵۷ء کو اس کے نفاذ کا ذکر اوراقِ تاریخ میں محفوظ ہے۔ (یہ ایک عارضی اور ہنگامی
دفعہ تھی۔ مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے اس دستور اور اس کی اس دفعہ کا ذکر کیا ہے۔ اختر مصباحی)
اس دستور کی بنیاد پر جو ظاہر ہے اصولی اور اساسی احکام پر مشتمل ہوگا۔ ایک مجلس منتظمہ
(جلسۂ انتظام) تشکیل دی گئی اور
ڈاکٹر مہدی حسین نے بھی اپنی کتاب (Bahdaur Shah II and the War
of 1857 in Delhi) میں صفحہ نمبر ۱۸۲ کے بعد اس آئین کی نقل دی ہے اور اس آئین کا
انگریزی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے اور اس کو "جمہوریت اساس آئین" قرار دیا ہے اور لکھا ہے

کہ علامہ فضل حق نے یہ آئین بنایا۔
جب کہ اس آئین پر آئین ساز کا نام اور تاریخ درج نہیں، مگر شواہد یہ بتاتے ہیں کہ یہ آئین
اگست ۱۸۵۷ء کے آخری عشرہ کے آغاز میں بن گیا تھا۔ اور اسے علامہ فضل حق خیر آبادی نے ہی
وضع کیا تھا۔ اس لئے کہ اس مسودہ کا رسم الخط اور علامہ کا رسم الخط ایک ہے۔ اور یہ کہ علامہ فضل حق
خیر آبادی کی شہرت ایک ماہر قانون کے طور پر رہی ہے۔ اور یہ کہ وہ بتیس سال تک مختلف
ریاستوں کی عدالتوں میں اعلیٰ مناصب پر فائز رہے۔ (فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء۔ مؤلفہ
حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی)

مذہبی و علمی خدمات کے ساتھ علامہ فضل حق خیر آبادی ملکی وقومی امور و معاملات میں بھی
بصیرت و ژرف نگاہی کے حامل ایک عظیم قائد و رہنما تھے جس کے یہ چار نمونے تاریخ ہند نے
اپنے سینے میں محفوظ کر لیے ہیں۔

(۱) باشندگان دہلی کی نمائندگی کرتے ہوئے علامہ نے تقریباً ۱۸۲۶ء میں بادشاہِ دہلی
اکبر شاہ ثانی (متوفی ۱۸۳۷ء) کے دربار میں ایک یادداشت (میمورنڈم) پیش کی۔ یہ درخواست
بزبان فارسی ہے جو نوائے ادب بمبئی جلد ۱۳۔ شمارہ ۳۔ جولائی ۱۹۶۲ء میں پروفیسر نثار احمد فاروقی
کی تحقیق کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ اصل یادداشت بزبانِ فارسی اس کتاب کے آخر میں ملاحظہ
فرمائیں۔ خلاصۂ درخواست درج ذیل ہے۔

"یہاں کے باشندے ہندو ہوں یا مسلمان، ملازمت، تجارت، زراعت، حرفت،
زمینداری اور دریوزہ گری پر معاش رکھتے ہیں۔ انگریزوں کی حکومت کے قیام سے معاش کے یہ
تمام وسائل مسدود و مفقود ہو گئے ہیں۔ ملازمت کے دروازے شہریوں پر بند ہیں۔ تجارت پر
انگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ کپڑا، سوت، ظروف اور گھوڑے وغیرہ تک وہ فرنگ سے لے کر خود
فروخت کر کے نفع کماتے ہیں۔ معافی داروں کی معافیاں ضبط کر لی گئی ہیں۔ کسانوں کو محاصل کی
کثرت نے بدحال کر دیا ہے۔

ان چاروں طبقوں کی زبوں حالت کے نتیجے میں اہل حرفہ اور ان سب کے نتیجے میں دریوزہ
گرتنگیِ معاش کے شکار ہیں۔
دہلی میں ہوڈل وپلول وغیرہ بہت سے پرگنے جاگیر میں شامل تھے اور جاگیر داروں کے

یہاں ہزاروں آدمی، فوج، انتظامی امور، اور شاگرد پیشہ کی خدمت پر مامور تھے۔ اب یہ پرگنے اور دیہات و مواضعات انگریزوں نے ضبط کر لیے ہیں اور لاکھوں کسان بے روزگار ہو گئے ہیں۔ بیواؤں کی معاش چرخہ کاتنے، رسیاں بٹنے اور چکی پینے پر موقوف تھی، اب رسّی کی تجارت حکومت (کمپنی) نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور ہاتھ کی چکی کی جگہ پن چکیاں لگ گئی ہیں تو یہ ذریعۂ معاش بھی جاتا رہا۔

عوام کی اس بے بضاعتی اور بے روزگاری کی وجہ سے اہل حرفہ اور ساہوکار بے روزگار اور رزق سے محروم ہو گئے ہیں۔ الخ (ص ۲۵۔ فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء۔ مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۷۵ء)

اس یادداشت کے مضمرات پر تبصرہ کرتے ہوئے حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) لکھتے ہیں:

"ان حالات میں برصغیر کا ایک عالم دین جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ سیاست نہیں جانتا، عوام کو دوبارہ لال قلعہ کے پھاٹک کی طرف لیے جا رہا ہے اور ان کی طرف سے یہ درخواست لکھ کر اور ان کے حالات و خیالات کا ترجمان بن کر ان کو "حضور جہاں پناہ" کے دیوانِ عام میں لا کھڑا کر دیتا ہے۔

اور اس طرح ایک پیچیدہ نفسیاتی تحریک چلاتا ہے جس سے

ایک طرف عوام کو دوبارہ اپنے جانے پہچانے مرکزِ حکومت سے گرہ کشائی اور حلِ مشکلات کی توقعات پیدا ہوں گی۔

دوسری طرف خود ان "جہاں پناہ" کی خودی کے بیدار ہونے کے امکانات ابھریں گے اور ان کی غیرت و حمیت بھی ممکن ہے انگڑائی لے کر جاگ اٹھے۔

تیسری طرف برطانوی حکومت کے کارکن چونکیں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ سمتِ قبلہ پھر تبدیل ہو رہی ہے؟

اور وہ چونک کر ایک طرف تو ان مشکلات پر توجہ دیں گے۔ دوسری طرف شاہ کے ساتھ اپنے رویہ میں نرمی اختیار کریں گے اور ان گستاخیوں اور اہانت کوشیوں کو لگام دیں گے جن کا سلسلہ انھوں نے کئی سال سے شروع کر رکھا تھا۔ (ص ۲۷۔ فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء۔ مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی، مطبوعہ کراچی ۱۹۷۵ء)

(۲) ملک کے اندر امن و امان، نظم و ضبط، ترقی و خوشحالی کے لئے دستور و عدالت کا قیام ناگزیر ہوتا ہے۔ دستور مملکت کا نفاذ کورٹ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کورٹ اور اس کے ارکان کے تعلق سے علامہ فضل حق خیرآبادی نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے وقت ایک تحریری خاکہ بنا لیا تھا۔ علامہ نے دستور مملکت اور دستور عدالت دونوں بنایا تھا۔ دستور مملکت بنانے کا تاریخ میں ذکر ہے مگر اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ البتہ دستورِ عدالت کی دفعات ملتی ہیں۔

انگریز مخبر تراب علی نے یکم ستمبر ۱۸۵۷ء کو "دہلی کی خفیہ خبریں" کے عنوان سے انگریز حکام کو جو خبریں بھیجی تھیں اس میں کورٹ کی تشکیل کی خبر و تعدادِ ارکانِ کورٹ وغیرہ کی فہرست کے ساتھ آخر میں درج ہے کہ:

"مولوی فضل حق بھی اس کے ایک رکن ہیں۔ (میوٹنی ریکارڈ۔ جلد ۱۱۔ حصہ ۱۱ ۸/۹۔ و سکریٹ لیٹرس نمبر ۱۱۹۔ مورخہ ۷/دسمبر ۱۸۵۷ء)

منشی ذکاء اللہ دہلوی نے علامہ فضل حق کے مرتبہ دستور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"مولوی صاحب عالم متبحر مشہور تھے۔ وہ الور سے ترکِ ملازمت کر کے دہلی آئے تھے۔ انھوں نے بادشاہ کے لئے ایک دستور العمل سلطنت لکھا تھا۔ (ص ۶۸۷۔ تاریخ عروجِ سلطنت انگلشیہ۔ مطبوعہ دہلی)

حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) نبیرۂ حکیم سید برکات احمد ٹونکی لکھتے ہین:

"اس دستور کی بنیاد پر جو ظاہر ہے کہ اصولی اور اسلامی احکام پر مشتمل ہوگا، ایک مجلس منتظمہ (جلسۂ عام) تشکیل دی گئی اور بقول مہدی حسین (ص ۱۸۲۔ بہادر شاہ دوم) اس کا ڈائرکٹر (نگراں) مولانا کو بنایا گیا۔ اس مجلس انتظامیہ کے قواعد و ضوابط (بائی لاز) کا مسودہ اتفاق سے محفوظ رہ گیا ہے۔ بھارت کے نیشنل آرکائیوز دہلی میں وہ مسودہ محفوظ ہے۔

(For POL. CONS. N.A. Box 57-No. 539-541)

اور اس کا عکس ہمارے پیش نظر ہے۔ یہ تحریر اردو میں ہے اور اس نقطۂ نظر سے بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہے کہ اس نوع کے اجتماعی اور دستوری مسائل پر یہ غالباً پہلی اردو تحریر ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے سیاسی مسائل اور انجمنوں و اداروں کے سلسلے میں اردو اصطلاحات میں عہد بہ عہد

فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء از حکیم محمود احمد

تغیرات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔(ص ۵۳ و ۵۴۔

برکاتی ٹونکی)

آج کل کی اصطلاح میں اسے آپ کابینہ کہہ سکتے ہیں کہ ملک کا جو دستور مرتب کیا گیا تھا

اس دستور کی روشنی میں جو کابینہ تشکیل پائی تھی یہ اس کے بائی لاز ہیں کہ یہ کابینہ کس طرح فیصلے

کرے اور اس کی ہیئت کیا ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔اس کتاب کے آخر میں یہ دستور ملاحظہ فرمائیں۔

اس دستور کی خوبی وانفرادیت کے بارے میں سلمٰی سیہول نے یہ بڑا جامع تبصرہ و تجزیہ

پیش کیا ہے:

آئین کی خصوصیات:

۱۔ یہ دستور اردو زبان میں لکھا جانے والا پہلا دستور ہے۔

۲۔ اس دستور کی اپنی مخصوص اصطلاحات ہیں جو اردو کے زیادہ قریب ہیں۔جیسے ''کابینہ'' کو ''کورٹ'' اور ''جلسہ''۔ ''ووٹ''، کو ''رائے''، ''پریذیڈنٹ'' کو ''صدر جلسہ''۔ ''وائس پریذیڈنٹ'' کو ''نائب صدر جلسہ''۔ ''میٹنگ'' کو ''جلسہ''۔ ''ڈیپارٹمنٹ'' اور ''نظام'' کو ''سررشتہ''۔اور ''سکریٹری'' کو سکتر وسکرٹر لکھا گیا ہے۔

۳۔ یہ ایک مکمل دستور ہے۔

۴۔ یہ مختصر ترین دستور ہے۔

۵۔ یہ جمہوری دستور ہے۔اس کے تمام تر طریق کار میں جمہوریت کے اصول مدنظر رکھے گئے ہیں۔

۶۔ اس دستور میں فوج اور سول ہر دو شعبوں کو نمائندگی دی گئی ہے۔

۷۔ اس دستور کے قواعد کی روشنی میں بنائی جانے والی کابینہ کے ارکان کی اہلیت، طریق انتخاب وموقوفی اور حلف وغیرہ کی بھی وضاحت ہے۔

۸۔ یہ کابینہ صدر مملکت (بہادر شاہ ظفر) کے ماتحت رہے گی۔

۹۔ کابینہ کے ہر رکن کے ذمہ ایک مستقل محکمہ ہے۔جس کا انتظام وانصرام اسے چار یا حسب ضرورت سیکرٹریوں پر مشتمل کمیٹی کی مدد سے کرنا ہے۔

۱۰۔ سیکرٹریوں کی اہلیت کی شرائط اور طریق انتخاب وغیرہ ممبران کمیٹی والا ہی ہوگا۔

۱۱۔ اس دستور میں ضرورت ومصلحت کے مطابق اصلاح اور ترمیم کی بھی اجازت وگنجائش ہے۔

۱۲۔ یہ دستور ہنگامی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ معمول کے حالات کے لئے بھی کار آمد ہے۔(ص ۳۲۷ و ۳۲۸۔مولانا فضل حق خیرآبادی۔مؤلفہ سلمٰی سیہول)

ہندو مؤرخ پی سی جوشی قدیم تاریخی کتب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جنرل بخت خاں کے پہنچنے کے بعد دہلی کے باغیوں نے ایک پروانہ جاری کیا جس میں نئی حکومت کی ترکیب کا خاکہ دیا گیا تھا۔بہادر شاہ کے شہنشاہ ہونے کا دوبارہ رسمی طور پر اعلان کیا گیا لیکن اصل قوتِ عاملہ مجلس انتظامیہ کو سونپی گئی۔مجلس کا کام حکومت کا انتظام کرنا، امن وامان قائم کرنا، تحصیلوں سے لگانِ آراضی وصول کرنا، مہاجنوں سے قرضے لینا، سلطنت کی حفاظت کرنا اور جنگ کا اہتمام کرنا تھا۔

......مجلس انتظامیہ دس اراکین پر مشتمل ہوتی تھی۔چھ فوج سے اور چار دیوانی محکموں سے۔فوج کی نمائندگی کو تین شعبوں یعنی پیادہ، رسالہ اور توپ خانہ میں یکساں تقسیم کیا گیا۔......مجلس کے دس اراکین میں سے ایک کو بطور صدر جلسہ اور دوسرے کو نائب صدر جلسہ کثرتِ رائے سے چنا جاتا تھا۔مجلس کے صدر کو دو رائے دینے کا اختیار تھا۔وغیر وغیرہ (ص ۴۴ و ۴۵۔انقلابِ ۱۸۵۷ء مؤلفہ پی سی جوشی)

کئی صفحات میں پی سی جوشی نے دستور کی دفعات اور کارروائیوں وکارگذاریوں کا جائزہ لیا ہے جو قابل مطالعہ ہے اور مؤرخین کو چاہیے کہ علامہ فضل حق خیرآبادی کے بنائے ہوئے دستور کا وضاحت وتحقیق کے ساتھ منصفانہ ومؤرخانہ تجزیہ کریں۔

اس کے ساتھ ہی علامہ فضل حق خیرآبادی اس سہ نفری کنگ کونسل کے بھی ممبر تھے جسے بہادر شاہ ظفر نے ۱۸۵۷ء میں بنایا تھا۔اس کنگ کونسل کو پریوی کونسل بھی کہا گیا ہے۔اس کے دوسرے ممبر جنرل بخت خاں روہیلہ تھے۔یہ بیان ۱۸۵۷ء کے کوتوال شہر دہلی سید مبارک شاہ رام پوری کا ہے۔(The Great Revolation of 1857- P.128-183 مطبوعہ پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۸ء) دی گریٹ ریوولیشن آف ۱۸۵۷ء مرتبہ سید معین الحق کراچی)

(۳) ۱۸۵۹ء میں جب علامہ فضل حق کو گرفتار کر کے لکھنؤ میں آپ کے خلاف مقدمہ چلایا

گیا اس وقت مختلف الزامات کے ساتھ آپ کے خلاف ایک الزام یہ بھی تھا کہ انگریزوں کے خلاف آپ نے جہاد کا فتویٰ دیا۔

یہ الزام صحیح بھی تھا۔ چنانچہ منشی ذکاء اللہ دہلوی نے لکھا ہے کہ:

علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے مشورہ کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا بعد نماز جمعہ جامع مسجد (دہلی) میں علما کے سامنے تقریر کی۔ استفتا پیش کیا۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی، سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کیے۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہوگئی۔ (تاریخ ذکاء اللہ بحوالہ ص ۲۱۵۔ باغی ہندوستان از عبدالشاہد شیروانی طبع اول ۱۹۴۷ء۔ بجنور۔ طبع چہارم ۱۹۸۵ء مبارک پور اعظم گڑھ)

۱۸۵۷ء ہی میں ایک سرکاری مخبر چنی لال لکھتا ہے کہ:

مولوی فضل حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں۔ (ص ۲۷۳۔ فائل ۱۲۷۔ اخبار دہلی، رپورٹ از چنی لال)

بہادر شاہ ظفر کا معتمد مشیر حکیم احسن اللہ خاں اپنی یادداشت میں لکھتا ہے:

''مولوی (فضل حق) صاحب جب بھی بادشاہ کے پاس آتے بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جہاد کی مہم میں اپنی رعایا کی ہمت افزائی کریں اور ان کے ساتھ میدان میں بھی نکلیں۔ فوجی دستوں کو جس حد تک ممکن ہو بہتر معاوضہ دیں۔ ورنہ انگریز جیت گئے تو نہ صرف آل تیمور بلکہ تمام مسلمان نیست و نابود ہو جائیں گے۔

(Memoires of Hakeem Ahsanullah Khan, P:24. Paskistan Historical Society Karachi-1958)

غلام رسول مہر (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) اس فتوائے جہاد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا (فضل حق) کے دہلی پہنچنے سے پیشتر بھی لوگوں نے جہاد کا پرچم بلند کر رکھا تھا۔ مولانا پہنچے تو مسلمانوں کو جنگ آزادی پر آمادہ کرنے کی غرض سے باقاعدہ ایک فتویٰ مرتب ہوا جس پر علمائے دہلی کے دستخط لیے

گئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضل حق ہی کے مشورے سے تیار ہوا تھا اور انھوں نے ہی علما کے نام تجویز کیے تھے جن کے دستخط لیے گئے۔

(ص ۲۰۶۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد۔ از غلام رسول مہر۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ ۱۹۷۱ء)

مقدمہ لکھنؤ ۱۸۵۹ء میں علامہ فضل حق خیرآبادی نے اپنے مقدمہ کی خود وکالت کی اور سارے الزامات مسترد کرتے ہوئے فتوائے جہاد کا اعلانیہ اعتراف و اقرار کیا اور کورٹ کے جج کے سامنے برملا اعلان کیا کہ:

ہاں وہ فتویٰ صحیح ہے۔ وہ میرا ہی لکھا ہوا ہے اور آج بھی میں اپنے اس فتویٰ پر قائم ہوں۔

کورٹ میں فتویٰ کے اعتراف کا ذکر، مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، سید خورشید مصطفیٰ رضوی وغیرہ نے اپنی متعدد کتب و رسائل میں کیا ہے۔

غیر متعلق باتوں سے علامہ فضل حق خیرآبادی نے اظہار برأت کیا کہ مخبر نے کسی غلط فہمی کی وجہ سے یا سازشی طور پر ایسی باتوں کا مجھے مُجرم گردانا جن کا میں نے ارتکاب ہی نہیں کیا ہے۔ ہاں! فتویٰ کا جہاں تک تعلق ہے وہ فتویٰ صحیح ہے اور میں اس فتویٰ پر آج بھی قائم ہوں۔

مقدمہ میں علامہ پر الزامات کی فہرست میں ایک الزام یہ تھا کہ ملزم بوندی میں باغی سردار نواب علی احمد خاں عرف ممو خاں کا مشیر و دستِ راست تھا جب کہ یہ الزام بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ اسی طرح ایک الزام یہ تھا کہ ملزم نے نظامت پیلی بھیت اور ریاستِ محمدی کی چکلہ داری (نیابت ناظم ریاست) کی۔ حالاں کہ یہ بھی الزام غلط ہے اور سید فضل حق شاہجہاں پوری تحصیل دار آنولہ (بریلی) سے اس کا تعلق ہے۔ ایک الزام یہ تھا کہ ملزم فیروز شاہ کے ساتھ جمنا کی طرف فرار ہوگیا۔ یہ الزام بھی بالکل بے بنیاد ہے۔ فیروز شاہ یا خان بہادر خاں روہیلہ کے ساتھ مل کر علامہ فضل حق نے نہ کوئی انقلابی کارروائی کی اور نہ ہی ان کے ساتھ کسی جنگ میں شریک ہوئے۔

جس بات کا علامہ سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا اسے وہ کورٹ میں کیوں قبول کرتے؟ انھوں نے اپنے مقدمہ کی پیروی کرتے ہوئے ان سارے الزامات کی دھجیاں بکھیر دیں۔ یہاں اس کا بھی خیال رہے کر یہ ایک قانونی جنگ تھی اور کورٹ میں یہ مقدمہ زیر سماعت تھا۔ ایسے موقعہ پر خاص طور سے بہت سنبھل کر اور نپی تلی بات کہی جاتی ہے جس کے نمونے علامہ فضل حق کے اس

بیان کے ہر جملے میں ملتے ہیں جوانھوں نے کورٹ میں دیا ہے۔ بیان و دیگر تفصیلات مقدمہ کے لئے مطالعہ کیجیے باغی ہندوستان مؤلفہ عبدالشاہد شیروانی مطبوعہ مبارک پور اعظم گڑھ۔ ۱۹۸۵ء۔ اور راقم سطور کی کتاب ''قائد جنگ آزادی علامہ فضل حق خیرآبادی مطبوعہ دارالقلم دہلی ۲۰۰۷ء۔ نیز ''علامہ محمد فضل حق خیرآبادی'' مؤلفہ سلمٰی سیہول مطبوعہ لاہور۔ ۲۰۰۱ء)

اس آخرالذکر کتاب میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ:

الغرض یہ تمام دلائل اس حقیقت کا اثبات واعلان ہیں کہ فرد جرم میں علامہ پر لگائے جانے والے الزامات غلط ہیں۔ اور علامہ کا اس فرد جرم سے انکار اور اس کی بنا پر سنائی جانے والی سزا کے خلاف دوبارہ اپیل کرنا، رہائی ونجات کی آس لگائے رکھنا، خود کو مظلوم ومبتلائے آزمائش گرداننا اور رب تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض والتجا کرنا، نہ صرف درست تھا بلکہ انگریز کے ظلم و بربریت اور جھوٹ ومکر کے خلاف آخر وقت تک لڑنا اس کے غاصب ومکار ہونے پر مہر ثبت کرنا تھا۔ (ص ۳۵۲۔ علامہ محمد فضل حق خیرآبادی۔ مؤلفہ سلمہ سیہول مطبوعہ لاہور۔ ۲۰۰۱ء)

بایں ہمہ وجوہ علامہ کا خود کو مجرم نہ ماننا، فرد جرم کے مندرجات سے انکار کرنا، صرف مئی ۱۸۵۸ء میں بمقام بونڈی مموخاں کے مشیر ہونے کی حیثیت سے لگائے جانے والے الزامات سے انکار تھا نہ کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں اپنے حصے سے۔

اس لئے کہ جہاد آزادی کے مرکز پر اپنی آمد اور موجودگی کا اعتراف وذکر تو علامہ نے اپنے بیان میں خود کیا تھا مگر یوں کہ وہ حقیقت پر بھی مبنی تھا اور گرفت کا باعث بھی نہ بن سکا۔ اس لئے کہ وہ ایک ماہر قانون داں علامہ فضل حق خیرآبادی کا بیان تھا۔ (ص ۳۵۶۔ علامہ فضل حق خیرآبادی مؤلفہ سلمہ سیہول)

علامہ پر چلائے گئے مقدمہ کی دفعات اور ان کے خلاف لگائے الزامات کی حقیقت واضح و آشکارا ہو چکی ہے۔ اب ان پر بحث وتدقیق کچھ زیادہ سودمند نہیں خصوصاً ایسی صورت میں کہ سرکاری ریکارڈ سے مسل کے چند صفحات غائب ہیں۔

اس سے کہیں زیادہ مفید اور بہتر بات یہ ہے کہ علامہ کے رسالہ الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان) اور قصائد فتنۃ الہند کا تجزیہ کرکے علامہ کے اپنے تحریری بیان کی روشنی میں آپ کے ساتھ پیش آئے ہوئے حالات وواقعات بلکہ آپ کے خیالات وافکار کا بھرپور تجزیہ کیا

جائے۔ ورنہ مقدمہ قائم کرنا جھوٹے الزام عائد کرنا زبردستی قبول الزام پر مجبور کرنا انگریزوں کے شب وروز کا کھیل تماشہ تھا۔ اور وہ جسے سزا دینا چاہتے تھے اسے یوں ہی سزا دے دیتے تھے کسی مقدمہ کی انھیں کیا ضرورت تھی؟ وہ بھی ۱۸۵۷ء اور اس کے دو ایک سال بعد کے عرصے میں؟ مقدمہ تو بس یوں ہی ایک نمائشی کارروائی اور خانہ پُری کا عمل ہوا کرتا تھا۔ حکم حاکم اور ظلم ظالم کے سامنے کسی مغلوب ومفتوح قوم وفرد کی داد وفریاد سننے کا انگریزوں کے یہاں آج بھی کوئی خانہ نہیں تو ۱۸۵۷ء میں کیا ہوتا؟ اگر کچھ فرق ہے تو صرف اتنا کہ کل جو کام لندن سے ہوتا تھا وہ آج کل واشنگٹن سے ہو رہا ہے۔ اور نیت وذہنیت دونوں کی کم از کم مسلمانوں کے تعلق سے ایک جیسی ہے کہ ع جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء میں علامہ فضل حق خیرآبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) کی قیادت و شرکت کے مستند تاریخی حوالے دیتے ہوئے حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) نبیرۂ حکیم سید برکات احمد ٹونکی (متوفی ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء) رقم طراز ہیں:

''عدالت کے اس فیصلے کے علاوہ ہم مولانا کی شرکت کے ثبوت میں پانچ معاصرین کی شہادت پیش کرتے ہیں:

(۱) جیون لال کا گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے جو ۱۶/اگست ۲/۶/۷/ستمبر کو لال قلعہ میں مولانا کو موجود پاتا ہے۔ ایک دن مولانا نے بادشاہ کو یوپی میں مجاہدین کی سرگرمیوں کے متعلق اطلاع فراہم کی۔ ایک دن بادشاہ کے دربار میں تمام امرا اور رؤسا کے ساتھ مولانا بھی شریک ہوئے۔

(۲) ایک دوسرا معاصر عبداللطیف ۱۹/اگست ۱۸۵۷ء کے روزنامچے میں لکھتا ہے:

''جب ہنگامہ برپا ہوا تو مولوی فضل حق آئے۔ دربار میں حاضر ہوئے،
نذر پیش کی، روپیہ صدقے اتارا۔ انھیں انتظام سنبھالنے کی خواہش تھی۔''
(سن ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ مرتبہ خلیق احمد نظامی۔ مطبوعہ دہلی)

(۳) دورانِ غدر میں دہلی کے کوتوال سید مبارک شاہ کا بیان ہے کہ بخت خان، مولوی سرفراز علی اور مولانا فضل حق پر مشتمل ایک کنگ کونسل تشکیل دی گئی۔ (انڈیا آفس منو اسکرپٹس آف آرایم ایڈ ایڈورڈس، ٹرانسلیشن آف سید مبارک شاہز نیریٹیو آف سیز آف دی دہلی۔ بحوالہ دی گریٹ ریولیشن آف ۱۸۵۷ء۔ از ڈاکٹر سید معین الحق۔ ص ۱۸۲۔ کراچی ۱۹۶۸ء)

قاضی فیض اللہ کوتوال شہر کے مستعفی ہونے کے بعد سید مبارک شاہ رام پوری کوتوال شہر مقرر

عروجِ سلطنتِ انگلشیہ۔ص۶۸۸۔

کیا گیا اور آخر غدر تک وہی رہا۔

(۴) انگریزوں کا ایک مخبر تراب علی یکم ستمبر ۱۸۵۷ء کے خفیہ خبرنامے میں برطانوی حکام کو مطلع کرتا ہے کہ باغیوں نے ایک انتظامی مجلس تشکیل دی ہے جس کا نام انھوں نے کوٹ (Kote) (کذا) رکھا ہے۔ اس کے ارکان میں جنرل غوث محمد خاں، بریگیڈیر ہیرا سنگھ، جنرل بخت خاں، محمد شفیع رسالدار، حیات محمد رسالدار، قادر بخش صوبے دار سفر مینا، نھو صوبیدار، ہر دت صوبے دار وغیرہ کے علاوہ ہر رجمنٹ کے ۵، ۵ سپاہی بھی شامل ہیں اور

"Molvi Fazlhaq is also a Member"

(مولوی فضل حق بھی اس کورٹ کے ایک رکن ہیں)

موٹنی ریکارڈ کراس پنڈنٹس لاہور۔ ۱۹۱۱ء۔ ص۹۔ مراسلہ ۲۷۹۔ از جی۔ سی۔ بارنس کمشنر کلکٹر سیشن ستلج بنام سکریٹری چیف کمشنر پنجاب مورخہ ۳ر ستمبر ۱۸۵۷ء۔

(۵) ایک اور نامور معاصر حکیم احسن اللہ خاں اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

"دوسرے روز مولوی فضل حق آئے اور نذر پیش کی۔ وہ باغی فوج کی بڑے زور شور سے تعریف کر رہے تھے۔ انھوں نے بادشاہ سے کہا اب وقت کا تقاضہ ہے کہ مجاہدین کو رقم اور سامانِ رسد کی مدد پہنچائی جائے، تاکہ انھیں کچھ سہارا ہو۔ بادشاہ نے کہا رقم کہاں ہے؟ رہا رسد کا تو وہ پہنچی تھی مگر ناکافی تھی اور اس کی وجہ ان باغیوں کا عوام کے ساتھ غلط رویہ ہے۔

مولوی صاحب نے کہا:

حضور کے تمام ملازمین نااہل ہیں۔ دور اور قریب کے تمام حکمرانوں سے رقم کا مطالبہ کرنے کی اجازت دیجیے اور کسی ہوشیار آدمی کو رسد کی فراہمی پر مامور کرنے دیجیے۔ میرے لڑکے (مولانا عبدالحق) اور دیگر اعزہ تحصیل کا کام انجام دیں گے اور رسد بھی فراہم کریں گے۔

بادشاہ نے جواب دیا:

آپ تو یہیں ہیں، آپ انتظام سنبھالیے۔

مولوی صاحب نے جواب دیا:

میرے بھتیجے اور دوسروں کو گوڑ گانوہ کی تحصیلداری اور کلکٹری کا پروانہ تقرر جاری کیا جائے وہ سب انتظام کرلیں گے اور الور،

جھجر، بلّب گڑھ اور پٹیالہ کے راجاؤں کے نام بھی (رقم کے مطالبے کے) پروانے جاری کیجیے۔ پٹیالہ کا راجہ اگرچہ انگریزوں سے ملا ہوا ہے لیکن اگر دوستانہ مراسلت کی جائے تو وہ ساتھ آجائے گا۔

بادشاہ نے بتایا کہ پیرزادہ ابوالسلام کی درخواست پر بخت خاں نے راجہ پٹیالہ کو ایک پروانہ بھیج دیا ہے مگر ابھی تک اس کا جواب نہیں آیا۔

مولوی صاحب نے کہا میں اپنے بھائی (فضل عظیم) کو جو راجہ کے یہاں ملازم ہیں لکھوں گا وہ جلد جواب بھجوائیں۔

مولوی صاحب (فضل حق خیرآبادی) جب بھی بادشاہ کے پاس آتے بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جہاد کی مہم میں اپنی رعایا کی ہمت افزائی کریں اور ان کے ساتھ باہر (میدان میں) بھی نکلیں، فوجی دستوں کو جس حد تک ممکن ہو بہتر معاوضہ دیں ورنہ اگر انگریز جیت گئے صرف خاندان تیموریہ بلکہ تمام مسلمان نیست و نابود ہو جائیں گے۔ (ص۲۳۔ یادداشت۔ مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق ۱۹۵۸ء)

تقریباً یہی بات حکیم احسن اللہ نے بہادر شاہ کے مقدمے کے دوران عدالت میں شہادت دیتے ہوئے کہی تھی۔ بہادر شاہ کا مقدمہ۔ص ۲۵۶ تا ۲۵۷۔ (ص ۸۲ تا ۸۵۔ فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی)

زیر نظر کتاب کے آئندہ صفحات میں قصیدۂ نونیہ کے جو اشعار میں نے نقل کیے ہیں وہی اتنے کافی ہیں کہ علامہ کی سیاسی شخصیت اور انقلاب ۱۸۵۷ء میں آپ کی قائدانہ حیثیت ان اشعار کی روشنی میں دو دو چار کی طرح واضح اور ثابت ہو جاتی ہے۔

نیز اپنے (عربی) قصائد ہمزیہ و دالیہ مطبوعہ باغی ہندوستان مؤلفہ عبدالشاہد شیروانی میں علامہ فرماتے ہیں:

جن کو پکڑ لیا ان کو قتل و ہلاک کر دیا۔ حالاں کہ جو الزام ان پر لگائے گئے ان سے وہ بری تھے (شعر نمبر۔ ۱۰۱۔ قصیدۂ ہمزیہ)

جب میں قیدی بن کر بھی ان کا اطاعت گذار نہ بنا تو ان کی طرف سے رنج

(شعر نمبر ۱۵۔ قصیدۂ ہمزیہ)
تکلیف میں اور بھی زیادتی کردی گئی۔
مجھے تکلیف پہنچانے کے لئے نصاریٰ نے ایسے زندیقوں کو آمادہ کیا جو ان کے مقرب ہیں اور وہ بھی جن سے ان کے الحاد کی وجہ سے محبت کرتے ہیں۔
(شعر نمبر ۶۳۔ قصیدہ دالیہ)
وہ غصے میں آپے سے باہر ہوگئے اور میری اذیت رسانی میں ہر ممکن جدو جہد سے کام لیا۔ پوری پوری دشمنی برتی اور بغض وکینہ کا کھلا مظاہرہ کیا۔
(شعر نمبر ۶۴۔ قصیدہ دالیہ)
میں نے اس کے سوا کوئی گناہ نہیں کیا کہ ان سے کسی قسم کی محبت ودلچسپی نہیں رکھی۔
(شعر نمبر ۱۰۹۔ قصیدۂ ہمزیہ)
اور بات یہ ہے کہ نصِ قرآنی کی رُو سے ان کی محبت کفر ہے۔ حق پرست انسان کو اس میں نزاع نہیں ہوسکتا۔
(شعر نمبر ۱۱۰۔ قصیدۂ ہمزیہ)
ان سے محبت کیسے روا رکھی جاسکتی ہے جب کہ آسمان وزمین جس ذات مقدسہ کی وجہ سے پیدا کیے گئے ہیں اس ذات گرامی کے یہ نصاریٰ دشمن ہیں؟
(شعر نمبر ۱۱۱۔ قصیدۂ ہمزیہ)

الثورة الهندية میں علامہ فرماتے ہیں:

ایسے حالات میں مجبور ومضطر ہوکر بہت سے لشکری وغیرہ نصاریٰ کے اطاعت گذار بن گئے۔ ان کے پاس ہتھیار، گھوڑے جو کچھ تھا چھین لیا گیا اور پروانۂ امن دے دیا گیا۔

اب وہ اہل وعیال کی طرف خائب وخاسر ہوکر لوٹے۔ پھر تو نصاریٰ سارے ملک پر بلا مزاحمت قابض ہوگئے۔ میدانِ کارزار اور لڑائیوں سے نجات پاگئے۔ بیگم (حضرت محل۔ لکھنو) اس تباہی وبربادی کے بعد بچے کھچے تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑوں (سرحدِ نیپال) کی چوٹیوں پر چلی گئی۔

میں مسافرت وغربت، اضطراب ومصیبت کی زندگی گذار رہا تھا۔ اور میرا اشتیاق ورغبت اپنے گھر، اہل وعیال، پڑوسی، اور احباب تک پہنچنے کے لئے بڑھ رہا تھا کہ امن وامان کا وہی پروانہ جسے قسموں سے مؤکد کیا گیا تھا، نظر پڑا۔

اس پر بھروسہ کر کے اپنے اہل ووطن میں پہنچ گیا۔ مجھے اس کا بالکل خیال نہ رہا کہ بے ایمان کے عہد وپیمان پر بھروسہ اور بے دین کے قسم ویمین پر اعتماد کسی حالت میں درست نہیں۔ خصوصاً جب کہ وہ بے دین جزاوسزائے آخرت کا قائل بھی نہ ہو۔

تھوڑے دنوں بعد ایک حاکم نصرانی نے مجھے مکان سے بلا کر قید کردیا۔ اور رنج وغم میں مبتلا ومقید کر کے دارالسلطنت (لکھنؤ) میں جو دراصل اب خانۂ ہلاکت تھا، بھیج دیا۔ میرا معاملہ ایسے ظالم حاکم کے سپرد کردیا جو مظلوم پر رحم کرنا جانتا ہی نہ تھا۔

اور میری چغلی دو ایسے مرتد، جھگڑالو، تندخو افراد نے کھائی جو مجھ سے محکم آیات میں مجادلہ کرتے تھے۔ جس کا حکم یہ ہے کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔ وہ دونوں نصاریٰ کی محبت ومؤدت پر مُصر تھے۔ انھوں نے مرتد ہوکر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا۔

اس ظالم حاکم نے میری جلاوطنی اور عمر قید کا فیصلہ صادر کردیا۔ اور میری کتابیں، جائداد، مال ومتاع اور اہل وعیال کے رہنے کا مکان، غرض ہر چیز پر غاصبانہ قبضہ کرلیا۔

اس شرمناک رویہ کا تنہا میں ہی شکار نہ بنا تھا بلکہ بہت سی مخلوق سے اس سے بڑھ چڑھ کر ناروا سلوک رکھا گیا۔

انھوں نے عہد وپیمان توڑ کر ہزاروں مخلوقِ خدا کو پھانسی، قتل، جلاوطنی، قید اور حبس میں بلاتاخیر مبتلا کردیا۔ وعدہ خلافی کر کے بیشمار نفسوں اور لاتعداد نفیس چیزوں کو تباہ کرڈالا۔

اس طرح خونِ ناحق شمار سے زیادہ بڑھ گیا۔ سیکڑوں اور ہزاروں سے گنتی نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح شریف وغیر شریف قیدیوں کی تعداد حد سے متجاوز ہے۔ (ترجمہ۔ ص ۷۵۔ الثورة الهندیہ/ باغی ہندوستان۔ مترجم عبدالشاہد شیروانی)

(۴) ۱۸۵۹ء میں جزیرۂ انڈمان (کالاپانی) کی اسارت کے دوران علامہ فضل حق خیرآبادی نے انگریزوں کے مظالم، ان کی بدعہدی، ان کی سنگ دلی، انقلاب ۱۸۵۷ء، دہلی ولکھنؤ کے معرکے ان سب پر مشتمل عربی زبان میں ایک رسالہ تحریر کیا جو **الثورة الهندیه** کے نام سے موسوم ہے۔ ایسے ہی حالات ومعاملات کی منظرکشی آپ نے دو عربی قصائد ہمزیہ ودالیہ میں کی ہے اور اپنے مصائب وآلام اور کرب واذیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ **قصائد فتنة الهند** کے نام سے یہ قصائد مشہور ہیں۔

واضح رہے کہ جزیرۂ انڈمان میں علامہ ۱۸۵۹ء سے ۱۸۶۱ء تک بقید حیات رہے اور اس زمانے میں یہ جزیرہ آلام و مصائب اور تکالیف و شدائد کا مرکز تھا۔ محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۵ء) تقریباً اٹھارہ سال اس جزیرہ میں قید رہ کر جب ۱۸۸۳ء میں ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے تواریخ عجیب/ کالا پانی کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں وہ تحریر کرتے ہیں:

"۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۵ء تک ان جزائر کی آب وہوا سمِ قاتل تھی جس کو زخم ہو گیا وہ تین روز بعد سڑ گیا اور چوتھے دن مر گیا۔ زخم کیا تھا گویا پیامِ اجل تھا۔ شروع آبادی میں یہاں اسکروی کی بیماری بڑے زور و شور سے تھی۔ یہ ایک جہازی بیماری ہے۔ اس سے منہ پک جاتا ہے اور پنڈلیاں سخت پتھر سی ہو جاتی ہیں اور آدمی مر جاتا ہے۔ اس بیماری سے بھی ہزاروں قیدی راہیِ آخرت ہوئے۔ (ص ٦٦۔ تواریخ عجیب/ کالا پانی۔ دینی تعلیمی بورڈ۔ گلی قاسم جان، دہلی ٦۔ ۱۹۶۹ء)

باغی ہندوستان مؤلفہ محمد عبدالشاہد شیروانی علی گڑھی مطبوعہ بجنور ۱۹۴۷ء میں عربی اصل مع اردو ترجمہ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ جس کے مقدمے میں مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) نے لکھا ہے کہ میرے والد مولانا خیرالدین (شاگرد علامہ فضل حق) کے پاس اسے مولانا عبدالحق خیرآبادی (متوفی ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء) نے مکہ مکرمہ بھیجا تھا جو میرے کتب خانہ میں اب تک موجود ہے۔ (ص ۲۳۔ باغی ہندوستان مؤلفہ عبدالشاہد شیروانی مطبوعہ مبارک پور اعظم گڈھ۔ یوپی۔ ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء)

سبحان اللہ کلکشن مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور کتب خانہ ٹونک (راجستھان) میں بھی اس کے مخطوطے محفوظ و موجود ہیں۔ گوپامئو اور لاہر پور میں بھی اس کی نقلیں اسی زمانے میں مولانا عبدالحق خیرآبادی نے بھجوا دی تھیں جب اسے مفتی عنایت احمد کاکوروی (متوفی ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۳ء) کے ہاتھ سے ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء میں علامہ فضل حق (متوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) نے بھیجا تھا۔ یہ الثورة الهندية اور قصائد فتنة الهند کوئلہ اور پنسل سے لکھے گئے تھے جنھیں بڑی عرق ریزی کے ساتھ مولانا عبدالحق خیرآبادی نے مبیضہ کیا تھا۔

یہ واحد مستند تاریخی دستاویز ہے جس کا کوئی بدل نہیں اور جسے ایک قائد انقلاب ۱۸۵۷ء نے بذاتِ خود تحریر کیا ہے اور ہر طرح کا خطرہ مول لے کر اسے اپنے فرزند مولانا عبدالحق کے پاس

ہندوستان بھیجا جب کہ اس زمانہ میں ہندوستان سے جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) تک انگریز مکمل قابض و حاکم و غالب ہو چکے تھے اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ انگریزوں کے خلاف کسی شورش و انقلاب کی بات اپنی زبان پر بھی لا سکے، اور ان کے لرزہ خیز مظالم کی داستان بھی بیان کر سکے۔

سبحان اللہ کلکشن مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود علامہ فضل حق خیرآبادی کے مجموعۂ قصائد میں دو سو پینتیس عربی اشعار پر مشتمل ایک قصیدۂ نونیہ ہے جسے ڈاکٹر سلمٰی سیہول لیکچرر انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد پاکستان نے اپنی کتاب "علامہ فضل حق خیرآبادی" (طبع اول ۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۱ء۔ لاہور) میں (از ص ۴۰۰۔ تا ص ۴۳۳) شائع کر دیا ہے۔

اس قصیدۂ نونیہ (عربی) میں علامہ فضل حق کے چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیں جن سے اس وقت کے حالات و خیالات دونوں کا اندازہ اچھی طرح ہو جاتا ہے۔

تعلیم گاہوں میں مشنریوں کی سرگرمی اور ہندوستانیوں کو نصرانی بنانے کی مہم کا ذکر کرتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں۔ اشعار ۴۶ تا ۵۲:

وَ تلك اَنَ النصارىٰ كان نيتُهُم — تَنصيرَ مَن فى الورىٰ مِن اَهلِ اديانٖ
كانوا يَجدّون لِلتنصيرِ فى حِيلٍ — وَ يَكتُمُونَ مُناهُمُ اَىَّ كِتمَانٖ
اِذْ خَيَّسُوا كُلَّ وَالٍ عَاهَدُوا فَبَغَوا — عَلَيْهِ عَادِيْن مِنْ غَدْرٍ وَ خَيْسَانٖ
غَدَرُوا اِذَا اغْتَصَبُوا كُلَّ الْمَمَالِكِ فِى — طَغْوىٰ وَ عَدْوىٰ وَ فِى كُفْرٍ وَ كُفْرانٖ
بَنَوا اَرَاذِل هَدَمَا لِلنَّبَالِ كَمَا — بَنَوا مَدَارِسَ تَخْرِيْبَاً لِصِبْيَانٖ
بِدَرْسِ رَسْمِ الْهُدىٰ هَمُّوا لِدَرْسِ لُغَىً — مِمَّا افْتَرىٰ الْقَسُّ مِنْ زُوْرٍ وَّ بُهْتَانٖ
وَ وَكَّلوا طَمعًا فِى نَشْرِ مِلَّتِهِمْ — فِى اَرْضِنَا، كُلَّ اُسْقُفٍ وَ مَطْرَانٖ

صنعت و حرف و زراعت پر قبضہ کر کے اقتصادی و معاشی بحران میں ہندوستانیوں کو مبتلا کرنے پھر انھیں بے دست و پا کرنے کی برطانوی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اشعار ۵۶ تا ۵۸:

وَ قَتَّرُوْا رِزْقَ كُلٍّ مِنْ غَوَازِلَ اَوْ — نُكْدٍ يَحُكْنَ وَ صُنَّاعٍ وَ اَقْيَانٖ
لَمْ يَتْرُكُوْا مِنْ فَلَاحٍ فِى الْفَلَاحَةِ بَلْ — دَقُّوا رَحىٰ كُلِّ دَقَّاقٍ وَ طَحَّانٖ
اَلْقُوا اُوْلىٰ الْوُجْدِ فِى وَجْدٍ وَ مَوْجِدَةٍ — وَ كُلَّ ذِىْ حِرْفَةٍ فِى حَرْفِ حَرْفَانٖ

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عائد کردہ ٹیکس، بے انصافی، رشوت خوری کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اشعار ۶۱ و ۶۲:

قَدْ اَوجَبُوْا مَغْرَماً فِی السَّیْرِ فِی طُرُقٍ   عَلٰی جِمَالٍ وَ اَفْیَالٍ وَ ثِیْرَانٖ

قَضَاؤُھُمْ یَسْلُبُ الْخَصْمَیْنِ مَالَھُمَا   فَیَبْتَلُوْنَھُمَا سُحْتاً بِخُسْرَانٖ

ہندوستانی فوجیوں کو گائے اور خنزیر کی چربی والے کارتوس دانت سے کاٹنے پر مجبور کرنے کے واقعاتِ کلکتہ و میرٹھ اور بعد کے حادثات و مظالم کی طرف وضاحت سے اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اشعار ۷۰ تا ۷۵۔

وَکَلَّفُوْھُمْ بِاَکْلِ الشَّحْمِ مِنْ بَقَرٍ   وَ مِنْ رَتُوْتٍ لِیَرْتَدَّا الْفَرِیْقَانٖ

اِنَّ الْبُقَیْرَ لَمَعْبُوْدُ الْھَنَادِكَ وَالْ   خِنْزِیْرُ رِجْسٌ لَدیٰ اَتْبَاعِ قُرآنٖ

وَ اِذْ عَدا جَیْشُھُمْ عَنْ اَمْرِھِمْ وَعَدَوْا   لَھُمْ وَ عَادَوْا تَعَدَّوْا اَیَّ عُدْوَانٖ

فَقَتَّلُوْا أُمَرَاءَ الْجَیْشِ اَکْثَرَھُمْ   کَقَوْمَسٍ وَ کَبِطْرِیْقٍ وَ تُرْخَانٖ

جَالُوْا وَ صَالُوْا وَ غَالُوْا کُل مَنْ وَجَدُوْا   مِنْھُمْ وَ اَعْدَوْا عَلیٰ وُلْدٍ وَ نِسْوَانٖ

وَاتْلَفُوْا کُلَّ مَالٍ مِنْ خَزَائِنِھِمْ   وَ اَحْرَقُوْا کُلَّ اِیْوَانٍ وَ دِیْوَانٖ

لَمْ یَبْقَ فِی جُلِّ مُلْكِ الْھِنْدِ مِنْ حَکَمٍ   یَقْضِیْ لِمَنْ ضِیْمَ أَوْ یَقْضِی عَلیٰ جَانٖ

وَ طَاقَ فِیْ کُلِّ قُطْرٍ مِنْہُ طَائِفَةٌ   تَعُدُوْا لِقَطْعِ طَرِیْقٍ أَوْ لِعُدوانٖ

دہلی کی بدحالی، بہادر شاہ ظفر کے بعض اہل خانہ و وزرا و مصاحبین کی انگریزوں سے ساز باز اور علامہ کے مشوروں پر عمل نہ ہونے کا کرب ان اشعار سے نمایاں ہے۔ اشعار ۸۷ تا ۹۰:

حَلُّوا بِدِھْلِی وَ خَصُّوا أَمْرَ اِمْرَتِھِمْ   بِدَاھِلٍ ذَاھِلٍ تَیْھَانَ وَ لُھَانٖ

ھِمٌّ دَعَانِیْ لِھَمّ بِالْمُھِمِّ فَلَمْ   یَعْمَلْ بِرَائِی وَ لَمْ یَنْفَعْہُ اِرْکَانِیْ

کَانَتْ عَشِیْرَتُہٗ تَھْوَی مُعَاشَرَةً   مَعَ الْعِدیٰ فَلَھُمْ کَانَتْ بِاِذْعَانٖ

وَکَانَ عَامِلُہٗ مِنْ قَبْلُ بَایَعَھُمْ   دِیْنًا بِدِیْنٍ وَ اِیْمَانًا بِاِیْمَانٖ

قلتِ اسباب و اسلحہ اور سنگینی حالات کے باوجود دہلی میں سرفروش مجاہدین کے جہاد و معرکہ آرائی اور انگریزی حکومت کے خلاف شدید حملوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اشعار ۱۱۷ تا ۱۲۳:

وَ جَاءَ دِھْلِی غُزَاةٌ مُخْلِصُوْنَ غَزَوْا   رَجَاءَ فَضْلٍ مِنَ الْمَوْلیٰ وَ رِضْوَان

وَ لَا طَعَامَ لَھُمْ غَیْرَ الْحُبُوْبِ وَلَا   لِبْسٌ لَھُمْ غَیْرَ اَطْمَارٍ وَ خُلْقَانٖ

سُلْحَانُھُمْ اَقْوَسٌ أَوْ اَسْیَفٌ صَدِئَتْ   لِطُوْلِ مَالَزِمَتْ بُطْنَانَ اَجْفَانٖ

لٰکِنَّھُمْ نَجِدُوْھُمْ نَجْدَةً رَمَسَتْ   مِنْ حِزْبِھِمْ کُلَّ جَبَّانٍ بِجُبَّانٖ

کَمْ مَرَّةً حَمَلُوا فِیْھِمْ کَأَنْ حَمَلَتْ   اُسْدٌ جِیَاعٌ عَلیٰ اُجْدٍ وَ حُمْلَانٖ

اِنْحَازَ جُنْدُ النَّصَاریٰ کُلَّمَا حَمَلُوا   وَ لَمْ یَکُنْ لِلنَّصَاریٰ طَوْقُ حُمْلَانٖ

قَدْ جَاھَدُوْا فِی سَبِیْلِ الْحقِ وَ اتَّبَعُوْا   رِضْوَانَہٗ وَ اسْتَحَقُّوْا رَوْضَ رِضْوَانٖ

جنگ کے آخری ایام میں انقلابیوں کی سستی و فرار اور اہل دہلی کی افراتفری اور پھر انگریزوں کی بدعہدی و دار و گیر و قتل و خوں ریزی کے دلدوز واقعات و مناظر کا ذکر اور ان کی نشان دہی کرتے ہوئے علامہ فرماتے ہیں: اشعار ۱۳۲ تا ۱۴۳:

کَمْ نَامَ مَنْ بَاتَ بِالْمِرْصَادِ فِی سِنَةٍ   عَنْ کَیْدِ خَصْمٍ شَدِیْدِ الْاَیْدِ یَقْظَان

نَامُوْا فَخَصْمُھُمُ الْیَقْظَانُ بَیَّتَھُمْ   بِجُنْدِہٖ فَاَنَامُوْا کُلَّ وَ سْنَانٖ

وَ الْخَصْمُ اِذْ اَخَذُوا مِرْصَادَھُمْ نَصَبُوا   مَجَانِقًا دُوْنَ ذَاكَ الْمَرْصَدِ الدَّانٖ

فَضُعْضِعَ السُّور مِنْ أَوْبِ مَجَانِقِھِمْ   وَ أَوْ ھِنَتْ أُسُّ اَبْرَاجٍ وَ اَرْکَانٖ

وَامْطَرُوْا مَطَرًا مِنْ بُنْدُقٍ قَذَفُوْا   فَفَرَّ حُرَّاسُ أَبْرَاجٍ وَ سِیْرَانٖ

لَمْ یَبْقَ فِی السُّورِ مِنْ حُرَّاسِہٖ اَحدٌ   وَلَا لَدیٰ الْبَابِ مِنْ حَامٍ وَ دَرْبَانٖ

فِرَارَ فَسلٍ وَ فَشْلٍ حِیْنَ صَوْلِ عِدَی   اَزَلَّ اِقْدَام اَقْدَامٍ وَ شُجْعَانٖ

صَالَ النَّصَاریٰ فَغَالُوا کُلَّ مَنْ وَجَدُوا   مِنْ عَیْنِ دِھْلِیْ وَ سُفَّارٍ وَ قُطَّانٖ

قَدْ کَانَ اَکْثَرُ اَھْلِ الْمَصْرِ قَدْخَرَجُوْا   مِنْ دُورِھِم لِاتِّقَاءٍ أَو لِخَشْیَانٖ

وَ الْبَعْضُ لَمْ یَبْرَحُوْا لِلْاِتِّکَاءِ عَلَی   وَعْدِ النَّصَاریٰ بِاِرْفَاہٍ وَ اِیْمَانٖ

وَ کَانَ ذَا الْوَعْدُ اِیْعَادًا فَقَدْ خُنِقُوْا   وَ لَمْ یُوَارُوْا بِاَرْمَاسٍ وَ اَکْفَانٖ

پھر دہلی کی تباہی اور اہل دہلی کی بربادی پر اظہار افسوس اور اظہار رنج و غم کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اشعار ۱۴۹ تا ۱۵۳:

سُکَّانُھَا ذَھَبُوا اَیْدِی سَبَا وَ سَبَی الْ   لُعَدُوّ مَنْ شَذَّ مِنْ رَکْبٍ وَ رُجْلَانٖ

لَمْ يَنْجُ مِنْهُمْ سِوَى مَنْ فَرَّ مُخْتَفِياً   كَبَعْضِ وُلْدٍ وَ نِسْوَانٍ وَ ذُكْرانِ

لَهْفِيْ عَلىٰ بَلَدٍ سُكَّانُهَا ذَهَبُوا   اَيْدِي سَبَا فَاقِدِي اَهلٍ وَ قُطّانِ

لَهْفِي عَلىٰ بَلَدٍ وَحْشٍ تَوَحَّشَ مَا   فِيْمَنْ ثَوَاهُ سِوَى وَحْشٍ وَ وَحْشَانِ

يَتِيْهُ اَهْلُوهُ اَوْ حَاشَا بِمَتْيَهَةٍ   مُسْتَأْنِسًا كُلُّ وَحْشَانٍ بِوُحْشَانِ

عورتوں کی قابل رحم حالت اوراپنی عفت وعصمت کے تحفظ کے لئے کنویں وغیرہ میں چھلانگ لگا کراپنا وجود ختم کردینے کے بے شمار اندوہ گیں حادثات کے بارے میں کہتے ہیں۔ اشعار۱۸۸تا۱۹۰:

كَمْ خَضَّبَ الشَّوكُ اَقْدَامَ الرَّوَاقِنِ مِنْ   دَمٍ وَ كَمْ خُضِّبَتْ قِدَمًا بِاَرْقَانِ

كَمْ حَاصِنٍ فُرِّقَتْ فِي لُجَّةٍ غَرِقَتْ   فَاَهْلَكَتْ نَفْسَهَا صَوْنًا لِاِحْصَانِ

صَارَ الْمَوَالِيْ عَبِيْدًا لِلْعَبِيْدِ كَمَا   صَارَتْ حَرَائِرُ اَمْوَانًا لِاَمْوَانِ

بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری اوراس کے شہزادوں کوشہید کر کے خوان میں ان کا سر بہادر شاہ ظفر کے سامنے پیش کرنے کی سنگ دلانہ حرکت کے بارے میں فرماتے ہیں۔ اشعار۱۹۷تا۱۹۹:

وَ الْمَلْكُ عَنَوْهُ اِذْ عَنَوْهُ مُحْتَبِسًا   فِي حَرَسِ اَزْرَقَ كَالشَّيْطَانِ شَيْطَانِ

وَ قَتَّلُوْا مِنْ بَنِيْهِ الْغُرِّ اَرْبَعَةً   وَ عَلَّقُوا جُثَثَ الْقَتْلىٰ بِعِيْدَانِ

أَهْدُوْا اِلَى الْمَلِكَ الْعَانِي مَفَارِقَهُمْ   مَقْطُوْعَةً وَضَعُوْهَا فَوْقَ اَخْوَانِ

علم وعلما اور مساجد ومدارس کے ساتھ انگریزوں نے جو شرمناک سلوک کیا اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اشعار۲۰۵تا۲۰۹:

فَخَنَّقُوْا جُلَّ اَهْلِيْهَا وَ لَمْ يَذَرُوْا   اِلَّا اَقِلَّاءَ مِنْ شِيْبٍ وَ شِيْخَانِ

لَمْ يَتْرُكُوْا عَالِمًا فِيْهَا وَ لَا عِلْمًا   مِنَ الْعُلُوْمِ الَّتِيْ حُقَّتْ بِاِيْقَانِ

لَمْ يَتْرُكُوْا فِي صُحُفٍ مُصْحَفًا شَغَفًا   بِدَرْسِ أَرْسُمِ تَدْرِيْسٍ وَ قُرآنِ

هَدُّوْا الْمَسَاجِدَ اِلَّا نَادِرًا مَنَعُوا   فِيْهِ الصلوٰةَ بِتَثْوِيْبٍ وَ اِيْذَانِ

دَاخُوا الْبِلَادَ وَ دَاسُوهَا فَلَمْ يَذَرُوْا   مَاكَانَ فِيْهِنَّ مِنْ قَصْرٍ وَ اِيْوَانِ

مجاہدوں اور انقلابیوں کے حوصلے جب ایسے پست ہوگئے کہ علامہ فضل حق انھیں آمادۂ جہاد وقتال رکھنے میں ناکام ہوگئے تو باحسرت ویاس دہلی کوالوداع کہا اور طرح طرح کی مشکلات سے

دوچار ہوتے ہوئے اپنے اہل وعیال کے ساتھ کسی طرح اپنے وطن اودھ پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اشعار۲۱۷تا۲۲۲:

خَرَجتُ استوقِفُ الْجَيْشَ الْهَزِيْمَ وَ مَا   تَثْبِيْتُ مَنْ فَرَّ فِيْ وُسْعِي وَ اِمْكَانِي

وَ قُلْتُ اِنَّ الْعِدَى لَنْ يَّصْفَحُوا اَبَدا   فَمَامِنَ الْحَرْبِ مِنْ بُدٍّ وَ حَتْنَانِ

لَمْ اٰلُ فِيْ نُصْحِهِمْ جُهْدًا فَمَا اسْتَمَعُوْا   اِلَى النُّصْحِ وَ لَمْ يُصْغُوْا بِاِرْغَانِ

فَقَادَنِي الْعَجْزُ اِذْ صَادَفْتُهُمْ صَدَفُوْا   عَنِ الْقِتَالِ اِلىٰ اَهْلِي وَ اَوْطَانِي

وَدَّعْتُ دِهْلِي وَ دَاعَ الرُّوحِ قَالَبَهَا   كُرْهًا وَوَدَّعْتُ خُلَّانِيْ وَ خُلْصَانِيْ

تَفُوْرُ فِي كَبِدِي الْحَرَّى لَظَى كَبِدٍ   تَثُوْرُ فِي خَلَدِي اَشْجَانُ اَشْجَانِ

ان اشعار کے ذریعہ علامہ فضل حق خیرآبادی نے جہاں انقلاب ۱۸۵۷ء کی ایک اجمالی تاریخ بیان کردی وہیں اپنا درددل بھی انھوں نے مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش کردیا ہے۔ اور پھر جزیرۂ انڈمان ہی میں بحالتِ اسیری اپنی جان بھی جاں آفریں کے سپرد کر کے مذہب وملت وقوم و وطن کے ساتھ اپنی جذباتی وابستگی اور ہر نازک موقعہ پر اپنی جرأت واستقامت وثبات قدمی کا سینۂ دہر پہ ایک نقش قائم کردیا ہے۔

مولانا عبدالحق خیرآبادی (متوفی ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء) فرزند علامہ فضل حق خیرآبادی ایک زمانہ میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس تھے۔ اپنی مشہور کتاب— ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' کے اندر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ان کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

''موجودہ ہیڈ مولوی اس عالم دین کے صاحبزادے ہیں جن کو ۱۸۵۷ء کے ''غدر'' نے نمایاں کردیا تھا۔ اور جنھوں نے اپنے جرموں کا خمیازہ اس طرح بھگتا تھا کہ بحر ہند کے ایک جزیرے میں تمام عمر کے لئے جلاوطن کردیے جائیں۔

اس غدار عالم دین کا کتب خانہ جس کو حکومت نے ضبط کرلیا تھا اب کلکتہ کالج میں موجود ہے۔ (ص ۲۰۳۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان از ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، مترجم ڈاکٹر صادق حسین، الکتاب انٹرنیشنل، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔ جون ۲۰۰۲ء)

۳۰ ر جنوری ۱۸۵۹ء کو علامہ کی گرفتاری کے بعد آپ کے خلاف دائر مقدمہ ۲۲ ر فروری تا ۴ ر مارچ ۱۸۵۹ء چلتا رہا اور جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) میں تاحیات جلاوطنی کی سزا ہوئی۔ ۱۲ ر صفرالمظفر ۱۲۷۸ھ/ ۲۰ ر اگست ۱۸۶۱ء کو آپ نے جزیرۂ انڈمان میں آخری سانس لی۔ آپ کی قبر

ایک بڑے درخت کے سایے کے نیچے آج بھی محفوظ ہے اور علما و اہل عقیدت وہاں حاضری بھی دیتے رہتے ہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ و جزاہ عن الاسلام و المسلمین خیر الجزاء۔ آمین۔

سید لطیف احمد بلگرامی کے نام اپنے ایک خط میں مرزا غالبؔ لکھتے ہیں:

''کیا لکھوں اور کہوں؟ نور آنکھوں سے جاتا رہا اور دل سے سرور۔ ہاتھ میں رعشہ طاری ہے، کان سماعت سے عاری

عتاب عروساں در آمد بجوش
صراحی تہی گشت و ساقی خموش

فخرِ ایجاد و تکوین مولانا فضل حق جیسا دوست مر جائے اور غالب نیم مردہ، نیم جاں رہ جائے۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی

اگر جوان ہوتا تو آپ سے دعائے خیریت چاہتا۔ اسی (۸۰) برس کا بوڑھا ہونے کو آیا ہوں۔ آپ سے دعائے مغفرت کا امیدوار ہوں۔ (ص ۱۱۹۔ اردوئے معلیٰ۔ مطبوعہ لاہور)

مولانا عبدالشاہد شیروانی (متوفی ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء) نے مولانا عبدالحق خیرآبادی (متوفی ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء) کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''مولانا نے آخر وقت یہ وصیت فرمائی کہ۔

جب انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو میری قبر پر خبر کر دی جائے۔

چنانچہ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو رفیق محترم مولانا مفتی سید نجم الحسن رضوی خیرآبادی نے مولانا عبدالحق کے مدفن (درگاہ مخدومیہ، خیرآباد، موجودہ ضلع سیتاپور، اودھ) پر ایک جم غفیر کے ساتھ حاضر ہو کر میلاد شریف کے بعد قبر پر فاتحہ خوانی کی۔

اور اس طرح پورے پچاس سال بعد (از ۱۸۹۸ء تا ۱۹۴۷ء) انگریزی سلطنت کے خاتمہ کی خبر سنا کر وصیت پوری کی۔ جزاہ اللّٰہ خیر الجزاء۔ (ص ۱۲۔ مقدمہ زبدۃ الحکمۃ از عبدالشاہد شیروانی۔ مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۴۹ء)

اہل دہلی کی طرف سے اکبر شاہ ثانی کی خدمت میں ایک تاریخی یادداشت (میمورنڈم)

عرضی رقم زدہ مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی

از طرف

رعایائے شہر در باب امتناع ٹیکس وغیرہ

حضرت جہاں پناہ! خلد الله ملكه و سلطنته

بعرض اقدس و اعلیٰ (می رساند) برائے جہاں آرائے اقدس روشن و مبرہن است کہ رعایائے ایں ملک چہ ہنود و چہ مسلماں برخے ازاں ہا مزارعاں و کشاورزاں و اکثر روزگار پیشہ و بعض ازاں ہا تجار و اکثرے اہلِ حرفہ و بعض لاخراج دار و روزینہ دار و بعض دریوزہ گر بودہ اند و اکثرے از اہلِ اسلام و بعض ہنود اصل متوطن ایں جانیستند بلکہ بہمراہی حکام و سلاطین ترکِ اوطان خود ہا (کردہ) دریں (جا) توطن گزیدہ اند تا وقتے کہ مملکت ہندوستان بقبضہ و تصرف سلاطین و راجگاں بود وجہ معیشت سکان ایں دیار ہیچ گونہ تنگی نکردہ بود کہ ہمگی وجوہ معاش کہ خدمات عمدہ وجہ روزگار سپاہ صرف بسکنہ ایں دیار اختصاص داشت۔ ہر کس از سکنہ ہمیں ملک بقدر حوصلۂ وافر خود لیاقت خود روزگارے در اہل مناصب یا در زمرۂ سپاہ یا در پیشہ تجارت یا در حرفہ می داشت۔

از زمانے کہ عملداریٔ سرکار انگریزی در مملکت ہندوستان رسیدہ است بتدریج تنگی روزی و ضیق معاش رفتہ رفتہ الحال بحدے رسیدہ است کہ نوبت بجان دکارد باستخواں رسیدہ۔ زیرا در سرکار انگریزی ہمگی وجوہ معاش مفقود و ابواب روزی مسدود شدہ اند۔ بجز معدودے چند۔ یعنی چند کس در عملۂ عدالت دیوانی و کلکٹری و فوجداری و پرمٹ و تھانہ و تحصیل بمشاہرۂ قلیل ملازم اند۔ و پس از تبدیل دفاتر و تغیر طرز نوشت و خواند کچہری ہا چناں تخیل می گردد کہ در چندے ایں روزگار ہم

نصیب ایں بے چارگان نہ خواہد ماند۔ وحال تجار ایں است کہ سرکار انگریزی ایں است حال تنگی معاش روزگار سکان ایں دیار۔

ایں است حال تنگی معاش روزگار سکان ایں دیار۔ وحال تجار ایں است کہ سرکار انگریزی همہ وجوہ تجارت خود اختیار نمودہ وہمگی اجناس از قسم پارچہ وریسمان وظروف واسپاں وغیرہ دوّاب خود از ملک انگلستان وغیرہ بہم رسانیدہ۔ دراں ملک برائے فروش علی التواتر در ہر قریہ وبلدہ از بلاد ایں ملک می آرد۔ ومنفعتے برائے کسے از سکنہ ایں دیار نمی گذارد۔ دراں جہت ہمہ تجار ایں دیار از پیشہ خود دست بردار شدند۔

وحال لاخراجیداں ایں ست کہ ہمہ لاخراجی باوجود ایں کہ در قوانین سنہ ۱۸۰۳ء وسنہ ۱۸۰۵ء سرکار انگریزی عہد ومیثاق نوشتہ اند کہ ہر اراضی لاخراجی کہ پیش از غرۂ جنوری سنہ ۱۸۰۱ء وغرۂ جنوری ۱۸۰۳ء بقبض وتصرف لاخراجیدار خواہد بود، گوسند باشد یانہ یا واہب آں اختیار عطا داشتہ باشد یانہ گاہے بضبطی نہ خواہد آمد۔ الحال بلا ہیچک تحقیقات وبلا تامل در ہر یک ضلع ضبط شدہ می شود۔ حالا از وجہ معیشت لاخراجیداراں بالمرہ مسدود شدہ است۔ وروزے کہ یک قلم در ہمہ اضلاع موقوف شدہ است ایں وجہ معیشت ہم باقی نماندہ۔

وحال مزارعاں وکشاورزاں ایں ست کہ براں ہا آں چناں جمع خراج مقرر شدہ است کہ دراں حالتے واستطاعتے باقی نماندہ است۔

وحال بے استطاعتی وبے مقدوری آنہا خود از دفاتر کلکٹری ظاہر۔

وہر گاہے کہ برائے ایں سکان این دیار وجہ معیشت باقی نہ ماند اہل حرفہ چہ کار برائے کدام کس تواند کہ بذریعہ آں برائے خود کسب معیشت توانند نمود۔

ہر گاہے کہ ہمگی خلائق از معیشت خود تنگ باشد بدریوزہ گر کدام کس تواند داد؟ ایں ہمہ حالات اجمالی تنگی معاش جملہ رعایائے ہندوستان ست۔

وحال تنگی معاش رعایائے علاقۂ شاہ جہاں آباد مجملاً ایں ست کہ در ابتداءِ عمل سرکار انگریزی پرگنہ ہوڈل وپلول وبیتن ونجف گڈھ وسالکہ وفیروز آباد وڈیگ وپوناہانہ وسانگرس وبجنور وسونی پت وگوہانہ وجرسٹہ وکھرکھودہ وروہتک ومہم وہانسی وحصار وغیرہ پرگنات در جاگیر بودند ودر سرکارات جاگیرداران ایں ہمہ پرگنات ہزارہا کسان در ہر کار ودر فوج وشاگرد پیشہ ملازم بودند۔ واکثر دیہات دروبست واراضیات لاخراجی متصرفہ در معافی بودند۔ ایں ہمہ پرگنہ ودیہات و

اراضیات بحیطۂ ضبطی در آمدند ومعیشت للوک کسان بالمرہ موقوف شدہ۔

حالا در تمام عالم روزگار ہمچو عنقا ناپدید است۔ وبیوہ ہا وبے چارگاں از مسدودی روزینہ وضبطی املاک مدار بر سر بر اوقات خود ہا بر چرخہ زنی وریسماں فروشی وآسیا ساتی می داشتند۔ بسبب ایں کہ سرکار تجارت ریسماں اختیار کردہ وآسیا ہائے آبی نصب نمودہ است ایں وجہ معیشت آنہا بالمرہ مسدود گردید۔

وہم چنیں اہل حرفہ ودوکان داراں وساہوکاراں (بہ) بے بضاعتی خلائق از انتفاع مایوس گشتہ سرمایۂ کہ داشتند بصرف خورد ونوش در آوردہ اند۔

بایں ہمہ تنگی ہا از سر چارلس مٹکاف صاحب بہادر مصادرۂ ادائے زر چوکیداری بر ما بے چارگاں چار ونا چار کہ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات است دادن مصادرہ باوصف آں کہ گاہے از عہدِ سلاطین وحکام سلف علت آں نداشتیم بذمۂ خود نہادہ تا حال کردہ ماندیم۔

حالا چند روز ست کہ صاحب مجسٹریٹ حال در ہر کوچہ وبرزن وبازار بہ تعمیر پھاٹک ہائے قدیم وجدید کہ ہیچ یک فائدہ براں مترتب نیست وگاہے مترتب نہ خواہد شد حکم دادند۔ ما غربا جبراً وکرہاً تکالیف فاقہ کشی وبیع ورہن اسباب خورد ونوش برداشتہ بصرف ہزار ہا روپیہ تعمیل حکم نمودیم وتکالیف ہر روزہ (کہ) از مسدود ماندن دروازہائے نو تعمیر واغماض چوکیداران ہر یک محلّہ، در بست وکشاد آں عائد حال ما یان می شود بر خود گوارا می نمائیم۔

الحال علاوہ ازیں خبر صاحب مجسٹریٹ حال حکم تقرر پنج پنج کس پنجاں در کوچہ ومحلّہ......"

(مطبوعہ نوائے ادب ممبئی۔ شمارہ جولائی ۱۹۶۲ء۔ بہ تحقیق پروفیسر نثار احمد فاروقی)

دستور العمل مرتبہ مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی

دستور العمل عدالت

قواعد و ضوابط کورٹ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

از آنجا کہ واسطے رفع برہمی سر رشتہ اور موقوفی بدانتظامی طریقہ فوجی اور ملکی کے مقرر ہونا دستور العمل کا واجب اور مناسب اور واسطے عمل درآمد دستور العمل کے اوّلاً معین ہونا کورٹ کا ضروری ہے۔ اس لئے حسب ذیل قواعد لکھے جاتے ہیں:

۱۔ ایک کورٹ قائم کی جائے اور اس کا نام ''کورٹ ایڈمنسٹریشن'' بمعنی جلسۂ انتظام فوجی و ملکی رکھا جائے۔

۲۔ اس جلسے میں دس آدمی مقرر کیے جائیں۔ اس تفصیل سے کہ چھ جنگی اور چار ملکی ہوں اور جنگیوں میں دو شخص پلٹن پیادگان سے اور دو شخص رسالہ ہائے سواراں سے اور دو سر رشتہ توپ خانہ سے منتخب کیے جائیں اور ملکی چار شخص۔

۳۔ ان دس شخصوں سے ایک شخص باتفاق غلبۂ آرا پریسڈنٹ یعنی صدر جلسہ اور ایک شخص وائس پریسڈنٹ یعنی نائب صدر جلسہ مقرر ہو۔ اور رائے صدر جلسہ کی برابر دو رائے کے قرار پاوے گی۔ اور ہر ایک سر رشتہ میں بقدر ضرورت سکتر مقرر کیے جائیں۔ اور پانچ گھنٹے ہر روز (؟) جلسہ کورٹ کا......

۴۔ ان شخصوں کے مقرر ہونے کے وقت حلف ان باتوں کا لیا جائے کہ:

کام کو بڑی دیانت اور امانت سے بلا ارز رعایت کمال جاں فشانی سے اور غور و فکر سے سر انجام کریں گے۔

اور کوئی دقیقہ دقائق متعلقۂ انتظام سے فروگذاشت نہ کریں گے۔ اور حیلۃً اور صراحتاً اخذِ اجر یا رعایت کسی طرح کی کسی لحاظ سے وقت تجویز امور انتظام کورٹ میں نہ کریں گے۔ بلکہ ہمیشہ ساعی اور سرگرم ایسے انتظام امورات سلطنت میں مصروف رہیں گے کہ جس سے

استحکام ریاست اور رفاہ اور آسائش رعیت ہو۔

اور کسی امر مجوزہ کورٹ کو بے اجازت کورٹ اور صاحب عالم قبل اجراء اس کے صراحتاً یا کنایتاً کسی پر ظاہر نہ کریں گے۔

۵۔ انتخاب اشخاص کورٹ کا اس طریقے سے کہ غلبۂ آراء سے دو دو شخص پلٹن پیادگان اور رسالہ ہائے سواران سے اور سر رشتہ توپ خانہ جنگی سے جو قدیم الخدمت اور ہوشیار اور واقف کار اور لائق و عقیل ہو کیے جاویں۔

اور اگر کوئی شخص ہوشیار، بہت عقیل و فہیم اور لائق انصرام کار کورٹ ہو اور شرط قدیم الخدمتی اس میں نہ پائی جائے تو یہ ایک امر خاص ان صورتوں میں مانع تقرر ایسے شخص کا نہ ہوگا۔

اور اسی طرح تقرر چار شخص ملکی کا بھی عمل میں آوے گا۔

۶۔ بعد مقرر ہونے دس شخصوں کے اگر کوئی شخص جلسۂ انتظام کورٹ میں رائے اپنی کسی امر میں ایسی خلافِ دیانت اور امانت اور محمول اوپر رعایت کسی کے ہووے گا تو...... کامل غلبہ آرائے کورٹ سے وہ شخص موقوف کیا جاوے گا اور دوسرا شخص حسب قاعدہ پانچویں (بمقام) اس کے انتخاب ہوگا۔

جو امورات انتظام کے پیش آویں اول تجویز ان کی کورٹ میں ہوگی — اور بعد منظوری صاحب عالم بہادر کے اِطلاع رائے کورٹ سے حضور والا میں ہوتی رہے گی۔

۷۔ بعد مرتب ہونے رائے غلبہ آرائے جلسۂ کورٹ سے واسطے منظوری کے پیش گاہ حضور صاحب عالم بہادر میں پیش ہوں گے اور کورٹ ماتحت حکومت صاحب عالم بہادر ممدوح کے رہے گی۔ اور کوئی امر امور انتظامی، جنگی، و ملکی کے تجویز کورٹ اور بلا منظوری صاحب عالم محتشم الیہ اور بلا اطلاع حضور والا قابلِ اجرائی نہ ہوگا۔

اور درصورت اختلاف رائے صاحب عالم بہادر بعد تجویز ثانی کورٹ وہ رائے بحالت اختلاف بوساطت صاحب منظم الیہ پیش گاہ حضور ظلِ سبحانی میں پیش ہو اور اس میں حکم حضور کا ناطق ہوگا۔

۸۔ کورٹ میں سوائے اشخاص مقررہ جلسہ کے بجز صاحب عالم بہادر اور حضرت ظلِ سبحانی کوئی شخص شریک جلسہ اور حاضر نہ ہوگا۔

اور جب اشخاص معینہ کورٹ میں سے بعد رقوی لائق پذیرائی ایک شخص اپنے زمرہ مقرر

سے حاضر جلسۂ کورٹ نہ ہو سکے تو رائے غلبہ آرائے اشخاص ماقی حاضرین جلسۂ کورٹ
کے بمنزلہ رائے غلبہ رائے کل جلسۂ کورٹ کے متصور ہوگی۔

۹۔ جب کوئی شخص کورٹ میں سے بنسبت کسی امر کے رائے اپنی پیش کرنی چاہے تو اوّلاً اتفاق ایک رائے دوسرے شخص کا پہلے کر کے اس وقت رائے اپنی متفق علیہ دو شخص کورٹ میں پیش کرے۔

۱۰۔ جس وقت کوئی امر کورٹ میں موافق قاعدہ نویں کے پیش ہو۔ اول پیش کرنے والا تقریر اپنی کورٹ میں بیان کرے اور جب تک بیان اس کا تمام نہ ہو کوئی شخص اس میں دخل نہ کرے۔ اہل کورٹ میں سے اگر کسی کو کچھ اعتراض ہو تو وہ پہلے اپنا اعتراض ظاہر کرے تا تمام ہونے اس کے بھی کوئی دخل نہ دے۔ اگر معترض پر کوئی تیسرا شخص تقریر درباب اصلاح یا ترمیم کسی طرح کی کمی بیشی کے ساتھ پیش لاوے اور ماقی اہل کورٹ کو سکوت ہو تو ہر ایک اہل کورٹ اپنی اپنی رائے علیحدہ لکھے۔ بعد ملاحظہ موافق قاعدہ آٹھویں کے غلبۂ آرا پر عمل ہوگا اور بعد منظوری ہر ایک سررشتہ کے سکریٹر کے پاس بھیجی جاوے۔

۱۱۔ ہر ایک سررشتۂ فوج کے جو اشخاص حسبِ قاعدہ دوسرے کے منتخب کیے جاویں گے وہی اشخاص اس سررشتہ کے منتظم اور منصرم مقرر کیے جاویں اور ان کے تحت میں چار آدمی کی کمیٹی حسبِ طریقہ قاعدہ چوتھے کے قرار پاوے اور بقدر ضرورت اسے اس کمیٹی میں بھی سکریٹر مقرر رہوں۔ اور جو رائے اس کمیٹی میں غلبہ آرا سے مرتب ہوئے وہ رائے بذریعہ ان شخصوں افسر کمیٹی کے کورٹ میں پیش کی جاوے اور کورٹ سے موافق قاعدہ ساتویں کے عمل میں آوے اور یہی طریقہ ہر ایک سررشتہ فوجی اور ملکی میں مرعی کیا جاوے۔

۱۲۔ ہر وقت بمقتضائے مصلحت کورٹ کو اصلاح اور ترمیم قواعد دستور العمل ہذا کا غلبۂ آرا سے اختیار دیا جاوے۔"

....

منقول از عکس مطبوعہ مقابل ۱۸۲۔ "بہادر شاہ دوم" از ڈاکٹر مہدی حسین۔ نیز ڈاکٹر سین کی "۱۸۵۷" کے مقابل ص ۴۷۔ اور میوٹنی پیپر کے ص ۳۶۔ بکس نمبر ۵۴۱۔ ۵۳۹۔
مذکورہ بالا دستور العمل عدالت، قومی محافظ خانہ/نیشنل آرکائیوز نئی دہلی میں موجود ہے۔

دستور العمل کا انگریزی ترجمہ

مرتبہ:— مولانا فضل حق خیرآبادی
مترجمہ۔ مہدی حسین

Whereas to avoid disorder in the sections of administration of the military and civil departments it is absolutely necessary to form a constitution, and whereas to work out the constitution it is necessary first to appoint a Court the following regulations are hereby laid down:

i. A court should be established and named Administration Court, that is a Court to administer military and civil affairs.

ii. This Court should be consist of ten members 6 military and 4 civil. Of the military members two should be selected from the infantry platoons, two from the cavalry and two from the artillery.

iii. Out of these ten men, one should be appointed President (Sadr-i-Jalsa) and another Vice-President (Naib Sadr-i-Jalsa) by a unanimous majority of votes. In ever department there should be appointed secretaries according to need. The quorum for the court meeting, should be five whereby work should be done satisfactorily.

iv. At the time of the appointment of these ten men they should take an oath that they would

do court work with honesty, sincerity, great industry and with deep thought and care, and that they will not neglect even the slightest detail in matters administrative and that they would not covertly or overtly have resort to taking and seizing, or to partiality of and kind and in any manner or at the time of dealing with matters of administration in the Court. On the contrary they will always keep themselves engaged in and apply themselves attentively and diligently to executing the State matters whereby the State should obtain security and the people should enjoy peace and repose, and that they would not divulge any item of the Court work under consideration before its enforcement plainly or by allusion without the permission of the Court and Sahib Alam.

v. Election of the Court members should be in this manner: by the majority of votes two men should be elected from the infantry platoon, two from the cavalry troops and two from the artillery; such men must possess a long record of service and must be clever and well-versed, able and intelligent. Should any person be highly clever, intelligent and learned and an adept in the administration of the Court work but lacking long service, this latter disqualification in that case will not obstruct the appointment of such a person. And in the same way will be appointed four civil members.

vi. After ten members have been appointed, if

any member gave his vote before the full Court regarding any matter in such a manner as to be against honesty and sincerity or calculated as partial to any one, then that member will be removed from the Court by the definite majority of votes; and another person will be elected in his place according to regulation five.

vii.All the items of administration to be considered should be first treated in the Court and after the approval of Sahib Alam the decision of the Court should be communicated to His majesty (Huzur-i-Wala)

viii. After the programme has been drawn by the majority of votes it will be submitted for approval to Sahib Alam Bahdur and the Court will remain under the control of the alluded Sahib Alam Bahadur. And no matter of administration wether military or civil will be executed without the sanction of the Court and the appraval of the Sahib Alam and without the information of the same being given to His Majesty (Huzur-i-wala). In the event of a difference of opinions and after being re-considered by the Court, the same matter the difference still continuing-will be sent up through the Sahib Alam to His Majesty the Shadow of God (Huzur Zille Subhani). The order given thereupon by His Majesty (Huzur) will be final.

viii. In the Court none, barring the Sahib Alam Bahadur and His Majesty the Shadow of God (Huzur Zile Subhani) who will be entitled to be

present, no non-member will be present, nor will be join the meeting. When out of the specified number of the Court members, anyone for some valid and acceptable reason be unable to attend the court meeting, then the votes of the remaining members of Court will be tantamount to the vote of the Court in full strength.

ix. Should a member of the court desire to express his opinion regarding any matter, he would first secure the consent of another member, then he may make the proposal of the same as a matter already agreed upon by two members.

x. When an item is to be considered in the Court according to Regulation nine, then the proposer should first speak in the Court meeting. No one will interrupt his speech until he has finished it. If a member of the Court has any objection to make regarding it, he should explain it and no one will interrupt him either, until he has finished speaking. Should a third man make a speech amending or adding or subtraction form the objection, and if the remaining members of the Court observe silence regarding it, then every member of the Court should write out his opinion separately. After sonsulting Regulating eight, decision will be arrived at by the majority.

xi. Those who from every section of the military are elected according to Regulation two, should be appointed managers and

administrators of that section. Under their control should work a committee of 4 men according to regulation four, in that commettee by secretaries should be appointed according to need, And whichever proposal is formally put up in the commettee by the majority of votes, that proposal will be presented to the Court by those very officers of that Committee. It should be executed by the Court according to Regulation seven. The same process should be adopted in every military and civil section.

xii. At any time according to the demand of the occasion right should be vested in the Court to make amendments by majority of votes in this constitution.

☆☆☆☆☆☆

احوالِ انقلاب بزبانِ قائدِ انقلاب

علامہ فضل حق خیرآبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) نے جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) میں بحالت اسیری زیرنظر قصیدہ اوراس کے بعد کا قصیدہ نیز الثورۃ الھندیہ لکھ کر حضرت مفتی عنایت احمد کاکوروی (متوفی ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء) کے ذریعہ ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء میں اپنے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی (متوفی ۱۳۱۶/ ۱۸۹۸ء) کے پاس ہندوستان بھیجا تھا۔ مولانا عبدالحق خیرآبادی نے ان کی تبییض کر کے اسی دوران ان کے کئی مخطوطے مختلف جگہوں پر ارسال کر دیے تھے۔ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور کتب خانہ ٹونک (راجستھان) میں ان کے مخطوطے بھی موجود و محفوظ ہیں۔ الثورۃ الھندیۃ اور قصائد فتنۃ الھند مع عربی متن و اردو ترجمہ بقلم مولانا عبدالشاہد شیروانی علی گڑھی (متوفی ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء) سابق اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ پہلی بار مدینہ پریس بجنور سے ۱۹۴۷ء میں اشاعت پذیر ہوئے۔ یہاں دونوں قصائد (صرف اردو ترجمہ) بالترتیب نذر قارئین ہیں۔ ان کی تاریخی عظمت و اہمیت اہل علم و تحقیق کے نزدیک مسلم ہے۔ آنے والے دوسرے قصیدے کے ابتدائی اشعار عرب شعراء کے طرز کے مطابق "تشبیب" کے ہے۔ اردو قارئین اس کا خیال رکھیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) سوز دل سے میرے پہلو کی ہڈیوں میں آگ بھڑک رہی ہے۔ آنسو خشک اور اندرونی اعضا پگھل گئے ہیں۔

(۲) مجھ پر نازل شدہ مصیبتوں اور اہل وطن سے میری دوری پر دوست روتے اور دشمن خوش ہوتے ہیں۔

(۳) میں ایسی عزت وعظمت کی زندگی بسر کر رہا تھا جو شرفا وعظما کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی۔

(۴) میرے درد وغم اور تباہی وہلاکت پر دوست غمگین وحیران ہیں اور چارہ گروں نے تیمارداری میں برا طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔

(۵) میرے اس تغیرِ حال، چغل خوروں کی خبر رسانی اور مخبروں کی ریشہ دوانی پر دشمن خوشیاں منا رہے ہیں۔

(۶) رنج نازل اور غم ہم پر طاری ہو گیا۔ اور ہماری دوری میں کھنگی وسختی ہے۔

(۷) بڑی بڑی مصیبتوں نے گھیر لیا جن کی وجہ سے ہڈیاں کمزور اور اعضا ریزہ ریزہ ہو گئے۔

(۸) مجھے ایک عورت (ملکہ وکٹوریہ) کے مکر نے مبتلائے مصائب کر دیا۔ عورتوں کا مکر بڑا ہی زبردست مکر ہے۔

(۹) یہ عہد و پیمان کر کے مخلوق کو فریفتہ بنا لیتی ہیں۔ پھر ان کے عہد و میثاق کو وفا و قرار نہیں ہے۔

۱۰۔ اس نے یہ کہہ کر شہرت دی کہ جو لوگ گھر سے دور پڑے ہیں انھیں امن دے دیا گیا۔

۱۱۔ ایسے لوگ اس کے اعلانِ امان سے دھوکے میں آکر اپنے گھروں کو خوش خوش واپس ہو گئے۔

۱۲۔ میں بھی کافرہ متسلطہ کے اعلانِ امان سے فریب کھا کر مکان پہنچ گیا۔

۱۳۔ پھر تو حکام سلطنت نے اس کے عہد و میثاق کی پروانہ کرتے ہوئے سختی شروع کی۔ اور میری بھی طلبی ہوئی۔

۱۴۔ انھوں نے مجھے روک لیا اور خوب اذیتیں پہنچائیں۔ گویا کہ اس عہدِ ملکہ میں ایفائے عہد کی نیت بھی نہ کی گئی تھی۔

۱۵۔ جب میں قیدی بن کر بھی ان کا اطاعت گذار نہ بنا تو ان کی طرف سے رنج و تکلیف میں اور بھی زیادتی کردی گئی۔

۱۶۔ میں خوشگوار عیش و عشرت میں تھا۔ پھر غموں کا ہجوم اور مصائب کا ناگہانی ورود ہوا۔

۱۷۔ ان کے سینوں کو کینوں نے بھر دیا۔ ان کی زبانوں پر بھی بغض کی وجہ سے دشمنی ظاہر ہونے لگی۔

۱۸۔ انھوں نے مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ میں اس زندگی سے دل برداشتہ ہو گیا۔ اور اس پر مسرت زمانہ کو بھول گیا جس میں آسانی تھی۔

۱۹۔ میرے رات، دن سخت گرمی اور اندھیروں میں گذرتے ہیں۔ گویا کہ سخت موسم گرما کے دن اور آخر ماہ کی اندھیری راتیں ہیں۔

۲۰۔ رات تو دوامی شکل اختیار کر چکی ہے جس کی صبح نہیں ہے۔ اور نہ دن کے لئے شام اور رات ہی ہے۔

۲۱۔ مجھے سب تصرفات سے روک کر ایک کوٹھری میں ٹھہرا دیا جس میں زہریلی ہوا کے سوا اور کسی قسم کی ہوا نہ پہنچ سکتی تھی۔

۲۲۔ کیسی مصیبت تھی۔ اس کوٹھری کی دیواریں انسانی اعضا کو بھونتی تھیں اور اس کی مٹی تپتی ہوئی زمین تھی۔

۲۳۔ کیسا پریشان کن قید خانہ تھا۔ نہ تو اس کے میدان میں پیشاب خانہ تھا نہ اس کے پاخانہ میں آب دست خانہ تھا۔

۲۴۔ انھوں نے سختی کے ساتھ، دوستوں، بھائیوں اور بیٹوں کو مجھ سے ملنے سے روک دیا۔

۲۵۔ میرے کپڑے چھین کر مجھے تہبند اور کملی پہننے کے لئے دے دی گئی۔

۲۶۔ کپڑے اتار کر قیدیوں کی کملی پہنادی۔ میرے پاس اس خراب کملی کے سوا کوئی دوسری چادر نہ رہی۔

۲۷۔ میرے برتن اور جوتے بھی ظلماً چھین لیے۔ میرے استعمال کے لئے کوئی برتن اور پیالہ بھی باقی نہ چھوڑا۔

۲۸۔ میرے ننگے پاؤں رہنے پر کوئی مہربانی سے پوچھنے والا بھی نظر نہ آیا۔ حالاں کہ اس کملی اوڑھنے سے قبل مجھے مجد و شرف حاصل تھا۔

۲۹۔ میرے، بہت سے مہربان، مخلص اور صاف دل دوست جن کی محبت، صدق و صفا پر مشتمل تھی۔

۳۰۔ انھیں روک دیا گیا وہ میری ملاقات، بات چیت اور زیارت سے مجبوراً محروم رہے۔

۳۱۔ وہ مجھے ننگے پاؤں دیکھتے تو انا للّٰہ و انا الیہ راجعون پڑھتے اور میری برہنہ پائی پر ان سے جھگڑا کر بیٹھتے۔

۳۲۔ قید خانے میں میرے پاس کوئی خادم بھی، ایذا رسانی کے از دیاد کی وجہ سے نہ چھوڑا۔

۳۳۔ صبح و شام بے چینی سے گذرتے ہیں۔ کانٹے اور چنگاریاں، بستر کے بجائے مقدر ہو چکی ہیں۔

۳۴۔ بہت سفید رنگ، شراب خور، اور میگوں مونچھوں والے دشمن مجھ پر ظلم و بیداد کرتے ہیں۔

۳۵۔ وہ سیاہ جگر، سفید فام، نرم جلد اور سخت قلب واقع ہوئے ہیں۔

۳۶۔ وہ بد بخت و بے شرم ہیں۔ انھیں نہ ننگ دعار ہے۔ نہ غیرت و حلم و حیا ان کے پاس ہو کر گذری ہے۔

۳۷۔ بڑے جھگڑالو اور سخت دل ہیں۔ ان میں نرمی اور مادۂ حمایت و حمیت نام کو نہیں۔

۳۸۔ سارے عیوب ان میں موجود ہیں۔ مردوں میں سرکشی اور عورتوں میں حرام کاری پائی جاتی ہے۔

۳۹۔ ان سب کی بدمعاشیاں، مردوں کی سرکشیاں، عورتوں کی حرام کاریاں، فسق و فجور کی اشاعت و کثرت کا سبب بنی ہوئی ہیں۔

۴۰۔ ظلم و ستم کے لئے میری قید ہی کافی نہ سمجھی۔ بلکہ جلاوطنی اور غربت و مسافرت کی سزا بھی دی۔

۴۱۔ قید کر کے مجھے ایسے پہاڑ پر رات میں وہ لے گئے جہاں پہنچ کر قیدی ہلاک ہو چکے ہیں۔

۴۲۔ اس پہاڑ کی گھاٹیوں کو دریا گھیرے ہوئے ہیں۔ موت کے سوا اس کا کوئی صحن نہیں۔

۴۳۔ یہاں کی آب و ہوا ناموافق اور آنے والے کے لئے وبال ہے۔ وبائیں ہر طرف عام ہیں۔

۴۴۔ یہاں شریف و عزیز، ذلیل و گریہ کناں ہیں۔ دوا ناپید اور بیماریاں بے شمار ہیں۔

۴۵۔ اس کی گھاٹیوں میں عقوبت و ہلاکت عام ہے۔ اس میں دوا دارو بھی بیماری میں اضافہ

کرتی ہے۔ اور نہ بھوکے کو غذا ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔

۴۶۔ اس میں نہ تو پیاسے کے حلق سے پانی اترتا ہے
۴۷۔ ماش کی دال غذا ہے۔ گوشت، پیاز، ترکاری، ککڑی کچھ میسّر نہیں۔
۴۸۔ وہ دریا کا کنارا ہے جہاں میدان، مہربانی، گیہوں اور شیرینی کسی چیز کا پتا نہیں۔
۴۹۔ قیدیوں کے گروہ کے گروہ مرچکے۔ جو بچے ہوئے ہیں وہ نہ مردوں میں ہیں نہ زندوں میں ہیں۔
۵۰۔ میت کی نماز جنازہ، قبر، کفن اور پوشش کا یہاں کوئی سوال ہی نہیں۔
۵۱۔ یہاں ننگے کے لئے کوئی عار اور طالب احسان محتاج کے لئے سوال کی حیا نہیں۔
۵۲۔ وہ ایسی خراب جگہ ہے جہاں طاقتور انسان پر بھی رہنے کے بعد زرد پتّوں کا غلبہ ہوتا ہے۔
۵۳۔ قیدیوں کو ایسی مشقت میں مبتلا کیا گیا کہ ان کی ایذا ہلاکت کے درجہ تک پہنچ گئی۔
۵۴۔ ان کے کینوں کی وجہ سے قیدیوں کی بیڑیاں مضبوط ہو گئیں۔ اور تھکن نے دشواری میں ڈال دیا۔
۵۵۔ بلاؤں اور سختیوں نے انھیں ہلاک کیا۔ اور چوکیداروں اور مصیبتوں نے رنج میں مبتلا کر دیا۔
۵۶۔ ان کی غم انگیز تشنگی اور بھوک پر پیاس، قلّت غلّہ اور گرانی نے بھی مبتلائے مصیبت کر دیا۔
۵۷۔ انھوں نے مجھے ایسے مہلکہ میں ڈال دیا جہاں زمین، زمین ہے، نہ آسمان، آسمان۔
۵۸۔ اس کا قریبی آسمان وہ بادل ہیں جن کی بارش غموں کا سیلاب ہے اور اس کی زمین سنگریزے ہیں۔
۵۹۔ اس میں بارش نہیں ہوتی۔ گرمی کی شدت سے فضاء آسمانی سے بخار کا پسینہ گرنے لگتا ہے۔
۶۰۔ بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا ہے جس کی وجہ سے دن میں سورج اور رات کو چاند نظر نہیں آتا۔
۶۱۔ رات میں تو اندھیرے پر اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ اور دن اندھیری رات کی طرح ہے۔
۶۲۔ اس میں سورج کبھی نہیں نکلتا۔ اور نہ چاندنی والی راتیں ہوتی ہیں۔
۶۳۔ اس کے سیاہ افق پر کسی نے چاند نکلتا نہیں دیکھا۔ اور نہ گرگٹ ہی سورج دیکھ سکا۔
۶۴۔ وہ خود تاریک ہے اور تاریک دریا سے گھرا ہوا ہے۔ اس دریا میں نہ موتی ہے نہ روشنی۔
۶۵۔ یہاں کی فصل بہار و خزاں میں کوئی فرق نہیں۔ یہاں نہ گرمی، گرمی ہے۔ نہ جاڑا، جاڑا۔

۶۶۔ یہاں آنے والا حیران و پریشان ہو جاتا ہے۔ اور دشمن کا کبر و غرور اور بڑھ جاتا ہے۔
۶۷۔ وہ تونگری، مسرت اور مال و دولت سے ہمکنار تھے۔ متکبر بن کر قیدیوں پر ظلم و ستم ڈھانے لگے تو فقیر بن گئے (گویا اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو گئے)
۶۸۔ اس کا راستہ ہچکولے کھانے والی کشتیوں کے ذریعہ ہے۔ جو بھی ان پر سوار ہوتا ہے دردِ سر یا متلی میں ضرور مبتلا ہوتا ہے۔
۶۹۔ اس کی جوش مارتی ہوئی موجیں کپڑوں اور بستروں کو تر کرتی ہیں اور ان کی تری سے مسافر بھیگ جاتے ہیں۔
۷۰۔ مجھے ظلماً اہل و وطن سے اچانک دور کر دیا گیا۔ میری کمزور و نحیف ذریت کو بھی چھوڑنا پڑا۔
۷۱۔ ان کو زبردستی ان کے مکان سے نکال دیا گیا۔ ان کے لئے آرام و سکون کی کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔
۷۲۔ وہ مسکین و فقیر بن گئے کیوں کہ مکان، روزی، اور کوئی چیز بھی ان کے لئے نہ رہی۔
۷۳۔ میں نے انھیں حالت گرسنگی میں چھوڑا۔ نہ ان کے پاس مال و دولت ہے نہ مسکن و منفعت۔
۷۴۔ ان سے اپنے بیگانے بن کر علیحدہ ہو گئے۔ اور برابر والوں نے ظلم و ستم اختیار کیا۔
۷۵۔ میرے خاندان اور اقارب کو قید و بند نے دور کر دیا۔ اب یہاں پانی کے سوا کوئی دوست نہیں ہے۔
۷۶۔ میرے بیٹوں سے میری خبریں ایسی ہی پوشیدہ ہیں، جیسی ان کی مجھ سے۔
۷۷۔ میں احباب و اعزّہ کی دوری پر روتا ہوں اور وہ میری جدائی پر۔
۷۸۔ ان کا مجھ پر رونا ایک حد تک ٹھیک بھی ہے کیوں کہ مرنا 'ور ذلیل قید میں زندگی گذارنا دونوں برابر ہیں۔
۷۹۔ مجھے وحشیوں میں بسا دیا گیا۔ اس قید خانہ (جزیرے) میں دو قسم کے وحشیوں، کووں، اور اجنبیوں کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔
۸۰۔ اس کی آب و ہوا نا موافق اور وبائی ہے۔ نہ تو اس کے کھانے میں شکم سیری ہے نہ پانی میں سیرابی۔
۸۱۔ پانی گرم ہے جس میں سیرابی نہیں، جس طرح کہ غذا ماش ہے جس میں مزا نہیں۔
۸۲۔ وہاں نہ شیریں پانی ہے، نہ لذیذ کھانا اور نہ وسیع میدان ہی سامنے ہے۔

۸۳۔ میری مصیبت میں میرے بدن کے عارضوں، قولنج، فتق (فوطوں میں پانی اترنا) اور قوبا (داد) نے اضافہ کردیا۔

۸۴۔ میرا غم والم مٹنے والی عافیت پر ہے۔ اور اس میں مصائب نے مجھے بھی مٹانے میں کسر نہیں رکھی اور اس کی ہوا ٹیڑھی ہے۔

۸۵۔ فضل حق کے لئے رفعت و بلندی کا فضل تھا۔ اسی کی وجہ سے مجھے برابر والوں پر سر بلندی حاصل تھی۔

۸۶۔ شرفا میں قدر و منزلت و وجاہت میسر تھی۔ جن کے سامنے رؤسا و اعیانِ ملک جھکتے تھے۔

۸۷۔ کمال، رفعت، وسعت، نزہت، بزرگی، برتری۔

۸۸۔ تونگریِ قلب، خوش بختی، نصیبہ وری، یہ سب نعمتیں حاصل تھیں۔ جنھیں آزمائش و مصیبت بھی بوسیدہ نہ کرسکی ہے۔

۸۹۔ پوری عافیت، بڑھتے ہوئے سامان کی بنا پر بڑھتی ہوئی آبرو اور پائیدار عزت بھی نصیب تھی۔

۹۰۔ بہت سی عیش کی زندگی متغیر اور کتنی نعمتیں زائل ہوگئیں۔ سختی اور بدحالی نازل ہوگئی۔

۹۱۔ اللہ نے مجھے وہ علوم عطا کیے کہ ان میں سے بہت کچھ علما نے حاصل کیے۔

۹۲۔ میرے اور میرے احباب کے درمیان جدائی حائل ہوگئی۔ حالت اور نعمت متغیر ہوگئی۔

۹۳۔ شرارتیں، گھر آئیں۔ اور فتنے اچانک چھاگئے۔ مسرت جاتی رہی اور شادمانی و راحت پھر گئی۔

۹۴۔ نصرانی ہمارے شہروں پر مسلط کردیئے گئے۔ بیوقوف ہندوستانی ان کے مددگار بن گئے۔

۹۵۔ وہ اسے نہ سمجھ سکے کہ نہ ان کے پاس وفاداری ہے نہ وسعت وحمایت۔

۹۶۔ اس سے قبل ان پر ایسا شخص حکمراں تھا جسے غنا و سرود اور مال و دولت نے خدمتِ اہل دیار سے روک دیا تھا۔

۹۷۔ اب جب کہ نصاریٰ کی پورے طور پر مدد کی گئی تو وہ ظلم وستم میں افراط سے کام لینے لگے۔ اور کمزوروں کو تو جور و جفا نے جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکا۔

۹۸۔ وہ دیار جو آباد تھا ویران ہوگیا۔ جس طرح کہ امرا و رؤسا تباہ و برباد ہوگئے۔

۹۹۔ وہ ''قوم سبا'' کی طرح متفرق و منتشر ہوگئے۔ ان کے بہت سے گروہوں کو قید و بند نے آدبایا۔

۱۰۰۔ مال دار، فقیر۔ عزیز و شریف، ذلیل۔ عظیم و کریم، خوار۔ اور بڑے، چھوٹے بن گئے۔

۱۰۱۔ جن کو پکڑ لیا ان کو قتل و ہلاک کیا۔ حالاں کہ جو الزام ان پر لگائے گئے تھے ان سے وہ بری تھے۔

۱۰۲۔ انھوں نے اپنی بری اور بے گناہ رعایا کو بُری طرح ہلاک کیا۔ خون ایسا بہا جیسے چشمے ابل کر بہتے ہیں۔

۱۰۳۔ بہت سے شہروں کو برباد و خراب کر کے ان کا نشان تک نہ چھوڑا۔ وہ جنگل اور میدان معلوم ہونے لگے۔

۱۰۴۔ مسجدوں اور محلوں کو منہدم کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی جگہ کوئی عمارت ہی نہ تھی نہ وہاں کبھی کچھ بنا ہوا تھا۔

۱۰۵۔ ان کی نحوست و ذلّت کی وجہ سے زمین کی پیداوار میں بھی کمی ہوگئی۔ اس میں کوئی نشو و نما باقی نہ رہا۔

۱۰۶۔ انھوں نے لوگوں پر زندگی تنگ کردی۔ ان کے لئے رات اور دن کا کھانا بھی نہ رہا۔

۱۰۷۔ ان کے سینوں میں بھرے ہوئے کینوں کے بوجھ سے ان کی پیٹھیں ثقیل ہوگئیں۔

۱۰۸۔ کیا حد سے متجاوز سرکشی کی بھی کوئی حد ہے؟ اور کیا سرکشوں کی کوئی سزا بھی ہے؟

۱۰۹۔ میں نے اس کے سوا کوئی گناہ نہیں کیا کہ ان سے کسی قسم کی محبت و دلچسپی نہیں رکھی۔

۱۱۰۔ اور بات یہ ہے کہ نص محکم قرآنی سے ان کی محبت کفر ہے۔ حق پرست انسان کو اس میں نزاع نہیں ہوسکتا۔

۱۱۱۔ ان سے محبت روا کیسے رکھی جاسکتی ہے؟ جب کہ آسمان و زمین جس کی وجہ سے پیدا کیے گئے اس ذات گرامی کے یہ نصاریٰ دشمن ہیں۔

۱۱۲۔ وہ پہلا نور ہے جو دنیا میں چمکا۔ اور اس کی روشنی سے سارا عالم منوّر ہوا۔

۱۱۳۔ وہ اول و آخر پیغمبر ہیں۔ انھیں پر نبوت ختم ہوئی۔ اور انھیں سے اس کی ابتدا ہوئی تھی۔

۱۱۴۔ وہ بہترین سردار ہیں۔ خدا نے اپنا بھید انھیں کے ذریعہ ظاہر کیا۔ اور انھیں کی وجہ سے آفرینش و ہلاکت ہے۔

۱۱۵۔ خدا نے انھیں ایسے بلند اوصاف کے ساتھ مختص کیا جو کسی جدید و قدیم کو نہ بخشے گئے۔

۱۱۶۔ انھیں ایسا فضل و علوے مرتبہ عطا کیا کہ اس میں کوئی بھی ان کا شریک و سہیم نہیں۔

۱۱۷۔ ان کے اچھے اچھے نام رکھ کر رفیع الشان بنایا۔ خالق کے ناموں میں سے ان کے بھی بہت سے نام ہیں۔

۱۱۸۔ نیکوکار، رحم دل، کثیر الفضل، صاحب قوت، ہادی، نرم خو، محسن، کثیر العطایا ان کے اوصاف و نام ہیں۔

۱۱۹۔ ان کی پیدائش نے مکہ کی شان دوبالا کر دی۔ اور بطحا نے ان کے وجود سے شرف پایا۔

۱۲۰۔ ان کے قیام سے طیبہ (مدینہ منورہ) پاک و بلند رتبہ ہوا۔ دور دور سے لوگ اس کی زیارت کا قصد کر کے آتے ہیں۔

۱۲۱۔ وہ خوشخبری سنانے والے انسان ہیں۔ ان سے پہلے صُحفِ آسمانی اور انبیاے کرام ان کی بشارت دیتے آئے۔

۱۲۲۔ ان کی بعثت کی عیسیٰ علیہ السلام اور ان سے قبل موسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی جیسے کہ شعیاء (بن امصیا) نے عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت دی تھی۔

۱۲۳۔ شہزادیاں ان کے دربار میں لونڈیاں بن کر حاضر ہوئیں۔ اسی طرح صحیفۂ آسمانی کی پیشین گوئی تھی۔

۱۲۴۔ چمکنے اور چمکانے والے چاند کو انھوں نے اشارہ سے دو ٹکڑے کر کے دونوں کو جدا جدا کر دیا۔

۲۵۔ سورج غروب ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا کہ ادائے نماز کے لئے ٹھیر گیا۔

۱۲۶۔ پتھروں اور درختوں نے انھیں سلام کیا۔ اور بہت سے چوپائے ان سے فصاحت کے ساتھ ہم کلام ہوئے۔

۱۲۷۔ انگلیوں سے پانی جاری کر کے انھوں نے پیاسوں کو سیراب و شاداب کیا۔

۱۲۸۔ ان کی برکت سے بہت بھوکوں کا تھوڑی سی غذا نے پیٹ بھر دیا۔ اور بہت نادار مالدار بن گئے۔

۱۲۹۔ ان کی جدائی پر کھجور کا تنا اس عاشق کی طرح رویا جس کو محبوب سے دوری کی سوزش و تپش رلاتی ہے۔

۱۳۰۔ وہ امینِ معتمد ہیں۔ امّی ہو کر ایسی حکمت کی تعلیم دیتے ہیں جس کے سمجھنے سے حکما و عقلا بھی عاجز ہیں۔

۱۳۱۔ وہ حاکم ہیں۔ ذکرِ حکیم کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس کی آیتیں محکم ہیں۔ ان میں ہدایت و

شفا ہے۔

۱۳۲۔ وہ ذکر، حکمتوں اور حکموں پر مشتمل ہے جن سے عقلیں دنگ اور اہل عقل و دانش عاجز ہیں۔

۱۳۳۔ اس ذکرِ حکیم کی بلاغت کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس نے بلیغوں کو ساکت اور فصیحوں کو گونگا بنا دیا ہے۔

۱۳۴۔ انھوں نے اپنی سہل و روشن شریعت کے ذریعے منسوخ شریعتوں کی سیاہی کو دور کر دیا۔

۱۳۵۔ ان کی ملّت کے ظہور نے تمام ملّتوں کو اس طرح مٹا دیا جیسے تارے سورج کے چمکتے ہی محو ہو جاتے ہیں۔

۱۳۶۔ سورج کی روشنی ستاروں کی چمک مٹا دیتی ہے اور سمندر دریاؤں پر غالب آ جاتا ہے۔

۱۳۷۔ اللہ نے ان کے دین کو غالب و باقی رکھا۔ اور مرور دہور پر اسی کو بقا ہے۔

۱۳۸۔ اگر بے وقوف اور معاند دشمن ان کے ان کمالات کا انکار کرتے ہیں تو تعجب کی بات نہیں۔

۱۳۹۔ "قُرصِ خورشید" کو اندھے کی آنکھ کی بے نوری ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

۱۴۰۔ اذان میں ان کے نام کو بلند آواز کے ساتھ پکارنا، اللہ نے ضروری قرار دیا ہے۔

۱۴۱۔ اگر آدم کے مراتب اس فرزندِ سعید کی بدولت بلند ہو گئے۔ تو تعجب کیوں ہے؟ بہت سے باپ، بیٹوں کی وجہ سے بلند مرتبہ ہوئے ہیں۔

۱۴۲۔ بہت سے رسولوں نے امتِ وسط ہونا چاہا۔ ان میں سے بعض کی آرزو پوری کر دی گئی۔
(جیسے زمانۂ امام مہدی میں عیسیٰ علیہ السلام یہ شرف حاصل کریں گے)

۱۴۳۔ میدان حشر میں لوگوں کی سراسیمگی کے وقت وہ جائے پناہ ہیں۔ ان کے سوا اور کسی سے امید نہیں ہو سکتی۔

۱۴۴۔ وہ سب حضرت آدم اور دوسرے رسل علیہم السلام کے پاس طلب گار شفاعت ہو کر پہنچیں گے۔ مگر وہ سب خاموشی اختیار کر لیں گے۔

۱۴۵۔ ان سب سے مایوس ہو کر وہ سب، ان سخی داتا کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ یہ فلاح و نجات والی شفاعت سے کام لیں گے۔

۱۴۶۔ انھوں نے مخلوق کے لئے خالق کی وہ خوشنودی چاہی جو اس کے برگزیدہ بندے کی رضا تھی۔

۱۴۷۔ اور ان کی رضا اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ ایمان والوں کو عذاب سے نجات ملے۔

۱۴۸۔ ان کی اولاد شریف، بزرگ اور سردار ہے مخلوق پر۔ انہیں رفعت و بلندی حاصل ہے۔ اور
ان کی چمک دمک کے سامنے سب ماند ہیں۔

۱۴۹۔ وہ عظیم و کریم، اور نجیب و نقیب ہیں۔

۱۵۰۔ ان کے اوصاف و مناقب کا احاطہ کسی مدح کرنے والے کی مبالغہ آمیز مدح بھی نہیں کر سکتی۔

۱۵۱۔ ان بزرگوں کی فیروز بختی کی کیا تعریف ہو سکتی ہے جب کہ ان کے جد امجد افضلِ خلق خدا ہیں
اور وہ سب ان کے اجزاء ہیں۔

۱۵۲۔ ان کے صحابہ بڑے بہادر، آپس میں رحیم اور دشمن پر شدید ہیں۔

۱۵۳۔ اللہ نے قرآن کی آیت میں ان کا وصف بیان کیا ہے۔ یہ وصف ایسا ہے کہ اس سے بڑھ کر
انسانوں کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

۱۵۴۔ انھیں "السابقون الاولون" سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ طبقۂ صحابہ میں سب سے بہتر ہے۔
اور ان میں بھی سب سے اعلیٰ خلفائے راشدین ہیں۔

۱۵۵۔ اے رحمت عالم! اس شخص پر رحم کیجیے جس کے لئے زمانے میں کہیں رحم نہیں۔

۱۵۶۔ میں آپ پر قربان! اس قیدی پر احسان فرمائیے جس پر نہ کوئی رحم کرنے والا ہے اور نہ اس
کے پاس فدیہ و احسان ہے۔

۱۵۷۔ ناامیدی اور تاخیر کے بغیر اس کی شفاعت فرمائیے کیوں کہ زمین اور اس کے وسیع و عریض
اطراف و اکناف اس کے لئے تنگ ہو چکے ہیں۔

۱۵۸۔ اے شاکی اونٹ کے فریادرس! مجھ پر بھی ویسی ہی مہربانی فرمائیے۔ مجھے بھی بیماری اور
مجبوری کی شکایت ہے۔

۱۵۹۔ مصائب کی رسی زمانہ دراز سے دراز ہے ان کو دور فرمائیے۔ اور سفارش کیجیے تا کہ اس اذیت
سے نجات ملے۔

۱۶۰۔ آپ کی سخاوت و عطا کے سوا، ربّ رحیم و مُعطی کے سامنے مجھے کوئی امید نہیں۔

۱۶۱۔ مجھے نفع پہنچایئے اور خدا کی بارگاہ میں سفارش فرمائیے۔ میری مصیبتوں پر رحم فرمائیے کیوں
کہ آپ مستجاب الدعوات ہیں۔

۱۶۲۔ اے خدا! میری امیدوں کو ثابت کر دکھا اور دشمنوں سے مجھے نجات دلانے میں تاخیر نہ فرما۔

۱۶۳۔ میں بیٹھنے والوں کو لڑائی میں برابر آگے بڑھاتا رہا۔ اور لڑائی شروع ہو جانے پر خود بیٹھا رہا۔

۱۶۴۔ میں اپنی سستی کی وجہ سے ایسے موقعہ پر باز رہا یہ میں نے بڑا جرم کیا۔ جب نیک بخت
حضرات نے مجھے شہادت کے لئے بلایا تو میں حاضر نہ ہوا یا میں شہادت سے محروم رہا جب
کہ سعادت مندوں نے جام شہادت نوش کیا۔

۱۶۵۔ اے آمرزگار! میرے قصور کو معاف کر۔ اور جو کچھ مجھ سے خطا سرزد ہوئی اس سے درگذر۔
تجھی سے عفو و درگذر کی امید ہے۔

۱۶۶۔ اگر میرے جرموں کی فرد بڑی ہے تو تیرے پاس ایسی وسیع رحمت ہے جس کی حد و
نہایت نہیں۔

۱۶۷۔ مغفرت و عفو فرما! توبہ قبول کرتے ہوئے دشمنوں اور چغل خوروں کی ابتلا سے مجھے نجات دے۔

۱۶۸۔ میری مصیبتیں اگر میرے حق میں مقدر بھی ہو چکی ہوں تب بھی مظلوم کی دعا سے ردّ قضا
ہو جایا کرتا ہے۔

۱۶۹۔ مجھے بدبختی میں نہ ڈال۔ نیک بخت بنا۔ پھر سعادت کے بعد شقاوت نہیں لوٹا کرتی۔

۱۷۰۔ جو مظلوم تجھے پکار رہا ہے اس کی سن لے۔ اور اس کی مصیبت دور کر۔ کافروں نے ظلم و
تعدّی کا اس کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا ہے۔

۱۷۱۔ ان کی طرف سے مصائب، اتہامات، اور رسوائیوں کے پے بہ پے حملوں نے مجھے ضعیف و
ناتواں بنا دیا ہے۔

۱۷۲۔ تو ہی میرا وکیل ہے۔ میرے معاملہ کو ایسے دشمنوں کے سپرد نہ کر جن کی ایذا رسانی نے مجھے
مصیبت میں ڈال دیا ہے۔

۱۷۳۔ اے خدا! ان سے انتقام لے اور انھیں رسوا کر۔ تا کہ ان کی سزا سے میرے مصائب کی کچھ
تلافی ہو سکے۔

۱۷۴۔ اے پروردگار! میرے دشمنوں سے انتقام لے اور مجھے پناہ دے۔ میری مدد کر۔ مدد و پناہ
تیرے ہی پاس ہے۔

۱۷۵۔ کامیابی کا مجھے مدت سے انتظار ہے۔ اب میری امیدِ نجات میں تاخیر نہ ہونی چاہیے۔

۱۷۶۔ اے پروردگار! عجلت فرما تا کہ جلاوطنی کی تکلیفوں سے رہائی و خلاصی نصیب ہو۔

۱۷۷۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے کوئی نیکی کا کام نہیں کیا بلکہ بداعمالی ہی میں مبتلا رہا۔

۱۷۸۔ میری عمر لہو ولعب میں بے کار گذری اور خواہشات نے مجھے نیکیوں سے غافل رکھا۔

۱۷۹۔ کوئی ثواب کا کام نہ کر سکا۔ میرے قول وفعل میں ریا ونمائش کو دخل رہا۔

۱۸۰۔ لیکن تیرا فضل وکرم وسیع ہے۔ اسی سے اپنی بیماری اور گناہوں سے براءت کی امید ہے۔

۱۸۱۔ مجھ پر رحم فرما! مجھے ایسی آزمائش سے سابقہ پڑا ہے کہ اس سے زیرکی اور اصابت رائے بھی نہ بچا سکی۔

۱۸۲۔ ساٹھ سال تک تو نے مجھے امن وعافیت میں رکھا۔ تیرے فضل سے اس مدت میں نعمتیں بڑھتی ہی رہیں۔

۱۸۳۔ پھر اچانک میری عافیت مختل اور احتیاج مسلّط ہوگئی۔ رحم فرما! خیر وعطا تیری ہی جانب سے مل سکتی ہے۔

۱۸۴۔ اے میرے رب! تیرے دربار میں میرے وسیلے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، علی، حسن، حسین اور فاطمہ زہرا ہیں۔

۱۸۵۔ اے پروردگار! جب تک سرسبز وشاداب مرغزاروں میں کبوتروں اور سبز رنگ پرندوں کی آوازیں گونجتی رہیں، سرکار پر رحمتیں نازل فرما۔

۱۸۶۔ اور جب تک بارش اور مسلسل جھڑ زمین کو سیراب کرتے رہیں۔ اللہ کی برکتیں اور اس کی رحمتیں ان سب بزرگوں پر نازل ہوتی رہیں۔

☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ اے محبوبہ! واپس آ۔ اور ایک ایسے مریض کی عیادت کر جس کا مرض قدیم اور متعدی ہے۔ اور جو ہلاکت کے اس درجہ قریب پہنچ چکا ہے کہ دشمن بھی عیادت کو آنے لگے ہیں۔

۲۔ وہ امراض کا عادی بن چکا ہے۔ اس کی عیادت کرنے والے اس سے تنگ آ کر کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ حالاں کہ ستار اور بانسری بجانے والے اس کے گرد رہا کرتے تھے۔

۳۔ وہ مرض ہلاکت کا خوگر ہو گیا ہے۔ چارہ ساز وغمخوار بھی تھک چکے ہیں۔ وہ عیادت گروں اور اہل وعیال پر بارگراں بن گیا ہے۔

۴۔ وہ ایسا مریض ہے جس کی بیماری ایسا عجز ودرماندگی ہے جس کی کوئی دوا نہیں۔ اس کے ظاہر مرض کی وجہ سے موت ہر وقت سامنے کھڑی ہے۔

۵۔ زمانہ کی حالت پر حسرت وافسوس ہے کہ مریض مُزمِن کو شفایاب ہونے نہیں دیتا۔ اس کا علاج غم کی زیادتی کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

۶۔ میری بیماری سخت ہے۔ عیادت گروں کی بار بار چارہ فرمائی بھی ایسے مریض کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی جو امراض کے ہجوم ودرد کا عادی ہے۔

۷۔ میرے سینے میں وہ غم واندوہ بھر گیا۔ جس نے اندرونی و بیرونی اعضا کو غضا (ایک درخت) لکڑی کی آگ کی طرح جلا ڈالا جو جلاتے ہی بھڑک اٹھتی ہے۔

۸۔ بہت فرق ہے اس آگ میں جس کے جلنے کی جگہ تنور کا پیٹ ہو جس کا ایندھن لکڑیوں کا گٹھا ہوتا ہے۔

۹۔ اور اس غم والم کی آگ میں جو ہمارے اعضا کو جلاتی ہے جس کا ایندھن ہماری آنتیں، پسلیاں اور قلب وجگر ہیں۔

۱۰۔ نیک بختی نے پشت دکھا دی۔ اب نہ سلمٰی ہی مصالحت کرتی ہے اور نہ سُعاد ہی سعادت مندی

کا اظہار کرتے ہوئے مدارات پر آمادہ ہے۔

☆☆☆☆☆

۱۱۔ میں غم اٹھاتے اٹھاتے بدصورت بن گیا۔ جو لوگ مجھے یوم پیدائش سے پہچانتے ہیں انھیں بھی شناخت میں تأمل ہونے لگا۔

۱۲۔ میری طاقت کم ہو گئی اور ضعف دونا ہو گیا۔ یہ سب کچھ قویٰ اور جسم میں بہت زیادہ نقص کی وجہ سے ہوا۔

۱۳۔ میرے قلب، روح، جسم اور بدن کو جو مصیبتیں پہنچیں، ان کی وجہ سے مجھ میں قوت باقی نہیں رہی۔

۱۴۔ سخت مصیبت کی وجہ سے ہلاکت کو پہنچ گیا۔ روحانی اور جسمانی اذیتوں میں گھِر کر شیخ فانی بن گیا۔

۱۵۔ اچانک مصیبت نے آدبایا۔ اس نے میرے اہل خاندان اور رشتہ داروں کو رلایا اور دشمن و حاسد کو ہنسایا۔

۱۶۔ اس مصیبت نے مجھے کمزور و ناتواں بنا دیا اور شریر و بدخصلت لوگوں کے مکر نے مجھ سے زیرکی و دانائی کو زائل کر دیا۔

۱۷۔ رعایا، فوج اور لشکر کے گروہوں کے لئے امن کا اعلان کر کے ان نصاریٰ کی ملکہ نے بھی مکر سے کام لیا۔

۱۸۔ اس نے پہلے تو مسلمانوں اور بت پرستوں کی جماعتوں کو نصرانی بنانے کا قصد کیا۔

۱۹۔ ان سب نے اِعراض کرتے ہوئے صاف انکار کر دیا اور اسے بُرا سمجھتے ہوئے دوری اختیار کر لی۔ البتہ تھوڑے ذلیل و رذیل اشخاص نے اس کا کہنا مان لیا۔

۲۰۔ انھوں نے اس کی سفید فوج پر حملہ کیا اور گردشِ تقدیر سے شکست کھا گئے، جیسے بکریاں، بھیڑیئے اور شیر سے دور بھاگتی ہیں یہی ان کا بھی حال ہوا۔

۲۱۔ پھر اس نے ہندوؤں میں سے جاٹ، ٹھاکروں کو اپنی مدد کے لئے جمع کیا۔

۲۲۔ اور بعض مدعیانِ اسلام کو بھی ساتھ لے لیا۔ وہ دھوکے میں آ کر مدد کے لئے آمادہ ہو گئے۔

۲۳۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں پر حملہ کر کے زیادتی سے کام لیا۔ اور اپنے مقابل لوگوں سے پوری طرح تیاری سے پیش آ کر بڑا ظلم کیا۔

۲۴۔ ان سب نے دشمن کی مدد کے لئے بہت سا سامانِ جنگ اور بے شمار لشکر اکٹھا کیا۔

۲۵۔ پھر اس ملکہ نے پہاڑیوں سے مدد لی۔ انھوں نے پوری رغبت اور بہادری سے مدد کی۔

۲۶۔ اس نے محاربوں اور دشمنوں کی امان کے اشتہارات جاری کیے۔

۲۷۔ کہ بچوں، عورتوں اور قیدیوں کے قاتلوں کے سوا ان سب کو امان ہے۔

۲۸۔ جنھوں نے صلح کی۔ آلاتِ حرب اس ملکہ کے عاملوں کے سپرد کر دیے اور فرماں برداروں کی طرح اطاعت گذار بن گئے۔

۲۹۔ اس نے تمام دہقانیوں کو لالچ دیا۔ جس کی وجہ سے اکثر دیہاتی اور بادیہ نشیں اس کے مطیع ہو گئے۔

۳۰۔ ان سب کی مدد نے ان کو مسلط و غالب کر دیا جب کہ ہر پستی و بلندی پر ان کی مدد کی۔

۳۱۔ انھوں نے شہروں پر غارت گری کے ذریعہ قبضہ کر لیا۔ اور ان کے آثار و نشانات بھی باقی نہ چھوڑے۔

۳۲۔ وہ بلند اور پست مقامات پر پہنچے اور قتل، لوٹ مار، اور سارے علاقہ میں فتنہ و فساد پیدا کر دیا۔

۳۳۔ عبادت گاہوں کو منہدم اور مسجدوں کو مسمار کر دیا۔ خدا کے بندوں کو قتل کیا اور عابدوں کی ہلاکت میں حد سے تجاوز کر گئے۔

۳۴۔ جن لوگوں نے اس ملکہ کی اطاعت نہ کی تھی ان پر ایسی بزدلی چھائی تھی کہ نہ اپنے سردار کا حکم مانتے تھے اور نہ حاکم کی بات سنتے تھے۔

۳۵۔ ان میں سے ایک فریق کو فقر و فاقہ نے جنگ سے تھکا دیا تھا۔ اور دوسرے گروہ کو بزدلی نے پاؤں توڑ کر بٹھا دیا تھا۔

۳۶۔ جب ملکہ نے دیکھا کہ کوئی جنگ کا خواستگار دشمن، باغی اور سرکش باقی نہیں رہا۔

۳۷۔ تو اپنے قول سے پھر گئی اور دشمنی پر اتر آئی۔ کوئی اپنا وعدہ پورا نہ کیا اور عہد و میثاق کی رسیوں کو کاٹ دیا۔

۳۸۔ پہلے وعدہ کر کے لوگوں کو آرزومند بنا دیا۔ پھر عداوت و ظلم سے کام لیا۔ دراصل اس کا وعدہ، وعید کے لئے مکر تھا۔

۳۹۔ اس کافرہ کے جھوٹے وعدوں اور قسموں سے دھوکے میں پڑ کر میں بھی اپنے اہل و عیال کی طرف لوٹ آیا۔

۴۰۔ ہمارے ساتھیوں میں دوسرے روپوش لوگ بھی واپس آگئے۔ مگر نصاریٰ نے صرف مجھی کو قید میں ڈال دیا۔

۴۱۔ وہ مجھے قید خانے کھینچ کر لے گئے اور ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں بندھے ہوئے درماندہ و شکستہ دل قیدیوں میں شامل کردیا۔

۴۲۔ وہ بڑے جفاکش قیدی تھے۔ قید خانہ کے دربانوں اور نگہبانوں کی بے انتہا سختی اور ان کے مزاج کی تیزی برداشت کرتے تھے۔

۴۳۔ بدخواہ اور درشت مزاج نگہبانوں کی محنت و مشقت نے ان کے بدن پر کھال نہ چھوڑی تھی اور جلاّد کے کوڑوں نے بدن کی کھال پھاڑ دی تھی۔

۴۴۔ دشمنوں کی جماعت نے دشمنوں کو اور مجھے جمع کردیا اور میرے اعضا اور بازوؤں کو جدا کردیا۔

۴۵۔ جن لوگوں سے مجھے امیدیں تھیں وہ اِعراض کر گئے اور میرے دوستوں اور ساتھیوں کو مجھ سے علیحدہ رکھا گیا۔

۴۶۔ میرے اور اعزّہ کے درمیان جدائی حائل ہوگئی۔ اور اولاد و احفاد کے فراق نے مجھے غم میں ڈال دیا۔

۴۷۔ میں غمگین وحزیں جیل میں پہنچادیا گیا۔ میرے پاس میرا کوئی رفیق، باورچی، یا خدمت گار بھی نہ چھوڑا گیا۔

۴۸۔ میرا عمدہ لباس اتار کر قیدیوں کے کپڑے پہنا دیے۔ میرا توشہ اور کپڑے چھین لیے۔

۴۹۔ انھوں نے سخت، موٹا اور چبھنے والا بستر ایسے راحت پسند شخص کو سونے کے لئے دیا جو نرم بستر کا عادی تھا۔

۵۰۔ میں نے پیاس کی شدت کی شکایت کی تو گرم اور کھاری پانی پلایا۔ اور ایسی غذائیں مہیا کیں جن کا میں کبھی عادی نہ تھا۔

۵۱۔ میرے قید کرنے پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ اس کے ساتھ جلاوطنی، مسافرت اور اہل وطن سے دوری کا بھی اضافہ کردیا۔

۵۲۔ مجھے اور دوسرے قیدیوں کو جہاز پر سوار کر کے لے چلے اور وہ جہاز سمندر کی موجوں سے

ہچکولے کھاتا چلتا تھا۔

۵۳۔ اور مجھے ان قیدیوں کے ساتھ ایک دور دراز پہاڑی پر اتار دیا جہاں قصد کرنے والوں کا وہم وگمان بھی نہ پہنچتا تھا۔

۵۴۔ ہمارے قید کرنے والے نے ہم پر ظلم روا رکھ کر ہماری دید سے لوگوں کو محروم کردیا۔ اور ہمارے درمیان ایسے سمندر کا کنارہ حائل ہوگیا جس میں پانی کے جوش سے جھاگ پیدا ہوتے تھے۔

۵۵۔ وہاں کی ہوائیں اپنی خرابی کی وجہ سے جان نکال لیتی تھیں۔ وہ اس ہلاکت خیز آندھی کی طرح تھیں جو قومِ عاد پر اس سے قبل بھیجی جاچکی تھیں۔

۵۶۔ اس میں آرزوئیں پامال، اور موت عام تھی۔ اور کسی میت کے لئے دفن وقبر کا کوئی انتظام نہ تھا۔

۵۷۔ غموں کے بادل قسم قسم کے رنج والم برساتے رہتے ہیں اور وہ بادل صبح وشام اور شب کو آتے جاتے رہتے ہیں۔

۵۸۔ وہاں کبھی دن میں سورج کی روشنی نظر آتی ہے نہ چمکنے والے چاند اور تاروں کی رات میں چمک۔

۵۹۔ میرا دن، رات کی طرح ہے۔ اور میری رات کو دوام ہے۔ آسمان پر ستارے ایسے رکے ہوئے ہیں جیسے میخوں میں انھیں باندھ دیا گیا ہو۔

۶۰۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہماری تاریک راتیں، روشن دن کی طرح تھیں۔ اور ہمارے دن عید کے دن تھے۔

۶۱۔ میری رہائی کے لئے کیا حیلہ ہوسکتا ہے؟ جو زمین میرا بار اٹھائے ہوئے ہے اس کے سارے راستے مسدود ہیں۔

۶۲۔ مجھے چھٹکارا کیسے نصیب ہوسکتا ہے؟ میرا دشمن ظالم و بدخو ہے۔ اس کافر کی خرابی ہو جو خدا کا بھی منکر ہے۔

۶۳۔ مجھے تکلیف پہنچانے کے لئے نصاریٰ نے ایسے زندیقوں کو آمادہ کیا جو ان کے مقرب ہیں اور وہ بھی جن سے ان کے الحاد کی وجہ سے محبت کرتے ہیں۔

۶۴۔ وہ غصے میں آپے سے باہر ہوگئے اور میری اذیت رسانی میں ہر ممکن جد و جہد سے کام لیا۔
پوری پوری دشمنی برتی اور بغض و کینہ کا کھلا مظاہرہ کیا۔

۶۵۔ اپنی تدبیروں کے انقطاع پر میں ناامید و مایوس ہوگیا اور شکاری کے جال میں پھنسے ہوئے
پرندہ کی طرح حیران و پریشان۔

۶۶۔ میری حالت اس ہرن سے مشابہ تھی جو شکاری کی لکڑی سے موقع شکار کے خوف سے
مصالحت کر بیٹھا ہو۔

۶۷۔ میں نے چند لوگوں سے ان قحط زدہ اشخاص کی سی امید باندھی جو ایسے بادلوں سے جو گرج
اور چمک کر چھٹ گئے ہوں، امیدیں باندھ لیتے ہیں۔

۶۸۔ میں نے خدا کے سوا سب سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اس کے سوا کسی دوسرے سے بخشش و
امداد کی امید نہیں ہے۔

۶۹۔ اس بادشاہ عادل کی رحمت کا ہی میں امیدوار ہوں، جس کا ذکر میرا حرزِ جاں اور میرا ورد ہے۔

۷۰۔ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا، حیا رکھنے والا اور پکارنے والوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنے
والا ہے۔ ہلاکت زدہ اور مظلوم و مضطر کی دعا رد نہیں کرتا۔

۷۱۔ وہ کمزور قیدیوں کو ایسے جابر، متکبر اور سخت انسانوں سے نجات دلاتا ہے جو وادی میں پتھروں
کو کاٹنے والے ہیں۔

۷۲۔ وہ فرعون و شداد جیسے سخت و جابر بادشاہوں پر کمزور عاجزوں کو مسلط کر دیتا ہے۔

۷۳۔ اس مصیبت زدہ کے لئے جس کا کوئی حیلہ وسیلہ نہ ہو اور جس کی رہائی کے لئے نہ کوئی فدیہ
ہو اور نہ احسان، خدا کے سوا کون چارہ ساز ہے؟

۷۴۔ اے پروردگار! اس عاجز وخستہ کو ستودہ وصفات احمد محمود وحماد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طفیل
میں کافر دشمنوں کے چنگل سے نکال۔

۷۵۔ تو نے انھیں تمام مخلوق کی طرف اس کی رہبری وہدایت اور عطا واعانت کے لئے رحمتِ عالم
بنا کر بھیجا ہے۔

۷۶۔ وہ مصیبت وعذاب روکنے کے لئے پکارنے والوں کے فریادرس، روز قیامت میں ہماری
پناہ گاہ اور مجلس میں بڑے سخی وجواد ہیں۔

۷۷۔ وہ گمراہ کے لئے ہادی، نابینا کے حامی، فریادی کے مددگار، سفارش چاہنے والے کے شفیع،
اور سائل کو عطیات سے نوازنے والے ہیں۔

۷۸۔ ظلم سے شاکی پڑوسی کے محافظ ہیں۔ امداد چاہنے والے کے معاون اور طالب عطا کے لئے سخی ہیں۔

۷۹۔ وہ خوشخبری سنانے والے ہادی ہیں۔ راہبوں نے ان کی آمد کی اطلاع حالتِ خوف میں
پہنچائی۔ اور اسی طرح یہود نے۔

۸۰۔ انھوں نے ہر گم کردہ راہ کو سیدھا راستہ بتایا۔ اور ہر ٹیڑھے کو سیدھا کر دیا۔

۸۱۔ غمگین کے فریادرس، طالب بارش کے لئے بادل، گھاٹ پر آنے والوں کے لئے دریا، چارہ
اور پانی کے متلاشی کے لئے (سرسبز) میدان ہیں۔

۸۲۔ وہ دریا ہیں۔ ان کی شریعت روشن اور صاف ہے جس کے احکام پیاسوں کے لئے شیریں
چشمہ ہیں۔

۸۳۔ وہ بڑے نیک اور سخی ہیں۔ بھوکوں کو ان کی انگلیاں پیٹ بھرتی ہیں۔ جب انگلیاں سخاوت
پر آتی ہیں تو تشنہ لبوں کی پیاس پر غالب آجاتی ہیں۔

۸۴۔ آدم علیہ السلام کی بزرگی میں ان کی وجہ سے اضافہ ہوا تو تعجب کیوں ہے؟ بہت سے آباو
اَجداد نے اپنی اولاد کے مجد و شرف کے باعث بلند مرتبہ پالیا ہے۔

۸۵۔ وہ خاتم النبین ہیں۔ نبیوں میں سب سے اول و افضل ہیں۔ مخلوق میں اولیت کا شرف انھیں
کو حاصل ہے، اور انھیں کی روشنی سب سے پہلی ایجاد ہے۔

۸۶۔ ان کا دین تمام دینوں کا ناسخ اور رہتی دنیا تک رہنے والا ہے۔

۸۷۔ انھوں نے حکمت والی مضبوط اور فیصلہ کن کتاب کی تلاوت کی۔ وہ کتاب متلاشی حق کے حق
میں اور شکی کے خلاف فیصلہ صادر کرتی ہے۔

۸۸۔ رسولوں نے ان کے امتی بننے کی خدا کی بارگاہ میں دعا کی۔ روایات میں اسناد کے ساتھ اس
کا تذکرہ موجود ہے۔

۸۹۔ انھوں نے امت وسط، شاہد عادل (امت محمدیہ) میں شمار ہونے کی دعا کی جو کہ تمام سابقہ
امتوں پر قیامت کے دن گواہ بنے گی۔

۹۰۔ ان میں سے بہت کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ اور بعض اپنی مراد کو پہنچے۔

۹۱۔ کس قدر قابل عظمت ہے ان کی شریف، بزرگ، نجیب اور بلند رتبہ اولاد۔

۹۲۔ ان کے صحابہ نے دین کے لئے جہاد کیا۔ معاونت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور اس سلسلہ میں طرح طرح کی کوششیں کیں۔

۹۳۔ اے مخلوق کے سردار! اور اخلاق میں سب سے بلند و بہتر! امیدوں کے بہترین سہارے! اور تمام اہل سخاوت سے بلند مرتبہ رکھنے والے!

۹۴۔ میں آپ پر قربان! مجھ پر رحم فرمایئے اور مجھے بخشش سے نوازیئے۔ اپنی عطا سے میری مشقتوں اور غموں کی تلافی کیجیے۔ اے جود و عطا کے مالک!

۹۵۔ مجھ پر رحم کرتے ہوئے خدا سے میری سفارش کیجیے کہ مجھے جلا وطنی اور قیدِ تنہائی کی مصیبت و آزمائش سے نجات دے۔

۹۶۔ اور جلد سے جلد میری ان پریشانیوں اور اذیتوں کو دور کرے جو حد و شمار سے متجاوز ہو چکی ہیں۔

۹۷۔ اور مجھے عجلت کے ساتھ اپنی عافیت میں لے اور میرے غم کو سرور اور شقاوت کو سعادت سے بدل دے۔

۹۸۔ اے میرے محافظ و رہنما! اس بات کی بھی دعا کیجیے کہ خدا میری موت آپ کی اقامت گاہ کے جوار میں شہادت کی موت مقدر کر دے۔

۹۹۔ میں آپ کو خدا کی قسم دلاتا ہوں۔ اپنے کرم سے میری مدح و ستائش قبول فرمایئے تاکہ اشعار خوانی کی بدولت میں اپنی مراد کو پہنچوں۔

۱۰۰۔ آپ پر اللہ کی پاکیزہ رحمتیں نازل ہوتی رہیں جب تک سرسبز و شاداب مرغزاروں میں قمریوں کی آوازیں گونجتی رہیں اور گانے والے گاتے رہیں۔

....

علامہ فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمہ نے آخر میں تحریر فرمایا:

”یہ دونوں قصیدے رجب ۱۲۷۶ھ میں بحالت ”اسیری جزیرہَ وبائی“ تمام ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت وسیعہ اور قدرت بدیعہ سے اپنے حبیب اور اس کی آل اطہار اور اولاد امجاد کے طفیل اس وبائی جزیرہ سے نجات دے۔ ان سب پر اللہ کی روشن نعمتیں اور پاکیزہ رحمتیں نازل ہوں۔ آمین

سربرآوردہ علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء

ایسٹ انڈیا کمپنی سے وابستہ انگریز تاجروں اور سیاسی شاطروں کے خلاف ہندوستان کے اندر عوامی ناراضی کا بڑھتا ہوا طوفان انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول کی ہر دہائی میں جگہ جگہ اور بار بار اٹھتا رہا اور انھیں اپنی حکمت عملی اور اپنی طاقت وقوت کے ذریعہ انگریز دباتے اور ہر عوامی اقدام کو اپنی سازش اور جارحیت کی بدولت کچلتے رہے۔ اسباب انقلاب ۱۸۵۷ء پر بحث کرتے ہوئے مؤرخین نے کئی طرح کی رائیں ظاہر کی ہیں۔

نجم الغنی خاں رام پوری لکھتے ہیں کہ بعض مؤرخین کے خیال میں ایک شہزادہ کے خیمے سے ایک طویل اشتہار ملا۔ جس میں پانچ باتوں پر بہت زور دیا گیا تھا۔ ان باتوں میں پہلی اور پانچویں بات اس طرح تھی۔

”اول: حکومت انگلشیہ کے قبض و تصرفِ ہندوستان سے بوجہ اس کی بدعہدی اور فریبوں کے عام مسلمانانِ ہند کے واسطے ایمان کا خوف ہے۔

پانچویں: عام آگہی اس امر کی کہ انگریزوں نے جو رخنہ دین محمدی میں ڈالا ہے اس کے دفعیہ کے واسطے یہ کوشش ہے۔ (ص ۲۸۔ اخبار الصنادید جلد دوم)

”بعض کہتے ہیں کہ شاہ اودھ اس فساد کا باعث ہوئے اور اپنی معزولی کے بعد انھوں نے عام طبیعتوں میں شورش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور شاہِ دلی سے اس قسم کے رسل و رسائل جاری کر کے مفسدہ پردازی کرائی۔ (ص ۲۹۔ اخبار الصنادید جلد دوم)

”ہم جب اسبابِ غدر پر غور کرتے ہیں تو اس وقت سوائے اس کے اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس عام ناچاقی اور بددلی کی وجہ حکومت انگلشیہ کی وہ حکمت عملی تھی جس نے بہت سے والیانِ ریاست کو خاک میں ملا دیا۔

لارڈ ڈلہوزی نے گو یہ عمدہ کارروائی اپنے نزدیک سمجھی ہو لیکن تمدنی اصول سے یہ کارروائی

ناقص معلوم ہوتی ہے۔الخ (ص۲۹۔اخبار الصنادید جلد دوم)

پانچویں دہائی میں حالات قابو سے باہر ہونے لگے اور کسی بڑے خطرے کا احساس شدت کے ساتھ انگریزوں کو ہوا۔ چنانچہ فروری ۱۸۵۶ء میں لارڈ ڈلہوزی نے کہا تھا کہ:

''سرکشی اور بغاوت زمینی بخارات اور بھاپ کی طرح اٹھ سکتی ہے اور تمام جنگوں سے زیادہ ظلم وتشدد میں وہ لوگ بتلا ہو سکتے ہیں جو عین اس دن جس دن ان کے خون میں ابال آیا، نہایت معصوم، بے ضرر اور بودے نظر آتے رہے ہوں۔

Fraser: British India, 273. (ص۲۰۰۔تاریخ جنگ آزادیِ ہند ۱۸۵۷ء۔ مؤلفہ سید خورشید مصطفیٰ رضوی۔ مطبوعہ رضا لائبریری رام پور، یوپی، بار اول ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء)

۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے نئے کارتوس کی ایجاد کر کے ڈم ڈم (کلکتہ) انبالہ اور سیالکوٹ کی فوجی چھاؤنیوں میں ہندوستانی فوجیوں کو اس کے استعمال کی ٹریننگ دی اور ۱۸۵۷ء میں یہ کارتوس ہر جگہ رائج ہو گئے۔ ۲۲رجنوری ۱۸۵۷ء کو ڈم ڈم کے ہندوستانی فوجیوں نے اس پر سخت اعتراض کیا کہ گائے اور سور کی چربی کی آمیزش سے تیار شدہ یہ کارتوس ہمارے مذہبی جذبات کو مجروح کر رہے ہیں۔ رانی پور اور بارک پور (کلکتہ) اور برہام پور (مرشد آباد) میں بھی ایسا ہی ہوا۔ مگر انگریز فوجی افسروں نے اس احتجاج پر توجہ نہیں دی۔ ۲۹رمارچ (۱۸۵۷ء) کو غازی پور (موجودہ مشرقی یوپی) کے منگل پانڈے نے مشتعل ہو کر ایک انگریز سارجنٹ میجر کو گولی مار دی جس کی پاداش میں اسے ۸راپریل کو پھانسی دے دی گئی۔

یکم مئی (۱۸۵۷ء) کو لکھنؤ کے ہندوستانی فوجیوں نے کارتوس لینے سے انکار کر دیا۔ اودھ کے دوسرے علاقوں میں بھی بے چینی پھیل گئی۔ ۲۴راپریل کو پچاسی ہندوستانی فوجیوں نے میرٹھ میں یہ کارتوس دانت سے کاٹنے سے انکار کیا اور انگریز افسروں نے طیش میں آ کر انھیں دس دس سال کی سزا سنادی۔ ۹رمئی کو ان پچاسی فوجیوں کو پریڈ میدان میرٹھ میں جمع کر کے ان کی توہین وتذلیل کی گئی۔ ان کی وردیاں پھاڑ کر انھیں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا دی گئیں پھر انھیں جیل بھیج دیا گیا۔ دوسرے ہندوستانی فوجی جب اپنے گھر اور بازاروں کی طرف نکلے تو عورتوں نے انھیں طعنہ دیا کہ تم مرد نہیں ہو۔ لو یہ چوڑیاں پہن لو اور ہتھیار ہمیں دو۔ ہم اپنے ہندوستانی فوجیوں کو چھڑا کر لائیں گی۔

ہندوستانی فوجی خود ہی غصہ میں تلملا رہے تھے۔ عورتوں کے طعنے سن کر وہ بھڑک اٹھے اور ۱۰رمئی کو میرٹھ میں بغاوت کر کے جیل سے اپنے ساتھیوں کو چھڑا لائے۔ انگریزوں کو پکڑ پکڑ کر مارنا شروع کیا۔ راتوں رات چل کر ۱۱رمئی کی صبح کو دلی پہنچ گئے۔ یہاں بہادر شاہ ظفر سے ملے اور اس کی بادشاہی کا اعلان کر کے یہاں بھی انگریزوں کا قتل عام کیا۔ دلی کے انقلابی بھی ان کے ساتھ مل گئے اور پھر ہر طرف انگریزوں اور ہندوستانیوں میں جنگ ہونے لگی۔

یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوا بلکہ اس کے اسباب بہت پہلے ہی پیدا ہو چکے تھے۔ مسٹر ایس ایم گھوش سکریٹری فریڈم ہسٹری بورڈ ۱۶ردسمبر ۱۹۵۳ء کی اپنی ایک تقریر میں کہتے ہیں:

''جو حالات فراہم کیے گئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی اچانک یا الگ تھلگ واقعہ نہیں تھا بلکہ ملک بھر کے لیڈر ملک کو آزاد کرانے کے لئے یک جا ہو گئے تھے۔ غیر ملکی حکمرانوں کو نکالنے کی یہ پہلی منظم کوشش تھی۔ تحریک کا مقصد یہ تھا کہ سارے ملک کو آزاد کر کے ایک خود مختار حکومت قائم کی جائے جس کا حاکم اعلیٰ بہادر شاہ ہو۔ (ص۴۹۔تاریخ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء مؤلفہ خورشید مصطفیٰ رضوی)

پی سی جوشی لکھتے ہیں:

''میرٹھ کے باغیوں نے ہندوستان کے صدیوں پرانے پایۂ تخت دہلی کی طرف تیزی سے یلغار کی۔ وہ بلا کسی مزاحمت کے دہلی دروازہ سے داخل ہوئے۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا محاصرہ کیا اور اس کے شہنشاہ ہندوستان ہونے کا اعلان کیا۔ (ص۳۸۔انقلاب ۱۸۵۷ء۔ مؤلفہ پی سی جوشی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ طبع سوم ۱۹۹۸ء)

دس ممتاز اعلیٰ فوجی آفیسروں وعوامی نمائندوں پر مشتمل مجلس انتظامی کی تشکیل اور قانونی دفعات کا ذکر گذشتہ صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ جس کا خاکہ اور بنیادی ڈھانچہ علامہ فضل حق خیر آبادی نے تیار کیا تھا۔ اس سلسلے میں متعدد تاریخی کتب کے حوالوں سے پی سی جوشی مزید لکھتے ہیں:

''۱۱رمئی ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ کے شہنشاہ ہند ہونے کا اعلان کر دیا تھا لیکن درحقیقت جولائی کے

رہ گئی۔ جنرل بخت خاں کے پہنچنے کے بعد دہلی کے پہلے ہفتے میں ہی اس کی حیثیت برائے نام رہ گئی۔ جنرل بخت خاں کے پہنچنے کے بعد دہلی کے باغیوں نے ایک پروانہ جاری کیا جس میں نئی حکومت کی ترکیب کا خاکہ دیا گیا تھا۔ بہادر شاہ کے ہندوستان کے شہنشاہ ہونے کا دوبارہ رسمی طور پر اعلان کیا گیا لیکن اصلی قوت مجلس انتظامیہ کو سونپی گئی۔ مجلس کا کام حکومت کا انتظام کرنا، امن وامان قائم رکھنا، تحصیلوں سے لگانِ آراضی وصول کرنا، مہاجنوں سے قرضے لینا، سلطنت کی حفاظت کرنا اور جنگ کا انتظام کرنا تھا۔

بادشاہ نے مجلس سے یہ وعدہ کیا کہ ——— ''مجلس سے متعلق کسی بھی جماعت کی یادداشت پر غور نہیں کیا جائے گا۔ اور ان تمام احکام میں جو مجلس سے صادر ہوں گے حکومت کا کوئی ملازم یا شہزادہ کسی طور مداخلت نہیں کرے گا۔ (ص ۴۵۔ انقلاب ۱۸۵۷ء مؤلفہ پی سی جوشی)

''ایسی ہی مجلس انتظامیہ لکھنؤ میں بھی قائم کی گئی تھی۔ دہلی کی طرح لکھنؤ کے باغیوں نے بھی اودھ کے سابق نواب کے حقیقی بیٹے برجیس قدر کو تاج پہنایا۔ اس کے تخت نشیں ہونے اور نواب وزیر اودھ بننے کے بعد۔ کیوں کہ اس کی حکومت شہنشاہ دہلی کے تحت تھی۔ اختیارات کی باگ ڈور اس کی ماں (بیگم حضرت محل) اور مُمّو خاں کے ہاتھ میں تھی اور یہ دونوں فوجیوں کے رحم وکرم پر تھے۔ انھیں کی وجہ سے یہ برسر اقتدار تھے۔ (ص ۵۰۔ انقلاب ۱۸۵۷ء مؤلفہ پی سی جوشی)

ڈاکٹر آر۔ سی۔ مجمدار اپنی تحقیق مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ ختم کرتے ہیں:

''۱۸۵۷ء کی شورش ہندوستان میں برطانوی حکومت کے لئے وسیع پیمانے پر پہلی بڑی اور براہ راست چنوتی کی حیثیت سے ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہے گی۔ نصف صدی بعد شروع ہونے والی آزادی کی تحریک کو اسی تحریک سے روشنی ملی۔ ۵۸۔۱۸۵۷ء کی یاد نے ہماری آزادی کی تحریک کو تقویت دی۔ اس کے مجاہدین کے دلوں میں ہمت کی روح پھونکی۔ خوفناک جدوجہد کے لئے ایک تاریخی بنیاد فراہم کی۔ اور اسے ایک ایسا اخلاقی محرک عطا کیا جس کی وقعت میں مبالغہ کرنا ممکن نہیں۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی یاد نے، جس کی عظمت غلط بیانیوں کے باوجود بڑھتی گئی، ہندوستان میں برطانوی حکومت کے مفاد کو جتنا نقصان پہنچایا اتنا خود بغاوت سے بھی نہ پہنچا ہوگا۔'' (ص ۱۴۰۔ انقلاب ۱۸۵۷ء مؤلفہ پی سی جوشی)

انگریزوں کے مظالم اور ان کی چیرہ دستیوں سے مسلمان اور ہندو سب کے سب نالاں تھے۔ اس صنعتی وزراعتی ملک کی رگوں سے خون چوس کر جس طرح انگریز اپنے انگلستان کو مالا مال کر رہے

تھے اور خصوصیت کے ساتھ بنگال کو انھوں نے کنگال بنا ڈالا تھا جس کی وجہ سے ہندوستانیوں کے دل انگریز دشمنی کی آماجگاہ بن گئے تھے۔ ہندوستانی نوابوں، راجاؤں، زمینداروں، تاجروں اور شرفا کو ذلیل کرنا انگریزوں کا معمول بن گیا تھا۔ اور جب انھوں نے ان کے مذہب پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اسی کے نتیجے میں انقلاب ۱۸۵۷ء رونما ہوا جس میں مسلمانوں کے مذہبی پیشوا وقائدین پیش پیش تھے۔ بہادر شاہ ظفر، جنرل بخت خاں روہیلہ، خان بہادر خاں روہیلہ (فرزند ذوالفقار خاں فرزند حافظ رحمت خاں روہیلہ) شہزادہ فیروز شاہ، بیگم حضرت محل، جنرل عظیم اللہ خاں، جنرل غوث محمد خاں، نواب تفضل حسین خاں، نواب مجدالدین عرف مجو خاں مرادآبادی، نواب محمود خاں بجنوری جیسے مسلم قائدین اس انقلاب کو کامیاب بنانے میں شب وروز اپنی عملی توانائیاں صرف کر رہے تھے۔ انگریزوں کے خلاف چوں کہ مسلمانوں کے اندر جوش وخروش زیادہ تھا اور انھوں نے اپنی جان ومال کا نذرانہ بڑھ چڑھ کر پیش کیا اسی لئے وہ انقلاب کی ناکامی کے بعد انگریزی مظالم کے زیادہ شکار ہوئے۔

میجر ایف، جے، ہیریٹ ڈپٹی ایڈوکیٹ جنرل برائے سماعتِ مقدمۂ بہادر شاہ ظفر کا بیان ہے کہ

''ان مقدمات کی انتہائی معنی خیز حقیقت یہ ہے کہ جہاں کہیں ہم نے تفتیش کی ہے مسلمانوں میں سازش کے آثار پائے جاتے ہیں لیکن ایک بھی ایسی دستاویز ہاتھ نہیں لگی جس سے ظاہر ہو کہ ہندو بحیثیت فرقے کے ہمارے خلاف سازش کرتے رہے ہیں یا برہمنوں اور پجاریوں نے عیسائیوں کے خلاف جہاد کا پرچار کیا ہو۔

...... مسلمان ملا نظر باطنی کے اور فرضی قوتِ معجزہ کے جھوٹے دعویدار، مسلمان بادشاہ ان کے فریب میں پھنسے ہوئے لوگ اور شریک جرم...... ترکی اور ایران کی مسلمان حکومتوں میں مسلمان خفیہ سفارش خانے ...... مسلمانوں کی طرف سے ہمارے اقتدار کے زوال کی پیش گوئیاں...... ہماری حکومت کی وارث مسلم سرکار...... مسلمان قاتلوں کے ہاتھوں سفاکانہ قتل...... اسلامی غلبہ کے لئے جہاد...... اور بغاوت کے بانی مسلمان سپاہی۔ غرض کہ ہندوؤں کا کہیں بھی عمل دخل ظاہر نہیں ہوتا اور اگر کہیں شاذ ونادر ہوتا بھی ہے تو اپنے جنگ جو ہمسایہ کی زیر ہدایت محض ثانوی حیثیت سے۔
(ص ۳۵۔ انقلاب ۱۸۵۷ء۔ پی سی جوشی)

انقلاب ۱۸۵۷ء میں علما نے مذہبی فریضہ کے طور پر انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتاویٰ

Scanned by CamScanner

جاری کیے اور عملی طور پر بھی جنگ میں شریک ہوکر مجاہدین کے حوصلے بڑھائے اور انقلابیوں کی بھرپور قیادت کی جن میں علامہ فضل حق خیرآبادی، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، مولانا فیض احمد بدایونی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ مولانا مدراسی اپنے پیر و مرشد حضرت محراب شاہ قلندر گوالیاری کے حکم پر تقریباً ۱۸۴۶ء سے انگریزوں کے خلاف مہم چلا رہے تھے۔

دیگر مشہور علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء میں چند سربرآوردہ حضرات کے نام یہ ہیں۔ مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی، مولانا کفایت علی کافی مرادآبادی، مولانا وہاج الدین مرادآبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی، مولانا امام بخش صہبائی دہلوی۔

تاریخ انقلاب پر لکھی گئی کتابوں کے عام اندازہ کے مطابق لگ بھگ پندرہ ہزار علما اور کئی لاکھ مسلمان جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں شہید کیے گئے تھے۔

مذکورہ علما کو جن علما و مشائخِ سلف سے کسی نہ کسی شکل میں فکری و عملی رہنمائی ملی ان میں سے چند اہم نام درج ذیل ہیں:

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) (۲) حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں مجددی دہلوی (متوفی ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء) (۳) حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) (۴) حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی (متوفی ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء) (۵) حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء) (۶) حضرت مفتی محمد عوض بریلوی (متوفی ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء) (۷) حضرت مفتی شرف الدین رام پوری (متوفی ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء)

۲۰۰۷ء میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے ڈیڑھ سو سال پورے ہو رہے ہیں اور پورا ملک جنگ آزادی ۱۸۵۷ء جو صحیح معنوں میں عملی جنگ ہے اس کی یاد منا رہا ہے اور سارے ہندوستانی باشندے اپنے جاں باز انقلابیوں اور سرفروش مجاہدوں کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ اس تاریخی موقعہ پر ان چند مشاہیر علما کا نہایت اختصار و اجمال کے ساتھ آیندہ صفحات میں تعارف کرایا جا رہا ہے جن کی یاد سے ہماری روح میں تازگی و توانائی اور حرارت و تپش کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

....

(۱) مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی

مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی (متولد ۱۲۰۴ھ/ ۱۷۸۹ء۔ متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) کشمیری نسل کے دہلوی عالم و فاضل تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) اور علامہ فضل امام فاروقی خیرآبادی (متوفی ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۹ء) سے آپ نے تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۸۲۷ء سے ۱۸۴۶ء تک آپ دہلی کے صدر امین اور ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۷ء تک صدر الصدور رہے۔ انگریزی عہد حکومت میں دہلی کا صدر الصدور ہونا کسی مسلمان عالم کے لئے سب سے بڑا عہدہ تھا۔ آپ کا دولت کدہ دہلی کے علما و فضلا و ادبا و شعرا کا مرکز اور مرجع تھا۔ سر سید احمد خاں (متوفی ذوالقعدہ ۱۳۱۵ھ/ مارچ ۱۸۹۸ء) نے اپنی مشہور تاریخی کتاب ''آثار الصنادید'' (ص ۵۲۴) مطبوعہ دہلی میں آپ کو اپنے زمانے کا جامع الصفات عالم و فاضل لکھا ہے۔ حکیم عبدالحی رائے بریلوی (متوفی ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۳ء) سابق ناظم دارالعلوم ندوہ لکھنؤ لکھتے ہیں کہ ''مفتی صدر الدین خان بہادر، عالی خاندان، والا دودمان، سرمایۂ نازش ہندوستان، فضل و کمال اور فنونِ ادبیہ میں آپ اپنا جواب تھے۔'' (۲۲۷۔ گل رعنا مطبوعہ اعظم گڈھ)

پروفیسر محمد ایوب قادری (متوفی نومبر ۱۹۸۳ء کراچی) لکھتے ہیں:

''دہلی میں مفتی صدر الدین آزردہ کی امتیازی حیثیت تھی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں فتویٰ جہاد پر دستخط کیا۔ اس کی وجہ سے گرفتاری عزلِ منصب اور ضبطیِ جہاد کی نوبت پہنچی۔ چند ماہ کے بعد رہا ہوئے۔ نصف جائداد واگذاشت ہوئی۔ (ص ۲۴۸۔ تذکرۂ علمائے ہند، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی طبع اول۔ ۱۹۶۱ء)

۱۸۵۷ء میں علما نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا کئی بار اور کئی جگہ فتویٰ دیا تھا۔ ایک فتویٰ پر مفتی صدر الدین آزردہ کا دستخط ہے جو اخبار الظفر دہلی میں چھپا پھر اس کی نقل صادق الاخبار دہلی مورخہ ۲۶/ جولائی ۱۸۵۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ اخبار نیشنل آرکائیوز نئی دہلی میں محفوظ ہے۔ انقلاب کے دوران مفتی آزردہ لال قلعہ میں بہادر شاہ ظفر کے پاس آتے جاتے رہے اور انقلابی مجاہدین بھی آپ سے ہدایت حاصل کرنے آپ کے گھر آتے جاتے رہے (روزنامچہ منشی جیون

عبداللطیف مطبوعہ دہلی)
لال مطبوعہ دہلی وروزنامچہ
شاہجہانی جامع مسجد دہلی کے جنوب میں مغل بادشاہ شاہجہاں نے دارالبقا کے نام سے ایک
مدرسہ بنوایا تھا جو گردشِ زمانہ سے ویران ہوگیا تھا اسے مفتی صدرالدین آزردہ نے بہادر شاہ ظفر
سے لے کر آباد کیا اور تعلیم کا سلسلہ ازسرِ نو شروع کیا۔ (ص ۲۸۳۔ آثارالصنادید مؤلفہ سرسید)
مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) کے والد مولانا خیرالدین دہلوی (متوفی ۱۳۲۶ھ/
۱۹۰۸ء) اور دادا شیخ محمد ہادی دہلوی مفتی آزردہ کے شاگرد تھے۔ اسی طرح مفتی سعداللہ مرادآبادی،
مولانا فیض الحسن سہارن پوری، نواب یوسف علی خاں والی ریاست رام پور، نواب ضیاء الدین خاں
نیر، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولوی سمیع اللہ دہلوی، مولوی فقیر محمد جہلمی اور بعد کے ہونے والے اکابر
علمائے دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ آپ کے شاگرد ہیں۔ آپ نے کئی
کتابیں بھی لکھیں۔ عربی وفارسی کے علاوہ اردو زبان کے آپ بہترین شاعر تھے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء میں انگریز جب غالب آگئے تو آپ کے خلاف مقدمۂ بغاوت چلا۔
بڑی کوشش پیروی اور قید وبند کے بعد کسی طرح آپ کو نجات ملی۔ مگر جائداد کا بڑا حصہ ضبط ہوگیا۔
اپنے ذاتی سرمایہ سے آپ نے تین لاکھ روپے کی نہایت اہم اور نادر کتابیں اپنی ذاتی لائبریری
میں جمع کی تھیں جو انقلاب کے دوران ضائع ہوگئیں۔

جامع مسجد دہلی کو انگریزوں نے انقلاب کی ناکامی کے بعد قبضہ کرکے اسے اصطبل بنادیا
تھا۔ مفتی آزردہ نے عمایدِ شہر کے ساتھ مل کر اس کی واگذاری کی مسلسل کوشش کی جس کے نتیجے میں
نومبر ۱۸۶۳ء میں ایک معاہدہ کے تحت انگریزوں نے اسے واگذار کیا۔ (ص ۴۸۔ غدر کے چند علما
مؤلفہ انتظام اللہ شہابی مطبوعہ دہلی)۔ مکاتیب غالب میں بھی مسجد کی واگذاری کا ذکر ہے۔

مفتی آزردہ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ تقریباً ۱۸۴۶ء میں انھوں نے اپنے خط کے ساتھ
مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی (متوفی ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) کو آگرہ بھیجا جہاں انھوں نے ''مجلس علما''
قائم کرکے انگریزوں سے ہندوستان کو پاک کرنے کی مسلسل تحریک چلائی اور انقلاب ۱۸۵۷ء
میں ان علما نے مختلف محاذ پر انگریزوں سے جم کر مقابلہ کیا۔

اکیاسی سال کی عمر میں ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ/ ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء میں دہلی کے اندر مفتی
آزردہ کا انتقال ہوا اور چراغ دہلی میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔

(۲) علامہ فضل حق خیرآبادی

علامہ فضل حق خیرآبادی (متولد ۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء۔ متوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) فرزند علامہ فضل
امام فاروقی خیرآبادی صدر الصدور دلی (متوفی ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۹ء) علوم اسلامیہ میں شاہ عبدالقادر
محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۵ء) وشاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء)
اور علوم عقلیہ میں اپنے نامور والد ماجد کے شاگرد تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں تکمیل علوم وفنون کے
بعد درس وتدریس میں مصروف ہوئے اور ۱۸۱۵ء میں سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔

حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) نبیرۂ حکیم سید برکات احمد ٹونکی (متوفی ۱۳۴۷ھ/
۱۹۲۸ء) نہایت اختصار کے ساتھ آپ کا تعارف اس طرح تحریر کرتے ہیں:

''ولادت ۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء فراغتِ درس (بعمر ۱۳ سال) ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء
ملازمت کمپنی ۱۲۳۱/ ۱۸۱۶ سے کچھ قبل۔ ولادت فرزند گرامی (مولانا
عبدالحق) ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۸ء۔ ولادت فرزند (علاء الحق) ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۰ء۔
وفات والد ماجد (مولانا فضلِ امام خیرآبادی) ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۹ء۔ کمپنی کی
ملازمت (سررشتہ داری عدالت دیوانی دہلی) سے استعفاء ۱۲۴۵ھ/
۱۸۳۱ء کے اواخر میں۔ ملازمت ریاست جھجر میں ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۲ء۔ پھر
چند سال الور، سہارن پور اور ٹونک میں قیام کے بعد ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء سے
۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۸ء تک ریاست رام پور میں قیام (محکمۂ نظامت اور مرافعۂ
عدالتین کے حاکم کی حیثیت سے) ۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۸ء سے ۱۲۷۲ھ/
۱۸۵۶ء کے اوائل تک لکھنؤ میں قیام (کچہری حضور تحصیل کے مہتمم اور

صدر الصدور کی حیثیت سے) ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء کے ابتدائی مہینوں میں الور تشریف لے آئے اور رمضان ۱۲۷۳ھ/مئی ۱۸۵۷ء میں سن ستاون کی جنگِ آزادی کے آغاز پر دہلی تشریف لے آئے اور پورے ڈیڑھ سال (مئی ۱۸۵۷ء سے دسمبر ۱۸۵۸ء) تک دہلی اور اودھ کے مختلف اضلاع میں مجاہدین حریت کی رفاقت، اعانت اور قیادت فرماتے رہے۔ جنوری ۱۸۵۹ء میں گرفتار کر لئے گئے۔ مقدمہ چلا اور جرم ثابت ہونے پر تمام زرعی اور مسکونہ جائداد اور ذخیرۂ نوادر کتب خانے کی ضبطی اور حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا سنادی گئی۔ اکتوبر ۱۸۵۹ء میں پورٹ بلیئر (جزائر انڈمان) پہنچا دیئے گئے جہاں ۱۲ر صفر ۱۲۷۸ھ/ اگست ۱۹۶۱ء کو ۶۶ سال کی عمر میں وصال ہوا۔ (ص ۲۰ و ۲۱۔ فضل حق اور ۱۸۵۷ء مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی)

نواب فیض محمد خاں والیِ ریاستِ جھجھر (پنجاب) کی دعوت پر جب آپ ۱۸۳۱ء میں دہلی چھوڑ کر جھجھر جانے لگے تو بہادر شاہ ظفر نے نہایت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اپنا ایک دوشالہ آپ کو اڑھا کر پرنم آنکھوں سے وداع کرتے ہوئے کہا۔ چوں کہ آپ جانے کو تیار ہیں اس لئے اب اس کے سوا میرے لئے کوئی چارہ نہیں کہ میں بھی اسے منظور کروں مگر اللہ جانتا ہے کہ لفظ وداع زبان پر لانا دشوار ہے۔ (یادگار غالب مطبوعہ دہلی)

جھجھر کے بعد ریاست الور و ٹونک ورام پور میں ملازمت کے بعد آخر میں آپ لکھنؤ گئے اور وہاں صدر الصدور اور مہتمم "حضور تحصیل" ہوئے۔ دہلی میں بھی عرصہ تک آپ سررشتہ دار رہے۔ دو سال تک سہارن پور میں بھی کسی عہدہ پر فائز رہے۔ آپ نے کئی معرکۃ الآرا کتابیں لکھیں اور آپ کے کئی ایک شاگرد اپنے دور کے مشاہیر علما و فضلا میں شمار ہوتے ہیں۔

مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی و علامہ فضل حق خیر آبادی اور مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کے درمیان گہری دوستی تھی۔ علامہ ہی کے مشورے اور آپ کے انتخاب پر دیوانِ غالب عالم وجود میں آیا جو بقول محمد حسین آزاد۔ "یہی وہ دیوان ہے جو آج عینک کی طرح لوگ آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔ (آب حیات مطبوعہ دہلی) علامہ فضل حق اور مفتی صدر الدین آزردہ کا گھر دہلی کے

علما و فضلا و ادبا و شعرا کا مرکز تھا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء شروع ہوا تو آپ ریاست الور سے دہلی کئی بار آئے گئے۔ بہادر شاہ ظفر سے ملاقاتیں کیں۔ یہ سلسلہ مئی سے جاری رہا۔ پھر ۲۶ر جون یا پہلی جولائی کو جنرل بخت خاں روہیلہ جب بریلی سے چودہ ہزار فوج لے کر دہلی پہنچا تو منشی ذکاء اللہ دہلوی کے بیان کے مطابق:

علامہ نے بعد نماز جمعہ جامع مسجد دہلی میں علما کے سامنے تقریر کی۔ استفتاء پیش کیا۔ مفتی صدر الدین آزردہ، مولوی عبد القادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی، سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کیے۔ اس فتویٰ کے شایع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہوگئی۔ (تاریخ عروج عہد انگلشیہ از ذکاء اللہ مطبوعہ دہلی)

دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہونے کے بعد کسی طرح یہاں سے نکل کر آپ اودھ پہنچے۔ ۱۸۵۹ء میں آپ پر بغاوت کا مقدمہ چلا اور کالا پانی کی سزا ہوئی۔ آپ نے اپنا مقدمہ خود لڑا اور عدالت میں کہا کہ جہاد کا فتویٰ میرا لکھا ہوا ہے اور میں آج بھی اپنے اس فتویٰ پر قائم ہوں۔

پروفیسر محمد ایوب قادری (متوفی نومبر ۱۹۸۳ء کراچی) لکھتے ہیں:

"جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے مردانہ وار حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا بعبور دیائے شور کی سزا ہوئی۔ جزیرۂ انڈمان بھیجے گئے۔ اور وہیں ۱۲ر صفر ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء میں انتقال ہوا۔ جزیرۂ انڈمان میں دفن ہوئے۔ (ص ۳۸۳۔ تذکرۂ علمائے ہند۔ مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی)

علامہ فضل حق کے صاجزادے مولانا عبد الحق خیر آبادی (متولد ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۸ء۔ متوفی ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء) پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ کے بارے میں ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر لکھتا ہے کہ:

یہ ۱۸۵۷ء کے غدار عالم کے بیٹے ہیں جنھیں حکومت نے کالا پانی کی سزا دی اور اس کا کتب خانہ ضبط کر لیا جو کلکتہ کالج میں موجود ہے۔ (۲۰۳۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان، مطبوعہ نئی دہلی ۲۵)

علامہ کے سوانح نگار اور الثورۃ الھندیہ (باغی ہندوستان) کے مترجم مولانا عبد الشاہد

شیروانی علی گڑھی (متوفی ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء) لکھتے ہیں کہ:

مولانا عبدالحق خیرآبادی نے وصیت کی تھی کہ جب انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو میری قبر پر آکر اس کی اطلاع دے دی جائے چنانچہ سید نجم الحسن رضوی خیرآبادی نے مولانا کے مدفن درگاہ مخدومیہ خیرآباد ضلع سیتاپور اودھ میں ایک جم غفیر کے ساتھ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو حاضر ہو کر میلاد شریف کے بعد قبر پر فاتحہ خوانی کی۔ (ص ۱۲۔ مقدمہ زبدۃ الحکمۃ۔ مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۴۹ء)

علامہ فضل حق کا جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) میں ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

(۳) مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی

دلاور جنگ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی (متولد ۱۲۰۴ھ/ ۱۷۸۷ء۔ شہید ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) چناپٹن تعلقہ پورنا ملی جنوبی ہند کے نواب محمد علی مشیر و مصاحب سلطان ٹیپو کے فرزند تھے۔ اپنے عقیدت مندوں اور مریدوں کے ساتھ جب مولانا مدراسی کہیں نکلتے تو ایک دستہ نقارہ اور ڈنکا پیٹتا ہوا ساتھ ساتھ چلتا تھا اسی لئے آپ کو ڈنکا شاہ اور نقارہ شاہ بھی کہا جاتا تھا۔

عہد شباب ہی میں آپ پر فقر و تصوف کا غلبہ ہوا اور ریاضت و مجاہدہ کے لئے گھر بار چھوڑ کر حیدرآباد دکن اور مدراس وغیرہ ہوتے ہوئے انگلستان پہنچ گئے۔ وہاں سے مصر گئے اور پھر حجاز پہنچ کر حج و زیارت کے بعد ترکی و ایران و افغانستان ہوتے ہوئے ہندوستان واپس آئے۔

بیکانیر و سانبھر میں بارہ سال تک ریاضت و مجاہدہ اور چلہ کشی کی۔ پھر جے پور آکر میر قربان علی شاہ چشتی کے مرید ہوئے اور خلافت سے سرفراز کیے گئے۔ یہاں سے ٹونک گئے وہاں آپ کی مجالس سماع سے کچھ لوگوں کو اختلاف ہوا جس سے دل برداشتہ ہو کر گوالیار کا سفر کیا وہاں محراب شاہ قلندر گوالیاری کی خدمت میں پہنچے اور اس حکم کے ساتھ آپ کو محراب شاہ نے اجازت و خلافت دی کہ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے ہر حال میں آزاد کرانا ہے۔ اسی ارادہ سے آپ تقریباً ۱۸۴۶ء میں گوالیار سے دہلی پہنچے۔

دہلی کے مشاہیر علما و مشائخ سے آپ نے ملاقات و گفتگو کی۔ مفتی صدر الدین آزردہ نے

مشورہ دیا کہ اس مہم کے لئے ماحول سازی آگرہ کے اندر بہتر اور مؤثر طریقے سے ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی مفتی آزردہ نے مفتی انعام اللہ سرکاری وکیل آگرہ (ساکن گوپامئو ضلع ہردوئی۔ متوفی ۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۹ء آگرہ) کے نام ایک سفارشی خط بھی لکھا۔ آگرہ پہنچ کر آپ نے دینی و علمی شخصیات اور سربرآوردہ حضرات سے رابطہ قائم کیا۔ آپ کا اثر روز بروز بڑھتا اور پھیلتا گیا۔ مجلس علما آگرہ قائم کر کے آگرہ کے علما کو آپ نے مربوط و منظم کیا۔ یہ علما آپ کے دست و بازو بن گئے۔

مولانا مدراسی نے دہلی و آگرہ کے بعد میرٹھ، پٹنہ، کلکتہ وغیرہ کے بھی دورے کیے اور انگریزوں کے خلاف مہم کا دائرہ کافی وسیع کر لیا۔ سید خورشید مصطفیٰ رضوی لکھتے ہیں:

تحریک ۱۸۵۷ء کے لئے پورے ملک کو تیار کرنے میں مولانا شاہ احمد اللہ کا نام سرفہرست آتا ہے۔ وہ ملک کے گوشے گوشے میں دورے کر کے بغاوت کے لئے عوام کو آمادہ کر رہے تھے۔

میلسن (Malleson) لکھتا ہے کہ: بے شک اس تمام سازش کا رہنما مولوی (احمد اللہ) تھا اور یہ سازش تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ .... میں سمجھتا ہوں کہ یہی شخص بغاوت کی سازش کا دماغ و دست و بازو تھا۔ اپنے سفر کے دوران اسی نے وہ اسکیم تیار کی جو چپاتی اسکیم کہلاتی ہے۔ (ص ۲۰۵۔ تاریخ جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ء۔ مطبوعہ رضا لائبریری رام پور)

لکھنؤ، فیض آباد، شاہجہاں پور میں مولانا مدراسی نے انگریزوں سے گھمسان کی جنگ لڑی۔ آخر میں محمدی (شاہجہاں پور) میں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، شہزادہ فیروز شاہ، جنرل بخت خاں، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی وغیرہ نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ مگر راجہ بلدیو سنگھ کی غداری کی وجہ سے مولانا مدراسی اپنی مہم میں ناکام ہو کر ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء میں شہید ہو گئے اور بلدیو سنگھ کو انگریزوں نے پچاس ہزار روپے کا انعام دیا۔

پروفیسر محمد ایوب قادری (کراچی) لکھتے ہیں کہ:

شاہ احمد اللہ صاحب کی شہادت پر روہیل کھنڈ کی ہی جنگ آزادی نہیں بلکہ درحقیقت ہندوستان کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ختم ہو گئی۔ (ص ۳۰۳۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ مطبوعہ کراچی)

انگریز مؤرخ جی ڈبلیو فارسٹر لکھتا ہے۔ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ عالم باعمل ہونے کی وجہ سے مولوی تھا۔ روحانی طاقت کی وجہ سے صوفی تھا۔ اور جنگی مہارت کی وجہ سے سپاہی اور سپہ سالار تھا۔ (ہسٹری ڈی انڈین میوٹنی)

(۴) مولانا فیض احمد بدایونی

مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی (متولد ۱۲۲۳ھ/ ۱۸۰۸ء۔ متوفی نا معلوم) فرزند مولانا حکیم غلام احمد عثمانی بدایونی (متوفی ۱۲۲۶ھ/ ۱۸۱۱ء) کی تعلیم وتربیت آپ کے ماموں علامہ فضل رسول عثمانی بدایونی (متوفی ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) کی سرپرستی ونگرانی میں ہوئی۔ چودہ سال کی عمر میں تکمیل علوم وفنون سے فارغ ہوئے۔ اپنے وقت کے بڑے عالم وفاضل اور بہترین شاعر تھے۔ اپنے نانا شاہ عین الحق عبدالمجید عثمانی بدایونی (متوفی ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۲۰ء) سے بیعت تھے۔

مولانا محمد یعقوب ضیا قادری بدایونی (متولد ۱۳۱۰ھ/ ۱۸۸۳ء بدایوں۔ متوفی ۱۳۹۰ھ/ ۱۹۷۰ء در کراچی) مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی کے حالات بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"فاضل دہر استاذ العصر علامۂ اوحد مولانا فیض احمد قدس اللہ سرہ الصمد۔ آپ علمی دنیا میں علما کے سرتاج اور مجلسِ عرفا میں معرفت کے روشن چراغ تسلیم کیے گئے ہیں۔ ۱۲۲۳ھ میں عالم وجود میں بزم آرا ہوئے۔ کم سنی میں فخر الاطباء (حکیم غلام احمد متوفی ۱۲۲۶ھ) کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کی والدہ ماجدہ نے جو ولیۂ عصر اور عفیفۂ دہر اور حضرت سیدی مولانا شاہ عین الحق عبدالمجید قدس سرہ الوحید کی دختر بلند اختر تھیں۔ اپنے بھائی حضرت سیف اللہ المسلول مولانا شاہ معین الحق فضل رسول قدس سرہ کے سپرد آپ کو کر دیا۔ ماموں کی آغوشِ محبت میں بڑے ناز ونعم سے پرورش پائی۔

......خزانۂ قدرت سے آپ کو وہ ذہن ودماغ عطا ہوا تھا جس کی مثال آج کل ناپید ہے۔ ذرا سی عمر میں تمام علوم معقول ومنقول نہایت تحقیق وتدقیق کے ساتھ حاصل فرمائے۔ آپ کی ذہانت وذکاوتِ خداداد پر ہم سبق طلبہ رشک کرتے تھے۔ پندرہویں سالگرہ نہ ہونے پائی تھی کہ اجازتِ درس حاصل ہو گئی۔ تقریر وتحریر میں وہ زور تھا کہ مخاطب شانِ استدلال اور ہیبتِ کلام سے ساکت ہو جاتا۔ جب تکمیل سے فراغِ کامل ہوا دولتِ بیعت اپنے مقدس نانا حضرت سیدی شاہ

معین الحق قدس سرہ المجید سے پائی۔

اس کے بعد سلسلۂ ملازمت میں داخل ہو کر اس عہدۂ جلیلہ پر مامور ہونے کہ تمام سیاہ وسپید آپ کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت آگرہ صوبہ کا صدر تھا۔ آپ لفٹیننٹ کے سررشتہ دار تھے۔ ثروت وامارتِ خاندانی کے سوا عہدہ کی وجاہت، اس پر طرہ یہ کہ سر ولیم میور لفٹیننٹ گورنر بہادر صوبۂ آگرہ واودھ آپ کے شاگردِ خاص اور احترام کنندہ۔

ہزاروں اہل حاجت کی دست گیری فرمائی۔ وطن کے اہل غرض مطلب برآری کے لئے روزانہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ہر وقت مطبخ گرم رہتا۔ فقرا ومساکین ہمیشہ دامن دولت سے وابستہ رہتے۔ کبھی پیسہ آپ کے ہاتھ میں نہ رہتا اور مقروض رہتے۔ اہل بدایوں پر جو کچھ احسانات آپ کے ہیں وہ کبھی فراموش نہیں ہو سکتے۔

......سلسلۂ درس وتدریس اقامتِ آگرہ میں بھی برابر جاری رہا۔ شاعری کا مذاقِ سلیم خاص طور پر جزوِ طبیعت تھا۔ کلام میں حسنِ فصاحت اور رنگِ بلاغت دونوں موجود ہیں۔ مضمون آفرینی کے ساتھ زبان کی صفائی سونے پر سہاگہ ہے۔ رسوا تخلص فرماتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو ہر سہ زبانوں میں آپ کے اشعار انمول جواہر ہیں۔ (ص ۵۹ تا ۶۱۔ اکمل التاریخ (۱۳۳۳ھ) حصہ اول۔ مؤلفہ مولانا محمد یعقوب ضیا قادری بدایونی۔ مطبع قادری مولوی محلہ، بدایوں۔ بار اول)

بدایوں میں ایک مدت تک درس وتدریس کے بعد صدر نظامت آگرہ میں پیش کار اور پھر بورڈ آف ریونیو کے سررشتہ دار ہوئے۔ سر ولیم میور نے آپ سے عربی زبان سیکھی تھی جو بعد میں ملٹری مجسٹریٹ اور لفٹننٹ گورنر صوبہ اودھ وآگرہ ہوئے۔

مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی (متوفی ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) کی مجلس علما آگرہ کے آپ سرگرم رکن تھے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی (متوفی ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۱ء) اور پادری فنڈر کے درمیان اسلام اور عیسائیت کے موضوع پر ۱۸۵۴ء میں ہونے والے مناظرۂ آگرہ میں آپ معاون مناظر تھے۔ یہ مناظرہ تین روز تک جاری رہا اور پادری فنڈر شکست کھا کر یورپ واپس چلا گیا۔

جامع مسجد آگرہ جس کے اکثر حصے پر لوگوں نے قبضہ کر رکھا تھا اسے خالی کرانے کے لئے مولانا فیض احمد نے طویل جدوجہد کی۔ مقدمہ بازی بھی ہوئی۔ بالآخر آپ کو کامیابی ملی۔ مسجد کو قابضوں سے خالی کرا کے اس کی مرمت کرائی گئی اور مسجد کے انتظام کے لئے لوکل ایجنسی آگرہ کا

سنبھال لی۔

قیام عمل میں آیا جس نے ساری ذمہ داری سنبھال لی۔
مولانا فیض احمد بدایونی کئی کتب ورسائل کے مصنف ومؤلف بھی تھے مگران میں سے بیشتر
کے مسودات انقلاب ۱۸۵۷ء کی افراتفری میں ضائع ہوگئے۔ تعلیم الجاہل مطبوعہ ۱۲۶۹ھ۔ المقامۃ
البغدادیۃ (منثور) وھدیۂ قادریہ (منظوم) مطبوعہ ۱۳۰۳ھ آپ کی تحریری یادگاریں ہیں۔
انقلاب ۱۸۵۷ء میں آپ نے بڑی سرگرمی اور جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیا۔ چنانچہ
پروفیسر محمد ایوب قادری (متوفی ۱۹۸۳ء۔ کراچی) لکھتے ہیں کہ:

"جب میرٹھ اور آگرہ کی بغاوت اور مجاہدین کے معرکوں کی خبر آگرہ پہنچی تو جانسن کالن لفٹنٹ گورنر بہادر نے سب فوج ہندوستانی کو جمع کر کے فہمائش کی۔ اس کا اثر چند روز رہا۔ مگر پھر آگرہ کی بھی فوج باغی ہوگئی اور مجاہدین سے مل گئی اور آزادیِ وطن میں کوشاں ہوئی۔
انگریزوں نے قلعہ کو جائے پناہ قرار دیا۔ ماہ جون میں یہاں بھی واقعات شروع ہوئے۔ جولائی میں تیزی آئی، مجاہد فوج کی سرپرستی ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی نے کی۔ مگر جب حالات کا گہرائی سے جائزہ لیا اور دہلی سے طلبی ہوئی تو کچھ مسلح سپاہ کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی دہلی روانہ ہوگئے۔ (ص ۲۱۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد! مولانا فیض احمد بدایونی۔ ایجوکیشنل پریس کراچی۔ ۱۹۵۷ء)

انقلاب ۱۸۵۷ء میں آپ اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر دہلی پہنچے اور یہاں جاری جنگ میں کھل کر حصہ لیا۔ کچھ دن تک شہزادہ مرزا مغل فرزند بہادر شاہ ظفر کے پیش کار رہے اور جنرل بخت خاں روہیلہ کے ساتھ انقلاب کی ناکامی کے بعد دہلی سے واپس چلے گئے۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں مولانا نے ککرالہ (بدایوں) کے معرکے میں جنرل بخت خاں کے ساتھ دادِ شجاعت دی جہاں انگریز جنرل پینی میدان جنگ میں مارا گیا۔ یہاں کی پسپائی کے بعد آپ بریلی چلے گئے جہاں خان بہادر خاں ولد ذوالفقار خاں ولد حافظ رحمت خاں روہیلہ انگریزوں سے برسر پیکار تھے۔
لکھنو میں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کے ساتھ بھی آپ رہے اور انگریزوں سے جنگ کی۔
یہاں سے مولانا مدراسی کے ساتھ شاہجہاں پور گئے اور جب مولانا مدراسی نے محمدی (شاہ جہاں

پور) میں اپنی حکومت قایم کی تو اس کی وزارت میں شامل ہوئے۔ شاہجہاں پور پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد آپ نیپال کی طرف نکل گئے اور پھر بعد کے حالات کا کچھ علم نہیں کہ آپ پر کیا گذری اور کہاں کس طرح آپ کا انتقال ہوا؟

پروفیسر محمد ایوب قادری (متوفی ۱۹۸۳ء۔ کراچی) لکھتے ہیں کہ:
جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں علماے بدایوں نے نمایاں حصہ لیا۔ ان میں سرفہرست مولانا فیض احمد بدایونی کا نام ہے جو اپنے دور کے نامور عالم تھے۔ سینٹرل بورڈ آف ریونیو میں ملازم تھے۔ عربی کے بلند پایہ ادیب وشاعر تھے۔ انھوں نے آگرہ میں قیام کے دوران مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور پادری فنڈر کے مناظرہ میں حصہ لیا اور مولوی رحمت اللہ کے مددگار رہے۔ پھر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصہ لیا۔ وہ دہلی بھی گئے۔ آخری معرکہ ککرالہ (بدایوں) میں ہوا۔ اس میں ڈاکٹر وزیر خاں، شہزادہ فیروز شاہ جیسے بطلِ حریت بھی موجود تھے۔ انگریزوں کا مشہور جنرل پینی مارا گیا۔ (ص ۲۶۔ انسائیکلوپیڈیا آف بدایوں، جلد ۲۔ مطبوعہ کراچی)

☆☆☆☆☆☆

(۵) مولانا سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی

مولانا سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی (شہید ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) عالم و فاضل اور بہترین طبیب و شاعر تھے۔ شاہ ابوسعید مجددی رام پوری (متوفی ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۵ء) سے مولانا کافیؔ نے درس حدیث لیا اور مشہور شاعر ذکیؔ مرادآبادی (متوفی ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء) شاگرد امام بخش ناسخؔ سے فن شاعری سیکھا۔

۱۸۴۱ء میں آپ نے حج و زیارت کی سعادت حاصل کی جس کی یادگار "تجمل دربار رحمت" ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی کئی تصانیف ہیں۔ مثلاً ترجمۂ شمائل ترمذی (منظوم) مجموعۂ چہل حدیث (منظوم) مع تشریح، خیابان فردوس، بہار خلد، نسیم جنت، مولود بہار، جذبۂ عشق، دیوان کافیؔ۔

آپ کی نعتیہ شاعری اور جذبۂ عشق رسول کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے امام احمد رضا بریلوی (متوفی ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) کہتے ہیں۔

مہکا ہے مری بوئے دہن سے عالم — یاں نغمۂ شیریں نہیں تلخی سے بہم
کافیؔ "سلطانِ نعت گویاں" ہیں رضاؔ — ان شاء اللہ میں وزیر اعظم

پروفیسر محمد ایوب قادری (کراچی) لکھتے ہیں:

"مولانا کفایت علی کافیؔ تخلص، مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ تحصیل علم بدایوں، بریلی، رام پور اور لکھنؤ میں کیا۔ مفتی ظہور اللہ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصہ لیا۔ مرادآباد کے صدر الشریعہ بنائے گئے۔ مرادآباد پر جب انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو مئی ۱۸۵۷ء میں ان کو پھانسی دے دی گئی۔ قبر عقب جیل ہنوز موجود ہے۔

ہمیشہ نعت لکھتے رہتے تھے۔ شرح شمائل ترمذی کا نظم میں ترجمہ کیا۔ مولانا کفایت علی کافیؔ کے ہاتھ کا تحریر کردہ شمائل ترمذی کا پہلا مسودہ خاکسار (مترجم) کے پاس محفوظ ہے۔

خاکسار کے جد اعلیٰ مولوی حکیم محمد سعید اللہ قادری (آنولہ، بریلی) سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ دونوں نے بریلی و رام پور میں ساتھ ساتھ علم حاصل کیا تھا۔ (ص ۲۴۴۔ تذکرۂ علمائے ہند۔ مطبوعہ کراچی)

مرادآباد میں آپ نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے وقت انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتوئی دیا۔ اور اس کی نقلیں دوسرے مقامات پر بھجوائیں۔ خود آنولہ (بریلی) جا کر ایک ہفتہ قیام کیا اور فتوئی کی تشہیر کے ساتھ لوگوں میں جذبۂ جہاد ابھارا۔ یہاں سے بریلی پہنچے اور خان بہادر خاں نبیرۂ حافظ رحمت خاں روہیلہ سے تبادلۂ خیال کیا پھر مرادآباد واپس آئے۔

نواب مجدالدین خاں عرف مجو خاں کی قیادت میں مرادآباد کے اندر حکومت قائم ہوئی تو مولانا کافیؔ اس کے صدر شریعت بنائے گئے۔ ڈسٹرکٹ گزٹ مرادآباد میں ہے کہ یہاں ضلع بھر میں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف زبردست بغاوت کی جس کے پیچھے ان کا مذہبی جذبہ کار فرما تھا۔ نجم الغنی رام پوری لکھتے ہیں:

> "مرادآباد میں رعایا کی یہ حالت تھی کہ ہر جمعہ کو مسجدوں میں جہاد کے واسطے وعظ کہا جاتا تھا جس سے باغیوں کی زیادہ تر ہمت بندھتی تھی۔
> (ص ۵۸۔ جلد دوم اخبار الصنادید مطبوعہ رضا لائبریری رام پور)

اس وقت ریاست رام پور کے نواب یوسف علی خاں انگریزوں کی حمایت و وفاداری میں پیش پیش تھے۔ انھوں نے مرادآباد پر حملہ کیا مگر جنرل بخت خاں جب اپنی فوج کے ساتھ مرادآباد پہنچے تو نواب کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ تاہم بعد میں نواب نے انگریزوں کی مدد سے مرادآباد پر قبضہ کر لیا اور انگریزوں نے نواب مجو خاں کو طرح طرح کی اذیت دے کر شہید کر دیا۔

مولانا کافیؔ اپنے خط کے ذریعہ جنرل بخت خاں کو مرادآباد کے حالات سے باخبر کرتے رہتے تھے۔ ۲۵/ اپریل ۵۸ء کو جب مرادآباد پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا تو مولانا روپوش ہوگئے۔ مگر ایک مخبر کی غداری سے ۳۰/ اپریل کو انگریزوں نے آپ کو گرفتار کر لیا۔ اس وقت انگریزوں نے ایک کمیشن قائم کیا تھا جو مقدمات کی سرسری سماعت کر کے سزا سنایا کرتا تھا۔ ۴/ مئی ۱۸۵۸ء کو مولانا کا مقدمہ ظالم و جابر انگریز مجسٹریٹ کے روبرو پیش ہوا اور بہت جلد اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ (اخبار الصنادید مؤلفہ نجم الغنی رام پوری مطبوعہ رام پور)

مسٹر جان انگلسن مجسٹریٹ کمیشن مراد آباد نے فیصلہ سنایا کہ

”چوں کہ اس مدعا علیہ ملزم نے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی اور عوام کو قانونی حکومت کے خلاف ورغلایا اور شہر میں لوٹ مار کی۔ ملزم کا یہ فعل صریح بغاوتِ انگریزی سرکار رہوا جس کی پاداش میں ملزم کو سزائے کامل دی جائے۔

حکم ہوا۔ مدعا علیہ کو پھانسی دے کر جان سے مارا جائے۔ جان انگلسن ۔ ۶ رمئی ۱۸۵۸ء۔

مقدمہ کی پوری کارروائی صرف دو دن میں پوری کردی گئی۔ ۴ رمئی کو پیش ہوا اور ۶ رمئی کو حکم دے دیا گیا اور اسی وقت پھانسی دے دی گئی۔ (ص ۱۴۴۔ مراد آباد! تاریخ جد و جہد آزادی مؤلفہ سید محبوب حسین سبزواری مراد آبادی۔ مطبوعہ مراد آباد)

پھانسی کے وقت آپ وجد و شوق کے ساتھ نعت شریف پڑھ رہے تھے۔

وہ نعت شریف جو تختۂ دار پہ چڑھنے سے پہلے مولانا کافی گنگنا رہے تھے اس کے چند اشعار یہ ہیں:

کوئی گل باقی رہے گا نے چمن رہ جائے گا ۔۔۔ پر رسول اللہ کا دینِ حَسَن رہ جائے گا
ہم صفیرو! باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا ۔۔۔ بلبلیں اڑ جائیں گی، سونا چمن رہ جائے گا
اطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو ۔۔۔ اس تنِ بے جان پر خاکی کفن رہ جائے گا
جو پڑھے گا صاحبِ لولاک کے اوپر درود ۔۔۔ آگ سے محفوظ اس کا تن بدن رہ جائے گا

سب فنا ہو جائیں گے کافیؔ ولیکن حشر تک
نعتِ حضرت کا زبانوں میں پرسخن رہ جائے گا

☆☆☆☆☆☆

(۶) مفتی عنایت احمد کاکوروی

مفتی عنایت احمد کاکوروی (متولد ۱۲۲۸ھ/ ۱۸۱۳ء۔ متوفی ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۳ء) دیوہ (بارہ بنکی، اودھ) میں پیدا ہوئے اور اپنی نانیہال کاکوری (لکھنؤ) میں اپنے والد منشی محمد بخش کے ساتھ مستقل رہائش پذیر ہوئے۔ دیوہ اور کاکوری میں ابتدائی تعلیم کے بعد رام پور پہنچ کر مختلف علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی میں شاہ محمد اسحٰق (متوفی ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۸ء) اور علی گڑھ میں مولانا بزرگ علی مارہروی (۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۸ء) سے درس حدیث اور دیگر علوم پڑھ کر علی گڑھ میں مدرس اور مفتی کے منصب پر فائز ہوئے۔ آپ کے بہت سے شاگردوں میں مفتی لطف اللہ علی گڑھی (متوفی ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء) صدر الصدور امور مذہبی حیدر آباد دکن زیادہ مشہور ہوئے۔

مفتی عنایت احمد کاکوروی نے سرکاری ملازمت بھی کی۔ پہلے علی گڑھ میں منصف ہوئے کچھ عرصہ پھپھوند (اٹاوہ) میں بھی منصف رہے پھر صدر امین بن کر بریلی گئے۔ وہاں آپ زیادہ دنوں تک رہے اور کئی ایک دینی و علمی کتابیں بھی لکھیں۔ یہاں آپ نے ایک اصلاحی اور تبلیغی انجمن ”جلسۂ تائید دینِ متین“ قائم کر کے لٹریچر کی نشر و اشاعت کی۔ اس انجمن کو برصغیر کی پہلی اصلاحی انجمن کہا جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے شروع میں آپ کو صدر الصدور آگرہ بنایا گیا۔ ابھی سفر کی تیاری جاری تھی کہ ماہ مئی میں انقلاب برپا ہو گیا اور آپ آگرہ نہ جا کر بریلی و رام پور میں انقلابیوں کے ہمنوا و معاون بلکہ سرپرست کی حیثیت سے سرگرم ہو گئے۔

مجاہدین کے لئے مالی امداد و تعاون اور انگریزوں کے خلاف جہاد پر مشتمل ایک فتویٰ بریلی سے جاری ہوا جس پر مفتی عنایت احمد کاکوروی کے دستخط تھے۔ پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں۔ انقلاب سے پہلے بریلی میں اس تحریک کے دو ممتاز کارکن موجود تھے۔ مولوی سرفراز علی اور دوسرے مفتی عنایت احمد کاکوروی (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ مطبوعہ کراچی)

میاں عبدالرشید کالم نگار روزنامہ نوائے وقت لاہور لکھتے ہیں— آپ (مفتی عنایت احمد) بریلی میں نواب خان بہادر خاں روہیلہ کی قیادت میں جہاد حریت کی تنظیم کے لئے سرگرم عمل رہے۔ ان دنوں روہیل کھنڈ بریلی مجاہدین آزادی کا اہم مرکز تھا۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے دادا مولانا رضا علی خاں بریلوی اس تحریک کے قائدین میں سے تھے۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی نے مجاہدین کی تنظیم پر ہی اکتفانہ کیا بلکہ نواب خان بہادر خاں روہیلہ کے دست و بازو کی حیثیت سے مختلف معرکوں میں عملی حصہ بھی لیا۔ (جنگ آزادی نمبر۔ ماہنامہ ترجمان اہل سنت کراچی۔ شمارہ جولائی ۱۹۷۵ء)

فتوئی اور جنگ آزادی میں حصہ لینے کے جرم میں انگریزوں نے آپ کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا اور کالاپانی کی سزادی۔ جہاں چار سال قید و بند کی آپ نے مشقت جھیلی۔ ایک انگریز کی فرمائش پر ''تقویم البلدان'' کے ترجمہ کی خدمت انجام دینے کے صلے میں آپ کو رہائی ملی اور ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء میں ہندوستان واپس آکر کانپور میں ایک مدرسہ (فیض عام) کی بنیاد ڈالی اور دینی و علمی خدمات میں مصروف ہوگئے۔

کالاپانی میں آپ نے سیرت النبی پر ایک مختصر کتاب ''تواریخ حبیب الٰہ'' اور فن صرف کی کتاب ''علم الصیغہ'' تحریر کی جو آج بھی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی آپ کی لکھی ہوئی لگ بھگ دو درجن کتابیں ہیں۔

اپنے مدرسہ فیض عام کان پور کی کچھ خدمت کر کے آپ حج و زیارتِ حرمین شریفین کی نیت سے حجاز مقدس کے سفر پر روانہ ہوئے۔ راستے میں مشیت الٰہی سے بحری جہاز غرق ہوگیا اور ۱۷/شوال ۱۲۷۹ھ/۱۷/اپریل ۱۸۶۳ء میں آپ شہید اور غریقِ بحر رحمت ہوگئے۔

☆☆☆☆☆☆

(۷) مولانا رحمت اللہ کیرانوی

پایۂ حرمین مولانا رحمت اللہ عثمانی کیرانوی (متولد ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء۔ متوفی ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء) کبیرالاولیا مخدوم جلال الدین پانی پتی (متوفی ۷۶۵ھ) کی اولاد میں سے ایک بلند پایہ عالم دین ہیں۔ کیرانہ مظفر نگر (موجودہ مغربی یوپی) میں ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ حیات دہلی میں آپ نے تعلیم حاصل کی۔ پھر لکھنؤ جا کر مفتی سعد اللہ مرادآبادی (متوفی ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء۔ شاگرد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی و مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی) سے چند اعلیٰ کتابوں کا درس لیا۔ شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی (متوفی ۱۲۹۶ھ/دسمبر ۱۸۷۸ء) سے حدیث نبوی کی کئی کتابیں پڑھیں۔ مولانا امام بخش صہبائی سے بھی کچھ تحصیل علم کی۔

شروع میں کئی سال تک کیرانہ کی مسجد میں طلبہ کو پڑھایا۔ مشنری اسکولوں اور پادریوں کی سرگرمیاں جب زیادہ بڑھنے لگیں اور انھوں نے اسلام پر اعتراضات کیے تو شاہ عبدالغنی مجددی کے حکم پر ''ازالۃ الاوھام'' کے نام سے آپ نے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں عیسائیوں بالخصوص پادری فنڈر کی لکھی ہوئی کتاب ''میزان الحق'' کے سارے اعتراضات کا اطمینان بخش جواب دیا۔

۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں مولانا کیرانوی اور پادری فنڈر کے درمیان آگرہ میں ایک تاریخی مناظرہ ہوا جس میں پادری فنڈر کو آپ نے لاجواب کردیا۔ اس مناظرہ کی تفصیلات اسی وقت کتابوں میں شایع ہوگئیں۔ اس مناظرہ میں مولانا فیض احمد بدایونی اور مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی آپ کے خصوصی معاون تھے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء شروع ہوا تو آپ نے انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کی۔ مولانا امداد صابری دہلوی لکھتے ہیں—— اس زمانہ میں عصر کی نماز کے بعد مجاہدین کی تنظیم و تربیت کے لئے

کیرانہ کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ کی آواز پر لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا اور اعلان ہوتا تھا کہ ـــ ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا۔ (ص ۲۴۶۔ آثار رحمت مطبوعہ دہلی)

مولوی رحمت اللہ صاحب کا دہلی کے علمی طبقے اور لال قلعہ کے شہزادوں پر اثر اور ان سے تعلقات تھے اس لئے اس وقت بہادر شاہ ظفر اور دوسرے مجاہدین کے ساتھ مولانا رحمت اللہ صاحب نے بھی جنگ آزادی کا نقشہ بنانے میں حصہ لیا اور جنگ میں شرکت فرمائی۔ ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی اور مولانا فیض احمد بدایونی کے ساتھ دہلی کی جنگ آزادی میں شریک ہوئے۔ (ص ۳۱۹۔ آثار رحمت مطبوعہ دہلی)

منشی ذکاء اللہ دہلوی نے لکھا: سب سے اول مولوی رحمت اللہ کیرانہ سے اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے؟ وہ بڑے فاضل تھے۔ (ص ۶۷۵ جلد سوم۔ تاریخ عروج عہد انگلشیہ، مطبوعہ دہلی)

روزنامچہ عبداللطیف میں ہے۔ دو سو اہل نجیب آباد مولوی رحمت اللہ کیرانوی کی قیادت میں دہلی آئے اور آمادۂ پیکار ہوئے۔ پھر واپس چلے گئے۔ (ص ۸۷۔ روزنامچہ عبداللطیف، مطبوعہ دہلی)

بعد میں انگریزوں نے آپ کے خلاف مقدمہ چلایا اور اعلان کیا کہ مولانا کیرانوی کو گرفتار کر کے انھیں انگریزوں کے حوالہ کرنے والے شخص کو ایک ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔ مگر مولانا کیرانوی گرفتار نہ کیے جا سکے اور کسی طرح بچتے بچاتے مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ کیرانہ میں آپ کی جائداد وملکیت ضبط کر کے نیلام کر دی گئی۔ اسی طرح پانی پت کی آپ کی موروثی جائداد بھی نیلام کر دی گئی۔

مولانا کیرانوی اپنی روپوشی کے دوران راجپوتانہ ہوتے ہوئے سورت پہنچے۔ وہاں مولانا خیرالدین محدث سورتی (متوفی رجب ۱۲۰۶ھ) کی خانقاہ میں قیام پذیر ہوئے۔ یہیں مولانا وصی احمد محدث سورتی (متوفی ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۶ء) کے والد مولانا محمد طیب راندیری ثم سورتی (متوفی ۱۲۷۶ھ/۱۸۶۰ء) سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ انگریزوں کے خلاف راندیر (گجرات) میں آپ تقریر کیا کرتے تھے اور ان سے جنگ کرتے ہوئے مولانا محمد طیب سورتی کے دو بیٹے اور متعدد ساتھی شہید ہو چکے تھے۔ سورت ہی سے مولانا کیرانوی اور مولانا محمد طیب سورتی حرمین طیبین کے لئے روانہ ہوئے۔

مولانا حکیم قاری احمد پیلی بھیتی (متوفی ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء) بن مولانا عبدالاحد پیلی بھیتی (متولد ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۳ء۔ متوفی ۱۳۵۲ھ/ دسمبر ۱۹۳۳ء) بن مولانا وصی احمد محدث سورتی (متوفی ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء) لکھتے ہیں:

"مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے مولانا خیرالدین محدث سورتی کے خاندان سے بڑے دیرینہ مراسم تھے۔ اور آپ متعدد بار سفر حج کے دوران سورت میں مولانا خیرالدین محدث سورتی کی خانقاہ میں قیام فرما چکے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں گرفتاری سے بچنے کے لئے جب مولانا کیرانوی سورت پہنچے تو یہاں محدث سورتی کی خانقاہ میں مولانا محمد طیب اپنے اہل خانہ کے ساتھ مقیم تھے اور حجاز مقدس روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی زبانی حالات کا علم ہوا تو مزید دل برداشتہ ہوئے۔ اور مولانا کی ہمراہی میں نہایت خاموشی کے ساتھ ایک بادبانی کشتی پر سوار ہو کر حجاز مقدس کی جانب ہجرت کر گئے۔ صفر المظفر ۱۲۷۴ھ کے آخر میں جدہ پہنچے۔ یہاں سے مولانا محمد طیب سورتی مدینہ منورہ اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی مکہ معظمہ پہنچے گئے۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر آپ نے ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں مدرسہ صولتیہ قائم کیا اور درس وتدریس میں مصروف ہو گئے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور شیخ زینی دحلان شافعی مکی نے وہاں آپ کو کافی سہارا دیا۔ سلطان ترکی کی دعوت پر کئی بار آپ نے قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ انھیں کی خواہش پر آپ نے رد نصرانیت میں اپنی معرکۃ الآرا کتاب "اظہار الحق" مکہ مکرمہ میں لکھ کر پادریوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۱ء میں مکہ مکرمہ میں آپ کا انتقال ہوا اور جنت المعلیٰ میں آپ کی تدفین ہوئی۔

☆☆☆☆☆☆

(۸) مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی

مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی (متوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۳ء) بہار کے رہنے والے تھے۔
والد محمد نذیر خاں نے ابتدائی تعلیم کے بعد مرشد آباد (بنگال) میں انگریزی تعلیم دلائی اور پھر انگلینڈ بھیج دیا جہاں محنت سے آپ نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔ ساتھ ہی یونانی وعبرانی زبانیں سیکھیں اور انجیل وتوریت وغیرہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔
ہندوستان واپسی کے بعد کلکتہ کے ایک اسپتال میں حکومت کی طرف سے اسسٹنٹ سرجن مقرر ہوئے۔ اس کے بعد آگرہ آئے۔ یہاں اپنے کام کے ساتھ مفتی انعام اللہ گوپامئوی وکیل صدر سے ربط وضبط ہوا۔ اور جب مولانا احمد اللہ مدراسی نے مجلس علما آگرہ بنا کر اپنی سرگرمی شروع کی تو آپ ان کے دست وبازو بن گئے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر وزیر خاں کو انگریز دشمنی اور حریت نوازی کا چسکا شاہ (احمد اللہ مدراسی) صاحب کے فیض صحبت سے پڑا۔ (ص ۸۱۔ غدر کے چند علما، مطبوعہ دہلی)

۱۸۵۴ء میں پادری فنڈر نے علمائے آگرہ کو چیلنج مناظرہ دیا تو مجلس علما میں مشورہ ہوا اور ڈاکٹر وزیر خاں نے اسے منظور کر کے اپنے دوست مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو بلا بھیجا۔ اور تین روز کے گرما گرم مناظرہ کے بعد پادری فنڈر نے راہ فرار اختیار کی۔ اس مناظرہ میں اہل اسلام کی طرف سے مولانا رحمت اللہ کیرانوی مناظر مقرر ہوئے تھے اور مولانا ڈاکٹر وزیر خاں و مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی ان کے معاون تھے۔

سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء) آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اور خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کا وجود تو ردِ عیسائیت میں تائیدِ غیبی سے کم نہیں۔
> اور کون باور کر سکتا تھا کہ اس وقت پادری فنڈر کے مقابلے کے لئے ڈاکٹر وزیر خاں جیسا آدمی پیدا ہوگا۔ جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف اور ان

> کی مذہبی تصانیف کا ماہر کامل اور یونانی وعبرانی کا ایسا واقف ہوگا جو عیسائیوں کو خود ان ہی کی تصنیفات سے ملزم ٹھہرائے گا۔ اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کا ناقابل شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کردے گا۔ (ص ۱۵۔ دیباچہ حیات شبلی از سید سلیمان ندوی۔ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ)

انقلاب ۱۸۵۷ء میں آپ کی سرگرم شرکت کے بارے میں مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی لکھتے ہیں:

ڈاکٹر وزیر خاں مردانہ وار نکل آئے۔ آگرہ میں جو فوج فدائیوں کی آئی اس کی سرپرستی ڈاکٹر صاحب نے کی۔ انگریز قلعہ بند ہوگئے۔ یہ مولوی فیض احمد بدایونی کو لے کر دہلی پہنچے۔ بہادر شاہ کا دربار جما ہوا تھا۔ بریلی سے جنرل بخت خاں آچکے تھے۔ ''وار کونسل'' بنی ہوئی تھی۔............... ڈاکٹر صاحب بھی اس میں داخل کر لیے گئے۔ جنرل بخت خاں لارڈ گورنر تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے ہمراہ لیا۔ مولوی فیض احمد مرزا مغل کے پیش کار مقرر ہوئے۔ (ص ۸۷۔ غدر کے چند علما، مطبوعہ دہلی)

دہلی میں پسپائی کے بعد جنرل بخت روہیلہ، ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی اور مولانا فیض احمد بدایونی وغیرہ اپنی فوج کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف مورچہ بندی کی۔ پھر سب کو لکھنؤ چھوڑ کر شاہجہاں پور جانا پڑا۔ وہاں بھی جب ناکامی ہوئی تو منتشر ہو کر اکثر حضرات نیپال چلے گئے۔ مولانا ڈاکٹر وزیر خاں چھپتے چھپاتے مکہ مکرمہ پہنچے اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے پاس مکہ مکرمہ ہی میں مقیم ہوگئے۔

مکہ مکرمہ میں مطب کھول کر ڈاکٹر صاحب نے مریضوں کا علاج کرنا شروع کیا۔ ایک عرب شیخ عبداللہ یمنی کی بیوی کا آپ نے علاج کیا اس نے آپ کو پیسے دینے چاہے تو آپ نے لینے سے انکار کیا جس کے بعد وہ آپ کا عقیدت مند ہوگیا۔ انگریزی حکومت نے سلطان ترکی کو خط لکھا کہ ہمارا ایک مفرور ملزم مکہ میں ہے اس کو ہمارے حوالے کیا جائے۔ سلطان ترکی نے گورنر مکہ شریف عبداللہ کو لکھا۔ گورنر مکہ کے مشورے سے آپ نے عبداللہ یمنی کو صورت حال بتائی اس نے گورنر مکہ سے کہا کہ میرے قبیلہ کے دس ہزار افراد ہیں جب وہ کٹ مر جائیں گے تبھی ڈاکٹر

صاحب کوکسی کے حوالے کیا جاسکتا ہے۔ گورنر مکہ نے یہ بات سلطانِ ترکی کو لکھ کر مطلع کیا۔ اس نے حکومت ہند کو لکھ دیا کہ ایسے حالات میں اس ملزم کی حوالگی ناممکن ہے۔ حکومت ہند کو مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔

ڈاکٹر صاحب مکہ مکرمہ میں چودہ سال تک بقید حیات رہے۔ وہیں ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۳ء میں آپ کا انتقال ہوا اور جنت المعلیٰ میں تدفین ہوئی۔

(۹) مولانا وہاج الدین مرادآبادی

مولانا وہاج الدین عرف مولوی منو مرادآبادی (شہادت ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) شہر کے بڑے عالم اور رئیس تھے۔ قومی جذبہ سے سرشار تھے۔ عوام وخواص آپ کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عربی وفارسی واردو کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی آپ کو قدرت تھی۔

انقلاب ۱۸۵۷ء میں آپ نے مرادآباد میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مرادآباد جیل خانہ پر آپ نے ایک ہجوم کے ساتھ حملہ کیا اور سارے قیدیوں کو آزاد کرالیا۔ مسٹر جان کرافٹ ولسن یہ خبر سنتے ہی روپوش ہوگیا تھا۔

''مرادآباد میں مجاہدین کی پہلی ناکامی کے بعد مولانا وہاج الدین عرف مولوی منو نے عوام کو دوبارہ منظم کیا اور معمولی ہتھیاروں کے ساتھ اپنی قیادت میں مجاہدین کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ جیل کی طرف بڑھے۔ (محاربۂ عظیم۔ مؤلفہ منشی کنھیالال)

مولانا وہاج الدین نے رام پور کا دورہ کرکے وہاں بھی جہاد اور حریت کی روح پھونکنے کا سرفروشانہ اقدام کیا کیوں کہ نواب رام پور انگریزوں کے وفادار تھے۔ قصبوں اور دیہاتوں میں گھوم کر آپ نے آزادی کا پیغام پہنچایا۔

شہزادہ فیروز شاہ جب مرادآباد پہنچا تو مولانا وہاج الدین اس کے دست راست بن گئے۔ مولانا سید کفایت علی کافیؔ اور مولانا وہاج الدین نے مل جل کر مرادآباد میں انقلاب برپا کردیا۔ شہزادہ فیروز شاہ کی سرپرستی میں ان حضرات نے نواب کی فوج اور انگریزوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

انقلاب کی ناکامی کے بعد ایک مخبر کی غداری سے مولانا وہاج الدین کے گھر پر انگریزوں نے ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء میں ایک روز دھاوا بول دیا اور گھر کے اندر ہی گولی مار کر آپ کو شہید کردیا۔

(۱۰) مولانا امام بخش صہبائیؔ دہلوی

مولانا امام بخش صہبائیؔ دہلوی (شہادت ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء) مولانا عبداللہ خاں علوی کے شاگرد اور اردو زبان کے مشہور شاعر ہونے کے ساتھ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ سرسید احمد خاں (متوفی مارچ ۱۸۹۸ء) نے اپنی مشہور کتاب ''آثارالصنادید'' میں آپ کی بڑی تعریف کرتے ہوئے آپ کو علم وفضل کا جامع اور کئی فنون کا ماہر لکھا ہے۔

۱۸۴۰ء میں لفٹنٹ گورنر دہلی نے مفتی صدرالدین آزردہؔ کی نشان دہی پر آپ کو دہلی کالج میں فارسی زبان کا استاذ مقرر کیا۔ مرزا غالبؔ اور صہبائیؔ میں گہری دوستی تھی۔ مفتی آزردہ اور علامہ فضل حق خیرآبادی کے گھر تقریباً روزانہ ہی صہبائیؔ جایا کرتے تھے جہاں علم وفضل اور شعروادب کی محفلیں ہر وقت آراستہ رہا کرتی تھیں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''مولوی امام بخش صہبائیؔ صدر مدرس فارسی اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی ادیب تھے۔ مصنف اور شاعر بھی تھے۔ ان کی کتابیں نصاب تعلیم میں داخل تھیں۔ ان کی تصانیف اب تک پڑھائی جاتی ہیں۔ شہر میں ان کی بڑی عزت تھی۔ علاوہ فارسی کی مشہور تالیفات کے اردو صرف ونحو پر بھی ایک اچھی کتاب لکھی جس کے آخر میں بہ ترتیب حروف تہجی اردو کے محاورات اور کہیں کہیں ضرب الامثال بھی درج ہیں۔ حدائق البلاغہ (تصنیف شمس الدین) کا ترجمہ اردو میں کیا۔ شعرائے اردو کا انتخاب بھی کیا تھا جو اسی زمانے میں طبع ہوکر شائع ہوا۔ ان کے تقرر کا عجیب واقعہ ہے۔ ۱۸۴۰ء میں جب آنریبل مسٹر ٹامسن لفٹنٹ گورنر مدرسہ کے معاینہ کے لئے آئے تو انھوں نے یہ تجویز کی کہ ایک مستعد فارسی مدرس کا تقرر ہونا چاہیے۔

مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور نے عرض کی کہ ہمارے شہر میں فارسی کے صرف تین شخص ہیں۔ ایک مرزا نوشہ، دوسرے حکیم مومن خاں، تیسرے امام بخش صہبائی۔ لفٹنٹ گورنر نے تینوں کو بلوایا۔ مرزا نوشہ (غالبؔ) بھلا یہ روگ کیوں پالنے لگے۔ انھوں نے تو انکار کردیا۔ مومنؔ خاں نے یہ شرط کی کہ سو روپے ماہانہ سے کم کی خدمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش کا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا۔ انھوں نے یہ خدمت چالیس روپے ماہانہ کی قبول کی۔ بعد میں پچاس روپے ہوگئے۔ (ص ۱۶۲ و ۱۶۳۔ مرحوم دلی کالج۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو نئی دہلی ۲۔ اشاعت سوم ۱۹۸۹ء)

مولانا صہبائی انگریز مخالف ذہن رکھنے کے ساتھ انقلابیوں اور مجاہدوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے اور قلعۂ معلیٰ کی مجلسوں اور بعض مشوروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے آپ کے محلہ کوچہ چیلان دہلی سے ایک بار چودہ سو آدمیوں کو گرفتار کر کے راج گھاٹ (نئی دہلی) جمنا کنارے گولیوں کا نشانہ بنادیا۔ انھیں میں مولانا صہبائی بھی تھے۔ آپ کے گھر کے اکیس افراد قتل کیے گئے۔

راشد الخیری دہلوی امام بخش صہبائی کی شہادت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مولوی قادر علی صاحب جو مولانا امام بخش صہبائی کے حقیقی بھانجے تھے اور انھیں کے ساتھ انھیں کے گھر میں رہتے تھے۔ ایک موقعہ پر بیان فرماتے ہیں کہ:

میں صبح کی نماز اپنے ماموں مولانا صہبائی کے ساتھ کٹرہ مہر پرور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دَن دَن کرتے آپہنچے۔ پہلی ہی رکعت تھی کہ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔ شہر کی حالت نہایت خطرناک تھی اور دلی حشر کا میدان بنی ہوئی تھی۔

ہماری بابت مخبروں نے بغاوت کی اطلاع سرکار میں دے دی تھیں۔ اس لئے ہم سب گرفتار ہو کر دریا کے کنارے پر لائے گئے۔ ابھی غدر کو ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا۔ اور پھانسیوں کی بجائے باغی گولیوں کا نشانہ بنتے تھے۔

مسلح سپاہیوں نے اپنی بندوقیں تیار کیں۔ ہم تیس چالیس آدمی ان کے سامنے کھڑے تھے۔ کہ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آکر کہا کہ:

''موت تمہارے سر پر ہے۔ گولیاں تمہارے سامنے ہیں۔ اور دریا تمہاری پشت پر ہے۔ تم میں سے جو لوگ تیرنا جانتے ہیں وہ دریا میں کود پڑیں۔''

میں بہت اچھا تیراک تھا مگر ماموں صاحب یعنی مولانا صہبائی اور ان کے صاحبزادے مولانا سوز تیرنا نہیں جانتے تھے۔ اس لئے دل نے گوارہ نہیں کیا کہ ان کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں۔ لیکن ماموں صاحب یعنی مولانا صہبائی نے مجھے اشارہ کیا اس لئے دریا میں کود پڑا۔ میں تیرتا ہوا آگے بڑھ آیا۔ اور پیچھے مڑکر دیکھتا جارہا تھا۔ پچاس ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کان میں آئیں۔ اور صف بستہ لوگ گر کر مر گئے۔ تحریر شدہ ۱۹۲۴ء۔ (ص ۹۳ و ۹۴۔ بعنوان کارزار حیات۔ دلی کی آخری بہار۔ مؤلفہ راشد الخیری اردو اکاڈمی۔ دہلی۔ ۲۰۰۳ء)

یہ المناک خبر مفتی صدر الدین آزردہ نے سنی تو بے اختیار ان کی زبان سے نکلا:

کیوں نہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

مصادر و ماخذ

جن سے براہ راست استفادہ کیا گیا

کتاب	مصنف	ناشر	طبع
(۱) آثار الصنادید	سرسید احمد خاں	اردو اکاڈمی نئی دہلی	۲۰۰۰ء
(۲) آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی	عبدالرزاق ملیح آبادی	مکتبہ اشاعت القرآن دہلی	طبع دوم ۱۹۶۵ء
(۳) اخبار الصنادید	نجم الغنی رام پوری	رضا لائبریری رام پور یوپی	طبع جدید ۱۹۹۷ء
(۴) اکمل التاریخ	محمد یعقوب ضیاء قادری بدایونی	مطبع قادری مولوی محلہ بدایوں	بار اول، سال طبع ندارد
(۵) الحیاۃ بعد الممات	فضل حسین بہاری	الکتاب انٹرنیشنل، جامعہ نگر نئی دہلی	سال طبع ندارد
(۶) الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین	شاہ ولی اللہ دہلوی	دار الاشاعت علویہ، لائل پور، پنجاب، پاک	۱۹۷۰ء
(۷) الدر المنثور / تذکرۂ صادقہ	عبدالرحیم عظیم آبادی	طابع و ناشر غیر واضح	۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء
(۸) القول الجلی فی ذکر آثار الولی	شاہ ولی اللہ / تقی انور کاکوروی (مترجم)	خانقاہ کاظمیہ کاکوروی ضلع لکھنو	۱۹۸۸ء
(۹) القول الجلی کا مقدمہ	شاہ ابوالحسن زید دہلوی	ابوالخیر اکاڈمی، چتلی قبر، دہلی ۶	۱۴۱۰ھ/۱۹۸۹ء
(۱۰) انفاس العارفین	شاہ ولی اللہ دہلوی / سید محمد فاروق (مترجم)	مکتبۃ الفلاح دیوبند سہارن پور	طبع چہارم
(۱۱) انقلاب ۱۸۵۷ء	پی۔ سی۔ جوشی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	طبع سوم ۱۹۹۸ء
(۱۲) اہل حدیث اور سیاست	نذیر احمد رحمانی	ادارۃ البحوث جامعہ سلفیہ بنارس	اشاعت سوم ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء
(۱۳) ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء	انتظام اللہ شہابی	دینی بکڈپو اردو بازار دہلی ۶	سال طبع ندارد
(۱۴) باغی ہندوستان	علامہ فضل حق / عبدالشاہد شیروانی (مترجم)	المجمع الاسلامی مبارک پور اعظم گڑھ	۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء
(۱۵) تاریخ اہل حدیث	محمد ابراہیم میر سیالکوٹی	الکتاب انٹرنیشنل، جامعہ نگر نئی دہلی	ستمبر ۱۹۹۵ء
(۱۶) تاریخ جنگ آزادی ہند	سید خورشید مصطفیٰ رضوی	رضا لائبریری رام پور	بار اول ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۱ء
(۱۷) تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم	ابوالحسن علی ندوی	مجلس تحقیقات ندوہ لکھنؤ	طبع پنجم ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء
(۱۸) تاریخ مشائخ چشت	محمد زکریا کاندھلوی	مکتبہ شیخ زکریا، مفتی اسٹریٹ سہارنپور	طبع اول ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء
(۱۹) تحریک آزادی میں علما کا کردار	محمد فیصل ندوی	ادارۂ تحقیقات ندوہ لکھنؤ	۱۴۲۷ھ/۲۰۰۶ء
(۲۰) تراجم علمائے حدیث ہند	ابویحییٰ امام خاں نوشہروی	الکتاب انٹرنیشنل، نئی دہلی ۲۵	سال طبع ندارد
(۲۱) تذکرۃ الرشید	عاشق الٰہی میرٹھی	مکتبہ خلیلیہ متصل مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور	طبع اول ۱۹۰۸ء
(۲۲) تذکرہ علمائے ہند	رحمٰن علی / مترجم محمد ایوب قادری	پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی	طبع اول ۱۹۶۱ء
(۲۳) تذکرۂ کاملان رام پور	احمد علی خاں شوق رام پوری	ہمدرد پریس کوچہ چیلان دہلی	بار اول ۱۹۲۹ء

(۲۴) تذکرہ محدث سورتی	خواجہ رضی حیدر	سورتی اکیڈمی، ناظم آباد کراچی	طبع اول ۱۹۸۱ء
(۲۵) تواریخ عجیب/کالا پانی	محمد جعفر تھانیسری	دہلی تعلیمی بورڈ گلی قاسم جان دہلی ۶	اشاعت ۱۹۶۹ء
(۲۶) حیات جاوید	خواجہ الطاف حسین حالی	قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی	طبع پنجم ۲۰۰۴ء
(۲۷) حیات طیبہ	مرزا حیرت دہلوی	اسلامی اکیڈمی اردو بازار، لاہور	اگست ۱۹۷۶ء
(۲۸) حیات ولی	ابو محمد رحیم بخش دہلوی	افضل المطابع، حویلی اعظم خاں دہلی	۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء
(۲۹) دلی کی آخری بہار	تصنیف راشد الخیری/مرتب سید ضمیر احسن دہلوی	اردو اکاڈمی دہلی	۲۰۰۳ء
(۳۰) سرگزشت مجاہدین	غلام رسول مہر	کتاب منزل لاہور	طبع اول ۱۹۵۶ء
(۳۱) سوانح قاسمی	مناظر احسن گیلانی	دفتر دار العلوم دیوبند سہارنپور	۱۹۵۵ء
(۳۲) سید احمد شہید کی صحیح تصویر	وحید احمد مسعود بدایونی	مکتبہ مسعود، رام گڑھ، لاہور	بار سوم ۱۹۶۶ء
(۳۳) شاہ ولی اللہ اور ان کے اصحاب	محمود احمد برکاتی ٹونکی	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۲۵	مارچ ۲۰۰۶ء
(۳۴) شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات	خلیق احمد نظامی	ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی	طبع اول ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۹ء
(۳۵) علمائے ہند کا شاندار ماضی	سید محمد میاں	کتابستان گلی قاسم جان دہلی ۶	۱۹۸۵ طبع اول ۱۹۵۷ء
(۳۶) فیوض الحرمین	شاہ ولی اللہ دہلوی	مطبع احمدی متصل مدرسہ عزیزی دہلی	سال طبع ندارد
(۳۷) مرحوم دہلی کالج	مولوی عبد الحق	انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر نئی دہلی	اشاعت سوم ۱۹۸۹ء
(۳۸) مسلمانوں کا روشن مستقبل	سید طفیل احمد منگلوری	مکتبہ الحق جوگیشوری ممبئی ۱۰۲	۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء
(۳۹) مشعل راہ	عبد الحلیم اختر شاہجہاں پوری	فرید بک اسٹال اردو بازار لاہور	سال طبع ندارد
(۴۰) مکاتیب مرزا مظہر جانِ جاناں	محمد عمر (مترجم)	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ	طبع اول ۱۹۹۵ء
(۴۱) موج کوثر	شیخ محمد اکرام	ادبی دنیا، مٹیا محل، جامع مسجد دہلی ۶	سال طبع ندارد
(۴۲) مولانا اسمٰعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان	شاہ ابوالحسن زید فاروقی	شاہ ابوالخیر اکاڈمی چتلی قبر دہلی ۶	بار دوم ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء
(۴۳) مولانا فضل حق خیرآبادی	سلمہ سیہول	الممتاز پبلی کیشن لاہور	۲۰۰۱ء
(۴۴) نقش حیات	حسین احمد مدنی	مکتبہ دینیہ دیوبند	۱۹۹۹ء۔ طبع اول ۱۹۵۵ء
(۴۵) ہمارے ہندوستانی مسلمان	ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر/اردو مترجم صادق حسین	الکتاب انٹرنیشنل، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵	جون ۲۰۰۲ء
(۴۶) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک	مسعود عالم ندوی	مرکزی مکتبہ اسلامی، ابوالفضل انکلیو نئی دہلی	مارچ ۱۹۹۵ء
(۴۷) ہندوستان میں وہابی تحریک	تصنیف انگریزی قیام الدین احمد/ ترجمہ اردو محمد مسلم عظیم آبادی	مکتبہ الفہیم مئوناتھ بھنجن یوپی	اگست ۲۰۰۱ء

☆☆☆☆☆☆☆☆